حسن نعیم اور نئی غزل

(تجزیہ وتنقید)

احمد کفیل

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

حسن نعیم اور نئی غزل

(تجزیہ و تنقید)

احمد کفیل

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

© قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

پہلی اشاعت	:	2013
تعداد	:	550
قیمت	:	-/104 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	1699

HASAN NAIM AUR NAYEE GHAZAL
(Tajziya-wa- Tanqeed)
By : Ahmad Kafeel

ISBN :978-81-7587-912-6

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا،
جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066 فون نمبر: 26109746
فیکس: 26108159 ای میل: ncpulsaleunit@gmail.com
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: سلاسار امیجنگ سسٹمس، C-7/5، لارینس روڈ انڈسٹریل ایریا، نئی دہلی-110035
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho کاغذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

حیات و کائنات کے مخفی عوامل سے آگہی کا نام علم ہے۔ مقدس پیغمبروں کے علاوہ خدا رسیدہ بزرگوں، سچے صوفیوں، سنتوں اور فکر رسا رکھنے والے شاعروں، ادیبوں اور سائنس دانوں نے انسان کے باطن اور ظاہر کو سنوارنے کے لیے جو کوششیں کی ہیں وہ سب اسی سلسلے کی مختلف کڑیاں ہیں۔ یہ کڑیاں حرفوں سے لفظوں، جملوں اور پھر صحیفوں میں یکجا ہوئی ہیں۔ کتابیں لفظوں کا ذخیرہ ہیں اور اسی نسبت سے مختلف علوم وفنون کا سرچشمہ۔ لہٰذا ان سرچشموں تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کتابیں ہی معتبر ذریعہ ہیں۔ انھی بنیادوں پہ فکر و آگہی حاصل کر کے ہم اصل مقصدِ حیات کی جانب قدم بڑھاتے ہیں۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کا بنیادی مقصد اردو زبان میں اچھی نصابی اور غیر نصابی کتابیں طبع کرنا اور انھیں کم سے کم قیمت پر علم و ادب کے شائقین تک پہنچانا ہے۔ کونسل کی کارگزاریوں کا دائرہ کئی علوم کا احاطہ کرتا ہے جن میں اردو کی ان کتابوں کی مکرر اشاعت بھی شامل ہے جو اردو شعر و ادب کی تاریخ اور اس کی تعبیر و تفہیم میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہیں۔ 'حسن نعیم اور نئی غزل' کی اشاعت اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

حسن نعیم ایک خالص غزل گو تھے۔ ان کی غزلیں نوکلاسیکی اردو شاعری کی ایک معتبر آواز تسلیم کی جاتی ہیں، اپنے ہم عصروں کے مقابل اگر چہ حسن نعیم نے گمنامی کی زندگی گزاری

لیکن ان کے فن کا تیور بہت توانا اور آفاقی ہے۔ اردو غزل کی پوری روایت کو سامنے رکھتے ہوئے جب آپ حسن نعیم کی غزلوں کا مطالعہ کریں گے تبھی آپ کو ان کے فن کے اصل جوہروں کا اندازہ ہوگا۔ کسی عہد کے صرف رٹے رٹائے فنکاروں کو سمجھنے کے ساتھ اپنے معروضی مطالعات کو بروئے کار لانا وقت کا ایک اہم تقاضا اور ہمارا ادبی فریضہ ہے۔ اس لحاظ سے احمد کفیل کا یہ کام قابل توجہ ہے۔

احمد کفیل کی تنقیدی تحریروں میں وضاحت اور قطعیت پائی جاتی ہے۔ انھوں نے بہت کم وقت میں قاری کو اپنا گرویدہ بنایا ہے۔ ان کی تحریر محض مروجہ تنقیدی اصطلاحوں اور زاویوں سے اپنا معیار وضع نہیں کرتی بلکہ تازہ اور سہل زبان میں فکری وفنی نزاکتوں پر معروضی اظہار خیال کو وسیلہ بناتی ہے۔ مطالعہ کے لیے کتاب آپ کے ہاتھوں میں ہے اور اہل علم سے گزارش ہے کہ اگر کتاب میں کوئی خامی نظر آئے تو تحریر فرمائیں تاکہ اگلی اشاعت میں دور کی جاسکے۔

ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین
(ڈائرکٹر)

انکشاف

'حسن نعیم اور نئی غزل' کی اشاعت کی خاطر خواہ پذیرائی کو میں اپنی محنت سے کہیں زیادہ حسن نعیم کی تہہ دار شخصیت اور شاعری کا حاصل سمجھتا ہوں۔ نئی غزل کے منظر نامے پر جو لوگ ادبی وقار کی منڈی میں مصلحت کوشی کی ہانک لگا کر قرابت داروں کے کنکر، پتھر بھی سونے کے مول بیچ رہے تھے ان کا دور ختم ہوا۔ یعنی ''دورِ مجنوں گزشت و امروز نوبتِ ماست۔'' اب آزاد قاری ہے اور اس کی متن اساس تنقید۔ یہاں اسی متن کو اعتبار حاصل ہوگا جس میں گہرائی ہو اور جو کسی خاص وقت کا اسیر نہ ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ حسن نعیم اور ان کے فن سے متعلق میرے پیش کردہ خیال کو تقویت مل رہی ہے۔ حسن نعیم بلاشبہ شاعرِ حال بھی ہے اور شاعرِ فردا بھی۔

اس کتاب کے املوں یا جملوں میں جو حذف و اضافے کیے گئے ہیں ان کی وضاحت حواشی میں کر دی گئی ہے اور قومی اردو کونسل کے جدید املے کی پیروی کی گئی ہے۔ دوسری وجہ حسن نعیم سے شہر بانو کے رشتے کی وضاحت تھی۔ میں نے اس ضمن میں ان کے خویش و اقارب کو کریدنے کی بہت کوشش کی تھی لیکن اور تو اور شہر بانو صاحبہ بھی اپنی سابقہ تحریروں پر تکیہ کر کے خاموش رہ گئیں۔ وہ تحریریں جن کے اعتبار و اعتراف میں ان کے احباب کو بھی تامل تھا۔ کتاب کے 'موصولہ خطوط' میں محترمہ شہر بانو (مرحومہ) اور جناب شمیم طارق کے خطوط کے ساتھ سندِ نکاح کے عکس سے واضح ہے کہ شہر بانو صاحبہ حسن نعیم کی دوسری منکوحہ تھیں۔ وہ بمبئی

یونیورسٹی سے گریجویٹ اور موسیقی کی سند یافتہ تھیں۔ وہ پیشہ ور مغنیہ نہیں تھیں، اپنے شوق کی تسکین کے لیے ادبی محفلوں میں غزلیں سنایا کرتی تھیں۔ کتاب کی پہلی اشاعت میں اس رشتے کے ذکر سے حسن نعیم کے دونوں رشتے داروں کو مجھ سے تکلیف پہنچی تھی۔ اس بیان میں مجھ سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تھی۔ میرے سامنے جو شواہد تھے، انھیں میں نے جوں کا توں لکھ دیا تھا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہمارا معاشرہ ایسا واقع ہوا ہے جس میں ایسے پاک رشتوں کی تضحیک کی جاتی ہے اور پس پردہ کئی ناگفتہ بہ رشتے بڑی آسانی سے قبول کر لیے جاتے ہیں۔

اس کتاب میں 'نمونۂ کلام' سے قبل 'حسن نعیم اور آج کا قاری' اور آخر میں اس کتاب پر مطبوعہ وغیر مطبوعہ 'تبصرے' اور 'موصولہ خطوط' شامل کیے گئے ہیں۔ ان اضافوں میں حسن نعیم کے فن پر تازہ مضمون کے تناظر میں اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کوئی فن زندگی میں لحہ بہ لحہ ہونے والی تبدیلیوں کو کن بنیادوں پر اپنے دائرۂ فکر میں سمیٹ لیتا ہے۔ تبصروں میں ایک اہم بات یہ ہے کہ ان کے لکھنے والے سب آج کے ہی قاری ہیں جن میں حسن نعیم اور ان کے فن سے متعلق نجی مطالعات کا بھی اظہار کیا گیا ہے۔ 'موصولہ خطوط' اس لیے دلچسپ نہیں کہ وہ مصنف کے نام لکھے گئے ہیں، بلکہ ان میں حسن نعیم کی شخصیت اور فن کے بعض ایسے گوشے اجاگر کیے گئے ہیں جو، اب سے قبل میرے مطالعے اور تحقیق سے اوجھل تھے۔ امید ہے یہ اضافے بھی آپ کے تازہ شوق کو تسکین دیں گے۔

فروری 2013، دہلی

احمد کفیل

فہرست

- نقطۂ نظر — کوثر مظہری — ix
- حرفِ آغاز — احمد کفیل — xiii
- حسن نعیم کی شخصیت — 1
- نئی غزل، سمت و رفتار (پس منظر — پیش منظر) — 37
- حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات — 59
- نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت — 75
- حسن نعیم اور آج کا قاری — 107
- نمونۂ کلام — 119
- تاثرات — 217

  خلیل الرحمٰن اعظمی، کالی داس گپتا رضا، محمد حسن، وہاب اشرفی، مخمور جالندھری، باقر مہدی، وحید اختر، قمر رئیس، خلیق انجم، مظفر حنفی، سید محمد عقیل، بانی، مخمور سعیدی، احمد یوسف، ندا فاضلی، صادق، اصغر علی انجینئر، زبیر رضوی، محمود خاور، شمیم طارق، جمال اویسی اور سید سراج اجملی
- تبصرے — 229

مظہر امام، جاوید رحمانی، توقیر عالم توقیر، درخشاں زریں، شاذیہ عمیر، شبنم آرا، الف ناظم، ظفر انصاری ظفر، شفیع جاوید، امتیاز وحید

- موصولہ خطوط 249

وہاب اشرفی، باقر مہدی، احمد یوسف، ندا فاضلی، منظر شہاب، شہر بانو حسن نعیم، سید شاہ برہان الدین احمد، میمونہ عالم، علی احمد فاطمی، شمیم طارق، جمال اویسی، رضوان اللہ آروی، مجم عثانی، اقبال حسن آزاد، نادر رضوی

- کتابیات 279

نقطۂ نظر

شعر گوئی جب فکر اور بصیرت کے چراغ روشن کرتی ہے تو امکانات کی دنیا بھی روشن ہو جاتی ہے۔ مگر یہ کام بازیچۂ اطفال کے زمرے سے باہر ہے یعنی یہ نہایت ہی دقت طلب امر اور فطری عمل ہے۔ غزل گوئی کوئی دھکا مکی تھوڑی ہے۔ غزل کے خد و خال کو سمجھنے کے لیے غزل کے ناموجود کرداروں کی تفہیم و تجسیم ضروری ہے جس کے لیے فن کار اپنی نیندیں حرام کرتا ہے۔ احساس کی آنچ پر افکار کو پکانا اور پھر نوع انسانی کی بصیرت کے لیے سامان مہیا کرنا آسان نہیں۔ غزل گوئی اسی کا تو نام ہے۔ حسن نعیم بھی ایسے ہی ایک فن کار ہیں۔ فن کو نکھارنے کے لیے حسن نعیم کیا کہتے ہیں:

وہ علم دے جو سخن کو وقار دیتا ہے
وہ درد بخش جو فن کو نکھار دیتا ہے

حسن نعیم کا تخیل جب پرواز کرتا ہے تو بحرِ اعظم بھی جزیرہ سا نظر آنے لگتا ہے۔ ساتھ ہی وہ انسان کے مقدر کو بھی بڑی سچائی اور منطق کے ساتھ پیش کرتے ہیں۔ دو شعر:

اگر اڑان ہو اونچی تو بحرِ اعظم بھی
ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے
جو ڈوبنا ہو مقدر تو عین ساحل پر
بھنور کی اور کنارا دکھائی دیتا ہے

حسن نعیم کی شعری کائنات کا مطالعہ تحیر آمیز ہے۔ ان کا مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ اور سب

سے بڑھ کر ان کی تخلیقی قوت ان کی غزلوں کو رنگ و روغن عطا کرتی ہے۔ اگر یہ رنگ و روغن میسر نہ آئے تو فن کا چراغ جلنا مشکل ہو جائے اور اگر جلے بھی تو اس کی لو زمانے کی سرد و گرم ہواؤں سے نبرد آزما نہیں ہو سکتی۔ حسن نعیم کی غزلوں میں ایک طرح کا طنطنہ ہے، گرمی ہے، توانائی اور برجستگی ہے۔ نرم روی میں بھی شعلہ فشانی ہے۔ انسانی زندگی کے مضمرات اور زمانے کی کم ظرفی کو وہ خوب سمجھتے ہیں۔ ان کے کاسۂ خیال میں ماضی کا سرمایہ بھی ہے اور اپنے عہد کی حسیت بھی۔ نہ فکر میں پھسلن ہے نہ طرز اظہار میں۔ ایک نپا تلا لہجہ ہے، ایک متوازن قوت تخلیق ہے۔ ایسا ممکن تب ہوتا ہے جب سچ کہنے کی تاب ہو۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کیا بتاؤں کتنا رویا سچ کو سچ کہتے ہوئے
جان نکلی تن سے گویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

منصف کو سب خبر ہے مگر بولتا نہیں
مجھ پر ہوا جو ظلم سزا کے بغیر بھی

شاعری حیات و کائنات کا ادراک و انکشاف کرتی ہے۔ یہ حرز جاں بھی ہے اور فکر خلاصی کا راستہ بھی۔ اپنے آپ کو Discover کرنا شاعری میں ہی ممکن ہے کیوں کہ اس میں وجدان کا عمل دخل ہوتا ہے اور بغیر وجدانی قوت کے خود کو پانا مشکل ہے۔ حسن نعیم نے اپنی غزلوں میں کائنات کو نفوذ کیا ہے، جس کا انکشاف الفاظ کے پیکر سے ہوتا ہے۔ وجود کے کرب سے ان کی آشنائی اور شعور ذات نے ان کی شاعری کو روشن ضمیری کی راہ دکھائی ہے۔ ان کے اندر ایک طرح کی کج کلاہی اور بے نیازی کی کیفیت اسی لیے پیدا ہو گئی ہے۔ دیکھیے یہ اشعار:

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

حسن نعیم نے حسن و عشق کی واردات اور اس کے رموز کو بھی اپنی غزلوں میں بڑی آہستہ خرامی کے ساتھ آنے دیا ہے۔ کہیں ساز غم کی آواز بھی ہے اور کہیں لطیف سرشاری کا رنگ بھی۔ یہ اشعار دیکھیے:

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قید انا
انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا
عشق وہ آگ جو برسوں میں سلگتی ہے کبھی
دل وہ پتھر جو کسی آن پگھل سکتا ہے
یہ حادثہ جو بھنور بن کے یوں ڈبوتا ہے
گہر بنا کے مجھے ایک دن ابھارے گا
خیر سے دل کو تیری یاد سے کچھ کام تو ہے
وصل کی شب نہ سہی ہجر کا ہنگام تو ہے

احمد کفیل نے نہایت ہی میانہ روی کے ساتھ حسن نعیم کی شخصیت اور فن کو اپنے موضوع کے تحت سمیٹ لیا ہے۔ اگر چہ اردو ادب میں ان کا نام بہت جانا پہچانا نہیں ہے مگر کم وقت میں ہی وہ اپنی سنجیدہ فکر کے سبب اردو والوں کو اپنی طرف ملتفت کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ وہ شاعری بھی کرتے ہیں اور تبصرے اور تنقیدی مضامین بھی لکھتے رہتے ہیں۔ جو بھی کام کرتے ہیں، توجہ اور رغبت کے ساتھ کرتے ہیں۔

اس کتاب میں احمد کفیل نے حسن نعیم کے ساتھ ان کے نمائندہ ہم عصر شعرا کو بھی شامل کیا ہے۔ حسن نعیم کی انفرادیت ثابت کرنے کی اچھی اور کامیاب کوشش کی ہے۔ اپنی بات احمد کفیل کے اس جملے پر ختم کرتا ہوں:

> ''نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت ایک توانا لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے قائم ہے۔ ان کی غزلوں میں غمِ ذات اور غمِ کائنات کا ایک حسین امتزاج ہے۔''

کوثر مظہری
ایسوسی ایٹ پروفیسر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

حرفِ آغاز

اردو غزل گوئی کے سفر میں 'نئی غزل' ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں غزل کے اس تیور نے اپنا رنگ روپ دھارنا شروع کیا اور آج بڑے طمطراق کے ساتھ دانشوران غزل سے داد پا رہی ہے۔ نئی غزل کی زلفوں کو جن فن کاروں نے سنوارا ان کا خاص وصف یہ ہے کہ یہ کسی نظریے کے پابند نہیں۔ ان فن کاروں نے اپنی دنیا آپ بسائی اور اپنے فن کی بنیاد ذاتی تجربے اور جذبے پر رکھی جس کے نتیجے میں فن کاروں کے اپنے اپنے تخلیقی تجربات سے غزل کی تنگ دامانی وسعت اور آزاد فضا سے ہم کنار ہوئی۔ اس حقیقت کے اعتراف میں ناقدین ادب نے بجا طور پر اس دور کو اردو شعر و غزل کی تجدید و احیا کا حقیقی دور تسلیم کیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کا یہ خیال ہے کہ شاعری میں نئے انداز اور نئی ہیئت کی ایجاد کو کسی قوم کا سب سے اہم کارنامہ سمجھنا چاہیے اور پروفیسر گیان چند جین نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اگر مجھے رابنسن کروسو کے جزیرے میں تنہا چھوڑ دیا جائے اور پرانی یا نئی غزل میں کسی ایک کے انتخاب کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہو تو میں 1947 سے پہلے کی غزل پر 1947 کے بعد کی غزل کو ترجیح دوں گا اور اس میں بھی مجھے 1960 کے بعد کی غزل سب سے زیادہ راس آئے گی۔''
>
> (ذکر و فکر، ص 90)

بہر حال کسی شخص کی پسند اور ناپسند میں اس کی افتادِ طبع کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس میں

حرفِ آغاز

اردو غزل گوئی کے سفر میں 'نئی غزل' ایک خوشگوار اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ بیسویں صدی کی چھٹی دہائی میں غزل کے اس تیور نے اپنا رنگ روپ دھارنا شروع کیا اور آج بڑے طمطراق کے ساتھ دانشوران غزل سے داد پا رہی ہے۔ نئی غزل کی زلفوں کو جن فن کاروں نے سنوارا ان کا خاص وصف یہ ہے کہ یہ کسی نظریے کے پابند نہیں۔ ان فن کاروں نے اپنی دنیا آپ بسائی اور اپنے فن کی بنیاد ذاتی تجربے اور جذبے پر رکھی جس کے نتیجے میں فن کاروں کے اپنے اپنے تخلیقی تجربات سے غزل کی تنگ دامانی وسعت اور آزاد فضا سے ہم کنار ہوئی۔ اس حقیقت کے اعتراف میں ناقدین ادب نے بجا طور پر اس دور کو اردو شعر و غزل کی تجدید و احیا کا حقیقی دور تسلیم کیا ہے۔

ٹی ایس ایلیٹ کا یہ خیال ہے کہ شاعری میں نئے انداز اور نئی ہیئت کی ایجاد کو کسی قوم کا سب سے اہم کارنامہ سمجھنا چاہیے اور پروفیسر گیان چند جین نے ایک جگہ لکھا ہے:

> ''اگر مجھے رابنسن کروسو کے جزیرے میں تنہا چھوڑ دیا جائے اور پرانی یا نئی غزل میں کسی ایک کے انتخاب کو ساتھ لے جانے کی اجازت ہو تو میں 1947 سے پہلے کی غزل پر 1947 کے بعد کی غزل کو ترجیح دوں گا اور اس میں بھی مجھے 1960 کے بعد کی غزل سب سے زیادہ راس آئے گی۔''
>
> (ذکر و فکر، ص 90)

بہر حال کسی شخص کی پسند اور ناپسند میں اس کی افتادِ طبع کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ اس میں

بعض چیزیں ان کی پسندیدہ ہوتی ہیں اور بعض بے حد پسندیدہ ہوتی ہیں۔ نغمہ اور موسیقی انسان کے خمیر میں داخل ہے اور شاعری کی صنفوں میں غزل کا موسیقی سے بہت قریب کا رشتہ ہے۔ صرف موسیقی ہی نہیں بلکہ غزل کی معنویت اور غنائیت انسانی زندگی کے رنج و راحت میں شریک ہے، کیوں کہ اس سے مسرت بھی اور بصیرت بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اس صنف میں زندگی اور کائنات کی وسیع تر معنویت کی تلاش ایک ادب کے طالب علم کی حیثیت سے میرے اندر ہمیشہ جاری وساری رہی ہے۔

خوشی اور غم انسانی زندگی کی ایسی دو حقیقتیں ہیں کہ ان میں سے کسی ایک کو الگ کر کے زندگی اور کائنات کو سمجھنا، زندگی اور کائنات کی فطری حقیقت سے انحراف کرنے کے مترادف ہے۔ میں یہ ہرگز نہیں کہہ سکتا کہ زندگی کی یہ حقیقتیں حسن نعیم کے دیگر ہم عصروں کے یہاں نہیں، لیکن اسلوب کی حیثیت سے ان کے دیگر معاصرین کے یہاں کم کم ملتی ہیں۔ حسن نعیم کے یہاں یہ وہ اسلوب ہے جو نہ صرف 'نئی غزل' میں بلکہ اردو غزل کے باب میں ایک اہم موڑ کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آیا ہے۔

حسن نعیم کی شاعری میں 'میں' کا حاوی رجحان ہر جگہ قائم ہے جو ذات انسانی کے تشخص اور شناخت کا ضامن ہے، جو رنج و راحت سے نبردآزما ہوکر رجائیت کو جنم دیتا ہے اور کردار کی مٹتی ہوئی اہمیت کو بحال کرنے کی متواتر کوششوں میں لگا ہوا محسوس ہوتا ہے:

وہی طالبِ ضیا ہو جو اٹھائے نازِ ظلمت
وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شامِ غم بھی

علاوہ ازیں مستقل تازہ خیالی، تازہ گوئی اور تہہ داری حسن نعیم کا خاص جوہر ہے۔ غزل کے کینوس کو وسعت اور تنوع بخشنے میں حسن نعیم کا لہجہ ہر جگہ نکھرا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنی دانشوری کے ذریعے انسان اور کائنات کے مختلف فطری رنگوں کو جذب کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ ان کے شعروں کے اوپر روایات کے ادراک کا ایسا پیکر ہے جس میں عصری صداقتیں اپنی پوری جلوہ سامانیوں کے ساتھ سمٹ آئی ہیں۔ انداز تخاطب میں نرمی ہے، گھلاوٹ ہے، سوز و گداز ہے، جس سے ختم نہ ہونے والی ترنگیں ابھرتی ہیں۔ اسی بنا پر دانشوروں کے علاوہ غزل کے عام پرستاروں نے حسن نعیم کی غزلوں کی معنویت اور غنائیت کی

مکمل کر داد دی اور سرحد پار بھی انھیں نمائندہ غزل گو تسلیم کیا گیا۔

حسن نعیم کی غزلوں میں روایت سے وابستہ حال و استقبال کے بہت سے روشن امکانات ہونے کے باوجود ان کی غزلیں بے توجہی کی اسیر رہی ہیں۔ اس بے توجہی کو مثبت فکر سے جوڑنے کے لیے کچھ مقالے رسائل میں ضرور شائع ہوتے رہے لیکن کتابی شکل میں یہ میری پہلی کوشش ہے جس کی دوسری اشاعت آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

اس کتاب کے پہلے حصے میں، میں نے حسن نعیم کی پیدائش سے لے کر زندگی کی آخری سانس تک کے احوال و آثار قلم بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی آنکھیں کس ماحول میں کھلیں؟ تعلیم و تربیت کیسی اور کس طرح پائی؟ ان کے مزاج کی تلخی اور نرمی میں ان کے گھر، خاندان اور ماحول و معاشرے کا کتنا دخل رہا ہے؟ انھوں نے دنیا والوں کو کیا دیا اور خود کیا لینے کے بعد آخرت کو سدھارے؟ وغیرہ وغیرہ۔

دوسرے حصے میں، میں نے حسن نعیم کے عہد کی غزل گوئی کی سمت و رفتار کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ اس عہد میں فن کاروں نے اپنے اپنے ذاتی تجربے سے غزل کے اندر کن عوامل کا اختراع کیا جن کے سبب غزل کا دامن آزاد اور وسیع فضا سے ہم کنار ہوا اور اس دور کی غزل گوئی کو اردو غزل گوئی کی تجدید و احیا کا حقیقی دور تسلیم کیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ غزل گوئی کے اس رنگ میں جو سب سے پہلے نمونے شائع ہوئے وہ 1955 میں خلیل الرحمن اعظمی کا 'کاغذی پیراہن'، ابن انشا کا 'چاند نگر' اور ناصر کاظمی کا 'برگ نے' ہے۔ جب کہ حسن نعیم کا پہلا مجموعہ 'اشعار' 1971 میں شائع ہوا۔ اس کے باوجود بعض اہم اور معتبر ناقدین نے حسن نعیم کو 'نئی غزل کا پہلا ماڈل شاعر' تسلیم کیا ہے۔ لہٰذا ان بیانات کی روشنی میں حسن نعیم کے شعری سفر کا احاطہ ان کے معاصر شعرا کی شاعری کے ساتھ کر کے یہ جاننے کی کوشش کی ہے کہ 'نئی غزل' کے نقش اول میں حسن نعیم کی پیش رفت کہاں تک رہی ہے۔ ساتھ ہی اس عہد کے سیاسی، سماجی اور معاشی صورت حال کا پتا لگانے کی کوشش کی ہے جس نے اردو غزل گوئی کے اس نئے موڑ کو جنم دیا۔ زندگی ہو یا فن، یہاں کوئی بھی تبدیلی اچانک رونما نہیں ہو جاتی۔ اس کی بنیادیں سماج اور معاشرے میں بڑے دھیمے سروں میں اٹھتی رہتی ہیں۔ لہٰذا اس خیال کے پیش نظر 'نئی غزل' کے پیش منظر کے ساتھ ساتھ پس منظر کو بھی سمجھنے

کی کوشش کی ہے۔

تیسرے حصے میں حسن نعیم کے ان فکری محرکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے جن کی کارفرمائی ان کے شعروں میں حاوی نظر آتی ہے۔ فن کار کے ذہن پر ماحول و معاشرے، خاندانی تعلیم و تربیت کے اثرات، ایک حساس اور باریک بیں ہونے کی وجہ سے کائنات کے حرکت و عمل کو بہ انداز دگر دیکھنے کی ان صورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو ان کے شعروں میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ زبان و بیان، نغمگی، تغزل اور شعری تراکیب کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

چوتھے حصے میں حسن نعیم کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جائزے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ کس طرح حسن نعیم کی غزلیں اپنے عصر کو دامن میں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ معاصر غزل گوئی سے الگ اپنی انفرادیت قائم کر لیتی ہیں۔ ان کے شعروں میں کچھ ایسے کوائف سمٹ آئے ہیں جو ایک محدود عصر میں نہ رہ کر اپنا رشتہ آفاقیت سے جوڑ لیتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں ان کے شعروں کے تنوع کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

ہم کو کتابِ زیست کا ہر باب حفظ ہے
اک بابِ غم کا صرف پڑھیں اقتباس کیا

اس حصے میں حسن نعیم کی غزلوں کا اپنے عصر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لیے جہاں ضرورت محسوس کی ہے ان کے معاصر شعرا کے اشعار کے حوالے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ شعری صنعتوں، تراکیب، محاورے، روزمرہ الفاظ اور ان کے تخلیقی استعمال کے ساتھ اسلوب کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جو نہ صرف حسن نعیم کے بلکہ اردو غزل گوئی کے باب میں خاص جوہروں میں شمار کیے جائیں گے۔

کتاب کے آخر میں، میں نے حسن نعیم کی نمائندہ غزلوں کا انتخاب 'نمونۂ کلام' پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل کے لیے تگ و دو کے دوران مجھے یہ محسوس ہوا کہ حسن نعیم کی غزلوں کے مجموعے دستیاب نہیں اور باذوق قاری کو ان کے مطالعے سے یکسر محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی خطوط بھی میرے پاس آئے۔ لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے حسن نعیم

کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ ظاہر ہے ہر قاری کے اپنے الگ الگ زاویے ہوتے ہیں اور الگ الگ پیمانے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں یہ قطعی دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے انتخاب میں کسی طرح کی تشنگی باقی نہ رہ گئی ہو۔ اس نمونۂ کلام کے بعد حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ناقدین کی آرا بھی شامل کی گئی ہیں جو توجہ طلب ہیں۔

اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہمارے استاد ڈاکٹر خواجہ اکرام نے قدم قدم پر جس قدر میری ہمت افزائی کی ہے اور جس سنجیدگی اور خلوص و محبت سے میری الجھنوں کو سلجھایا ہے، تنقید و تحقیق کی نزاکتوں سے متعلق اپنی تحریروں میں زبان و بیان کی صفائی ستھرائی کو برقرار رکھنے کی جیسی راہیں دکھائی ہیں، ان کے اس خلوص اور محبت کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں، سمجھ میں نہیں آتا۔ جوش کا ہم نوا بن کر بس اتنا کہہ کر خود کو مطمئن کرتا ہوں کہ:

''سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہے۔''

حسن نعیم کے ہم عصر شعرا و ناقدین سے ملاقاتوں کے دوران مواد کی فراہمی کے لیے جو انھوں نے واضح اشارے دیے اسے حاصل کرنے کے لیے جن لائبریریوں سے مدد لی ہے ان میں اپنی یونیورسٹی لائبریری کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، دارالشکوہ لائبریری اردو اکادمی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ لائبریری دہلی اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ قابل ذکر ہیں۔ اپنے احباب کے ساتھ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں برادر محترم انظر صاحب کی کتابوں اور مواد سے متعلق بے پناہ معلومات سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے جس کے لیے میں ان کا بے حد شکرگزار ہوں۔

بالآخر میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ ناقدین کی آرا میں ایک نقطۂ اتصال یہ ہے کہ حسن نعیم کو اپنے ہم عصروں میں یا اردو غزل گوئی کے باب میں جتنا مقبول ہونا چاہیے تھا، نہیں ہوئے۔ اس کے اسباب کیا تھے، یہ امر توجہ طلب ہے۔ ہمارے یہاں فن و تنقید کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ جب ہم اپنے شعر و ادب کی شناخت کے حوالے سے کسی شخصیت اور فن پر قلم اٹھاتے ہیں تو ناقدین کے ذریعے پہلے سے بنے ہوئے زاویے ہم پر حاوی ہوتے ہیں اور ادب و شعر کو اپنی عینک سے نہ دیکھ کر دوسروں کی نظروں سے آنکنا شروع کر دیتے ہیں، تو

پھر ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ جب دوسروں کی آرا کو ہم نے پہلے ہی مقدم سمجھ لیا تو پھر قلم اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی؟ ادب کے بڑے سے بڑے ناقد کی باتیں قرآن و حدیث کا درجہ نہیں رکھتیں کہ جن میں اضافہ یا جن کو بہ انداز دگر دیکھنا کفر ہے۔ اس لیے جب تک ہم آزادانہ طور پر مطالعے کی راہ ہموار نہیں کریں گے اس وقت تک ادب میں معروضیت کی بحالی ممکن نہیں۔ میں نے حتی الامکان حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری کا احاطہ کرنے کی کوشش کے ساتھ ان نکات کو ابھارنے کا جتن کیا ہے جن سے اپنے ہم عصروں میں حسن نعیم کی انفرادی شناخت قائم ہوتی ہے۔ ہر عہد میں دو تین شاعر ہی ایسے ہوئے ہیں جن کے نام سے وہ عہد پہچانا گیا۔ حسن نعیم بھی اپنے عہد کا ایک ایسا ہی غزل گو ہے۔ بحث کے سلسلے تو جاری ہیں اور جاری رہیں گے لیکن انھیں تیز تر کرنے میں کتابی شکل میں میری یہ کوشش تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کر لیتی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہ گئی۔

احمد کفیل

حسن نعیم کی شخصیت

حسن نعیم 'نئی غزل' کے ایک توانا اور آفاقی لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش 6 جنوری 1927 کو عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک رئیس گھرانے میں ہوئی۔ ان کا نام سید حسن رکھا گیا۔ ان کے والد کا نام سید محمد نعیم تھا اور دادا سید شاہ غلام قاسم تھے، جو راجگیر کی درگاہ پیر امام الدین کے سجادہ نشیں تھے۔ ان کا شجرۂ نسب ساتویں پشت میں پیر امام الدین سے اور چودھویں پندرھویں پشت میں ہندوستان کے مشہور صوفی مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری سے اور پینتالیسویں پشت میں حضرت امام حسنؓ سے جاملتا ہے۔[1]

حسن نعیم کے دادا سید شاہ غلام قاسم کے بعد بھی اگرچہ سجادہ نشینی کا سلسلہ جاری رہا لیکن دادا حضور کے وقت سے ہی ان کے خاندان میں عصری تعلیم کا شعور اور اس کی اہمیت وافادیت کی کرن پھوٹنے لگی تھی۔ عصری تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے دادا محترم جب کسی شعبے میں سب رجسٹرار (Sub-Registrar) ہوگئے تو اپنی سجادگی اپنے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف کے حوالے کردی۔ حسن نعیم کے والد سید محمد نعیم دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کا نام سید عبدالسمیع تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے لندن جاکر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور یکے بعد دیگرے بیرسٹر ہوکر لوٹے۔ حسن نعیم کے والد شہر بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگے اور لگ بھگ 1925 کے آس پاس پٹنہ منتقل ہوگئے۔

حسن نعیم اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے سید احمد، ان

کی کوشش کی ہے۔

تیسرے حصے میں حسن نعیم کے ان فکری محرکات کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے، جن کی کارفرمائی ان کے شعروں میں حاوی نظر آتی ہے۔ فن کار کے ذہن پر ماحول و معاشرے، خاندانی تعلیم و تربیت کے اثرات، ایک حساس اور باریک بیں ہونے کی وجہ سے کائنات کے حرکت و عمل کو بہ انداز دگر دیکھنے کی ان صورتوں کو سمجھنے کی کوشش کی ہے جو ان کے شعروں میں کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔ زبان و بیان، نغمگی، تغزل اور شعری تراکیب کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔

چوتھے حصے میں حسن نعیم کی غزلوں کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ جائزے کے بعد یہ بات کھل کر سامنے آئی ہے کہ کس طرح حسن نعیم کی غزلیں اپنے عصر کو دامن میں سمیٹنے کے ساتھ ساتھ معاصر غزل گوئی سے الگ اپنی انفرادیت قائم کر لیتی ہیں۔ ان کے شعروں میں کچھ ایسے کوائف سمٹ آئے ہیں جو ایک محدود عصر میں نہ رہ کر اپنا رشتہ آفاقیت سے جوڑ لیتے ہیں۔ ان کے پس منظر میں ان کے شعروں کے تنوع کا احاطہ کرنے کی بھی کوشش کی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں:

ہم کو کتابِ زیست کا ہر باب حفظ ہے
اک بابِ غم کا صرف پڑھیں اقتباس کیا

اس حصے میں حسن نعیم کی غزلوں کا اپنے عصر کے ساتھ مطالعہ کرنے کے لیے جہاں ضرورت محسوس کی ہے ان کے معاصر شعرا کے اشعار کے حوالے بھی نقل کیے گئے ہیں۔ شعری صنعتوں، تراکیب، محاورے، روزمرہ الفاظ اور ان کے تخلیقی استعمال کے ساتھ اسلوب کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جو نہ صرف حسن نعیم کے بلکہ اردو غزل گوئی کے باب میں خاص جوہروں میں شمار کیے جائیں گے۔

کتاب کے آخر میں، میں نے حسن نعیم کی نمائندہ غزلوں کا انتخاب 'نمونۂ کلام' پیش کیا ہے۔ اس کتاب کی تکمیل کے لیے تگ و دو کے دوران مجھے یہ محسوس ہوا کہ حسن نعیم کی غزلوں کے مجموعے دستیاب نہیں اور باذوق قاری کو ان کے مطالعے سے یکسر محروم ہونا پڑتا ہے۔ اس سلسلے میں کئی خطوط بھی میرے پاس آئے۔ لہٰذا اس کمی کو پورا کرنے کے لیے میں نے حسن نعیم

کی غزلوں کا انتخاب کیا ہے۔ ظاہر ہے ہر قاری کے اپنے الگ الگ زاویے ہوتے ہیں اور الگ الگ پیمانے ہوتے ہیں۔ اس لیے میں یہ قطعی دعویٰ نہیں کرتا کہ میرے انتخاب میں کسی طرح کی تشنگی باقی نہ رہ گئی ہو۔ اس نمونۂ کلام کے بعد حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری سے متعلق ناقدین کی آرا بھی شامل کی گئی ہیں جو توجہ طلب ہیں۔

اس کتاب کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ہمارے استاد ڈاکٹر خواجہ اکرام نے قدم قدم پر جس قدر میری ہمت افزائی کی ہے اور جس سنجیدگی اور خلوص و محبت سے میری الجھنوں کو سلجھایا ہے، تنقید و تحقیق کی نزاکتوں سے متعلق اپنی تحریروں میں زبان و بیان کی صفائی ستھرائی کو برقرار رکھنے کی جیسی راہیں دکھائی ہیں، ان کے اس خلوص اور محبت کا شکریہ کن لفظوں میں ادا کروں، سمجھ میں نہیں آتا۔ جوش کا ہم نوا بن کر بس اتنا کہہ کر خود کو مطمئن کرتا ہوں کہ:

''سیپیاں ہیں نطق کی موجوں پہ موتی دل میں ہے۔''

حسن نعیم کے ہم عصر شعرا و ناقدین سے ملاقاتوں کے دوران مواد کی فراہمی کے لیے جو انھوں نے واضح اشارے دیے اسے حاصل کرنے کے لیے جن لائبریریوں سے مدد لی ہے ان میں اپنی یونیورسٹی لائبریری کے علاوہ خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ، گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ، ذاکر حسین لائبریری جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، دارالشکوہ لائبریری اردو اکادمی دہلی، غالب انسٹی ٹیوٹ لائبریری دہلی اور مولانا آزاد لائبریری مسلم یونیورسٹی علی گڑھ قابل ذکر ہیں۔ اپنے احباب کے ساتھ خدا بخش لائبریری پٹنہ میں برادر محترم انظر صاحب کی کتابوں اور مواد سے متعلق بے پناہ معلومات سے میں نے بہت استفادہ کیا ہے جس کے لیے میں ان کا بے حد شکر گزار ہوں۔

بالآخر میں اتنا کہنا چاہوں گا کہ ناقدین کی آرا میں ایک نقطۂ اتصال یہ ہے کہ حسن نعیم کو اپنے ہم عصروں میں یا اردو غزل گوئی کے باب میں جتنا مقبول ہونا چاہیے تھا، نہیں ہوئے۔ اس کے اسباب کیا تھے، یہ امر توجہ طلب ہے۔ ہمارے یہاں فن و تنقید کی سب سے بڑی کمزوری یہ رہی ہے کہ جب ہم اپنے شعر و ادب کی شناخت کے حوالے سے کسی شخصیت اور فن پر قلم اٹھاتے ہیں تو ناقدین کے ذریعے پہلے سے بنے ہوئے زاویے ہم پر حاوی ہوتے ہیں اور ادب و شعر کو اپنی عینک سے نہ دیکھ کر دوسروں کی نظروں سے آنکنا شروع کر دیتے ہیں، تو

پھر ہمارے سامنے یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ جب دوسروں کی آرا کو ہم نے پہلے ہی مقدم سمجھ لیا تو پھر قلم اٹھانے کی زحمت ہی کیوں کی؟ ادب کے بڑے سے بڑے ناقد کی باتیں قرآن و حدیث کا درجہ نہیں رکھتیں کہ جن میں اضافہ یا جن کو بہ انداز دگر دیکھنا کفر ہے۔ اس لیے جب تک ہم آزادانہ طور پر مطالعے کی راہ ہموار نہیں کریں گے اس وقت تک ادب میں معروضیت کی بحالی ممکن نہیں۔ میں نے حتی الامکان حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری کا احاطہ کرنے کی کوشش کے ساتھ ان نکات کو ابھارنے کا جتن کیا ہے جن سے اپنے ہم عصروں میں حسن نعیم کی انفرادی شناخت قائم ہوتی ہے۔ ہر عہد میں دو تین شاعر ہی ایسے ہوئے ہیں جن کے نام سے وہ عہد پہچانا گیا۔ حسن نعیم بھی اپنے عہد کا ایک ایسا ہی غزل گو ہے۔ بحث کے سلسلے تو جاری ہیں اور جاری رہیں گے لیکن انھیں تیز تر کرنے میں کتابی شکل میں میری یہ کوشش تھوڑی سی بھی کامیابی حاصل کر لیتی ہے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائگاں نہ گئی۔

احمد کفیل

حسن نعیم کی شخصیت

حسن نعیم 'نئی غزل' کے ایک توانا اور آفاقی لب و لہجے کے شاعر ہیں۔ ان کی پیدائش 6 جنوری 1927 کو عظیم آباد (پٹنہ) کے ایک رئیس گھرانے میں ہوئی۔ ان کا نام سید حسن رکھا گیا۔ ان کے والد کا نام سید محمد نعیم تھا اور دادا سید شاہ غلام قاسم تھے، جو راجگیر کی درگاہ پیر امام الدین کے سجادہ نشیں تھے۔ ان کا شجرۂ نسب ساتویں پشت میں پیر امام الدین سے اور چودھویں پندرھویں پشت میں ہندوستان کے مشہور صوفی مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری سے اور پینتالیسویں پشت میں حضرت امام حسنؓ سے جاملتا ہے۔[1]

حسن نعیم کے دادا سید شاہ غلام قاسم کے بعد بھی اگر چہ سجادہ نشینی کا سلسلہ جاری رہا لیکن دادا حضور کے وقت سے ہی ان کے خاندان میں عصری تعلیم کا شعور اور اس کی اہمیت و افادیت کی کرن پھوٹنے لگی تھی۔ عصری تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے دادا محترم جب کسی شُعبے میں سب رجسٹرار (Sub-Registrar) ہوگئے تو اپنی سجادگی اپنے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف کے حوالے کردی۔ حسن نعیم کے والد سید محمد نعیم دو بھائی تھے۔ چھوٹے بھائی کا نام سید عبدالسمیع تھا۔ ان دونوں بھائیوں نے لندن جا کر اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور یکے بعد دیگرے بیرسٹر ہو کر لوٹے۔ حسن نعیم کے والد شہر بھاگلپور میں پریکٹس کرنے لگے اور لگ بھگ 1925 کے آس پاس پٹنہ منتقل ہو گئے۔

حسن نعیم اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے۔ سب سے بڑے سید احمد، ان

سے چھوٹے سیّد محمد اور تیسرے نمبر پر سید علی تھے۔ حسن نعیم کی عمر ایک سال کی تھی کہ ان کے والد محترم کا سایہ سر سے اٹھ گیا، اور زندگی پریشانیوں کے حصار میں آ گئی۔ ان کی والدہ شیخ پورہ ضلع مونگیر چلی گئیں جہاں ان کی دادی کا آبائی مکان تھا۔ ان کی کچھ جائیداد وہاں اور کچھ گیا ضلع میں تھی، جس سے گزر بسر ہونے لگی۔ حسن نعیم کی ابتدائی تعلیم اسی شیخ پورہ میں ہوئی۔ 1936-1937 کے آس پاس ان کی والدہ پھر پٹنہ آ گئیں، اور جسٹس سید نورالہدیٰ کے یہاں رہنے لگیں، جو رشتے میں حسن نعیم کے نانا تھے۔ حسن نعیم کی والدہ کا نام میمونہ خاتون تھا جو محلّہ بر داد، بہار شریف کے ایک مہذب اور زمیندار گھرانے کی صاحب زادی تھیں۔

1938 میں حسن نعیم کا داخلہ رام موہن رائے سمنری پٹنہ میں کرا دیا گیا۔ داخلہ کے وقت انھوں نے اپنے والد کے توسط سے اپنے اصل نام سیّد حسن میں نعیم کا اضافہ کر لیا جسے سلسلۂ شاعری کے شروع کرنے کے ساتھ تخلص کے طور پر استعمال کرنے لگے۔ ساتھ ہی وہ حسن کو بھی تخلص کے طور پر استعمال کرتے رہے۔

اگست 1939 میں حسن نعیم کی والدہ کا اچانک انتقال ہو گیا۔ والدہ کے انتقال کے بعد ان کے سب بھائی اس طرح بکھرے کہ کبھی ایک ساتھ رہنا نصیب نہ ہو سکا۔ خود حسن نعیم اپنی چھوٹی پھوپھی بیگم یوسف حسین کے یہاں محلّہ ٹیڑھی گھاٹ پٹنہ سیٹی چلے گئے اور وہیں 1941 میں محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ 1943 میں یہیں سے میٹرک پاس کر کے پہلے پٹنہ سائنس کالج پھر ایک سال بعد بی این کالج پٹنہ، میں داخل ہوئے، جہاں سے 1946 میں آئی ایس سی پاس کیا۔ اپنی چھوٹی پھوپھی کے یہاں قیام کے دوران سے ہی حسن نعیم کو اردو شاعری سے گہرا لگاؤ پیدا ہونے لگا۔ اس کی خاص وجہ یہ تھی کہ اعلیٰ علمی خاندان کے ساتھ ساتھ یہاں باذوق دوستوں کی ہم نشینی حاصل تھی۔ ان کی چھوٹی پھوپھی کے دولڑکے سیّد اصغر حسین اور سید احمد حسین کا مذاقِ سخن بھی اعلیٰ تھا۔ ان کے دوستوں میں سبھوں کو اساتذہ کے بہت سے اشعار یاد تھے۔ اکثر و بیشتر طرحی اور غیر طرحی نشستیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان میں عظیم آباد کے برگزیدہ شعرا بھی شریک ہوتے تھے۔ ڈاکٹر مبارک عظیم آبادی جن کی غزلوں کی اس زمانے میں کافی دھوم تھی، ان کے علاوہ بسمل عظیم آبادی (سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے) محمود علی خان صبا (شاگرد شاد) اور بدر عظیم آبادی جیسے شعرا محلّہ ٹیڑھی گھاٹ میں اکثر تشریف لایا کرتے تھے۔ سید شاہ رضی احمد

(مصنف: مجموعہ کشت خیال) اس گھر کے داماد تھے۔ شعرا کے ایسے خوش گوار ماحول میں حسن نعیم کی حساس طبیعت نے جلا پائی اور ان کی شاعری کا خمیر یہیں سے تیار ہونا شروع ہوا۔

1946 میں حسن نعیم کا داخلہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں بی ایس سی، میں ہوا۔ علی گڑھ پہنچنے سے قبل انھوں نے دس بارہ پابند اور آزاد نظموں کے علاوہ پانچ سات مکمل اور نامکمل غزلیں بھی کہی تھیں۔ علی گڑھ جو ابتدا سے ہی اردو شعر و ادب کا گہوارا تصور کیا جاتا ہے، یہاں کا ماحول حسن نعیم کے شاعرانہ ذہن کو بہت راس آیا۔ مستند اور مشہور شاعروں اور ادیبوں کے علاوہ تازہ فکر ادیبوں، شاعروں اور ناقدوں کا ایک کارواں یہاں موجود تھا۔ جو بعد میں عصری ادب کے ستونوں میں شمار کیے جانے لگے۔ انھی دنوں انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے باقاعدگی سے ہوا کرتے تھے جن میں حسن نعیم اکثر شریک ہوتے تھے۔ یہاں اکثر و بیشتر ہنگامی جلسے بھی ہوتے تھے۔ ایسے ہی ایک جلسے میں انھوں نے اپنی نظم 'تشویش' پڑھی تھی۔ حاضرین مجلس میں دیگر شعرا کے ساتھ جاں نثار اختر اور معین احسن جذبی بھی تھے۔ یہاں اس نظم کی کافی پذیرائی ہوئی۔ حسن نعیم کی یہ نظم 'تشویش' وہ پہلی تخلیق ہے جو ڈاکٹر مختارالدین احمد کی ادارت میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میگزین کے سالنامہ 1948 میں شائع ہوئی۔

علی گڑھ کے دوران قیام حسن نعیم نے قدیم و جدید ادب کا گہرا مطالعہ کیا۔ ادبی مباحثوں اور اسٹوڈنٹ فیڈریشن کی سرگرمیوں میں حصہ لیتے رہے۔ ٹیبل ٹینس سے ان کو بچپن سے ہی لگاؤ تھا۔ چنانچہ علی گڑھ یونیورسٹی انٹر ہاسٹل ٹورنامنٹ میں کئی بار چمپئن بھی رہے۔ ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی جو جدید اردو ادب کے ایک قد آور ناقد تصور کیے جاتے ہیں اس وقت بی۔ اے۔ کے طالب علم تھے۔ لیکن شاعر اور نقاد کی حیثیت سے اس وقت تک مشہور ہو چکے تھے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے حسن نعیم کی شاعری سننے کے بعد اپنی احسن رایوں سے انھیں نوازا اور کہا کہ آپ غزلوں کی طرف ہی خصوصی توجہ دیں جس کی وجہ صرف یہ تھی کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کو حسن نعیم کی غزلوں کا اسلوب اور مواد نیا نیا سا لگا۔ ؎ ڈاکٹر اعظمی کی رائے حسن نعیم کے دل کو لگ گئی۔ اس کے بعد ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی ایک دوست کے ساتھ ساتھ ان کے غزل گائیڈ بھی بن گئے، جو آخر آخر تک اپنے مفید مشوروں سے نوازتے رہے۔ باقر مہدی اور شہاب جعفری سے بھی انھی دنوں سے دوستی ہوگئی تھی جو آخر تک قائم رہی۔

1948 میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی. ایس. سی. کر لینے کے بعد حسن نعیم پٹنہ لوٹے۔ اس بار ان کا قیام اپنے خالو رفیع الدین بلخی (ایڈوکیٹ) کے دولت کدے پر رہا، جن میں شاعری کا بھی اچھا ذوق تھا۔ وہ بیدل و غالب کے پرستاروں میں تھے۔ اس دوران حسن نعیم نے چند غزلیں کہی جو پٹنہ کے علمی اور ادبی حلقوں میں مقبول ہوئیں۔ اس وقت پٹنہ میں ہندی پی. ڈبلو. اے. اور اردو انجمن ترقی پسند مصنفین کی ملی جلی نشستیں ہوتی تھیں۔ ان میں ہندی اور اردو ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ سیاسی لوگ بھی ہوتے تھے۔ انہی دنوں حسن نعیم انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری منتخب کیے گئے۔ پھر ان کی نگرانی میں انجمن کی نشستیں شہر کے مختلف محلوں میں ہوتی رہیں۔ نادم بلخی، نوشاد نوری، منظر شہاب، شاہد انور اور افتخار احمد وغیرہ ایسے رفقا تھے جو تنظیمی کارروائیوں سے متعلق منصوبے میں حسن نعیم کی ہمیشہ مدد کیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ترقی پسند ادب کا ترجمان ماہنامہ 'نئی راہ' گیا سے شائع ہوا۔ 'نئی راہ' کا دوسرا اور آخری شمارہ حسن نعیم کی ادارت میں پٹنہ سے شائع ہوا۔ 1952 میں بہار کے نمائندہ شاعروں کا ایک عمدہ انتخاب رضا نقوی (واہی) نے مرتب کر کے شائع کیا تھا۔ اس میں حسن نعیم کی ایک غزل شامل تھی جس میں ایک شعر تھا:

عرش و کرسی یہ نہیں جو حکم سے چل جائے کام
یہ زمیں ہے رفتہ رفتہ انقلاب آئے گا دوست

حسن نعیم کے اس غزل کی کافی شہرت ہوئی تھی۔ مظہر امام نے ماہنامہ 'سہیل' گیا میں 1953 میں ایک مضمون بہ عنوان 'بہار کے نئے شعرا' لکھا تھا جس میں حسن نعیم کی غزل کا بطور خاص ذکر کیا تھا۔[5]

عظیم آباد میں حسن نعیم کو چاہنے والے بہت سے دوست احباب تھے۔ حسن نعیم جب بھی عظیم آباد پہنچتے تو ان کے استقبال میں ادبی و شعری نشستیں کی جاتیں۔ عطا کاکوی، ڈاکٹر محسن، سہیل عظیم آبادی، رضا کریم، سید حسن رضا نقوی واہی، مظہر امام، ظہیر صدیقی، ش مظفر پوری، شکیب ایاز، سلطان اختر، شفیع جاوید، قمر اعظم ہاشمی، ظفر اوگانوی اور ڈاکٹر نرمدیشور وغیرہ کے ساتھ رہ کر حسن نعیم نے اپنے شعری ذوق کو سنوارنے کے لیے بڑے تجربے کیے۔

علی گڑھ میں تحصیل علم کے دوران وہاں کی ادبی محفلوں اور باشعور نوخیز فنکاروں،

ناقدوں اور دوستوں کی صحبت اور ان سے مباحثے کے ذریعے حسن نعیم کی سوچ کو ایک رخ ملا۔ ذہن میں کچھ تخلیقی مسائل بار بار سر اٹھانے لگے۔ یہ وہ مسائل تھے جن کے سامنے ان کا اپنا ہی پیشتر کہا ہوا کلام فرسودہ لگنے لگا۔ وجہ یہ تھی کہ اس وقت سماج، مزاج اور اخلاقی اقدار میں 1947 کے بعد جو اچانک تبدیلیاں رونما ہونے لگی تھیں، انھیں محسوس کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے اس کا اظہار غزل کے مروجہ اسالیب اور لہجوں میں اپنی تخلیقی ہنرمندی کے ساتھ کیا اور اس میں وہ جان پیدا کی جس سے غزل عصری صداقتوں سے ہم آہنگ ہو جائے۔ پھر حسن نعیم نے ان نئے اسالیب کو ایک سمت دینے کے لیے الفاظ، استعارات، پیکر اور علائم میں گہرے تجربے کیے۔ اس کے لیے انھوں نے غزل کی روایات کا تجزیاتی مطالعہ کیا اور اسالیب کی ایک ایسی راہ تیار کی جس کا پیکر روایت سے قریب تھا اور الفاظ، استعارے اور علائم کی سطح پر تخلیقی ہنرمندی نے اس آواز کو ایک نئی آواز بنا دیا۔ آج حسن نعیم کی شناخت اردو غزل گوئی میں اسی آواز کے بنیاد گزار کی حیثیت سے ہوتی ہے۔ تغزل، لفظوں کی تخلیقی ہنرمندی، تہہ داری، رمز کاری اور اشعار میں ابھرنے والے ایک توانا کردار کی حیثیت سے حسن نعیم کی غزل گوئی اپنے ہم عصر شعرا میں بیشتر شعرا کی غزل گوئی پر حاوی ہے۔

حسن نعیم کے خالو رفیع الدین بلخی (ایڈوکیٹ) جو خود شعری ذوق رکھتے تھے اور بیدل و غالب کے پرستاروں میں تھے، ان کے یہاں اکثر شاعروں اور سیاسی شخصیتوں کا مجمع لگا رہتا تھا۔ علامہ جمیل مظہری، بلخی صاحب کے دوستوں میں سے تھے۔ حسن نعیم نے یہیں جناب فصیح الدین بلخی سے بھی شرف نیاز حاصل کیا۔ بلخی صاحب ایک درویش صفت مورخ اور محقق بھی تھے۔ ایک مشہور کتاب 'تاریخ مگدھ' انھوں نے ہی لکھی ہے۔ ایک تنقیدی کتاب 'انشاد شاد' بھی انھی کی لکھی ہوئی ہے۔ اردو غزلیہ شاعری اور اس کے رموز و نکات کا گہرا معروضی مطالعہ حسن نعیم نے بلخی صاحب سے حاصل کیا اور مسلسل سات آٹھ مہینوں تک ان کے علم سے فیض اٹھانے کے بعد اپنی سابقہ شاعری کو رد کرتے ہوئے 1950 سے حسن نعیم نے ایک نئے شعری سفر کا آغاز کیا۔

حسن نعیم نے اپنی ملازمت کی ابتدا 1949 میں محمڈن اینگلو عربک اسکول پٹنہ میں استاد کی حیثیت سے کی۔ پرویز شاہدی جو حسن نعیم کے خالہ زاد بھائی تھے وہ حسن نعیم سے بے حد محبت کرتے تھے۔ علی گڑھ سے بی۔ ایس۔ سی۔ کر لینے کے بعد حسن نعیم ایک طرح سے بے روزگار ہی

تھے۔ محمڈن اینگلو عربک اسکول میں تدریسی کام ایک طرح سے وقت گزاری کا شغل تھا۔ یہ دیکھ کر پرویز شاہدی نے انھیں کلکتہ بلا لیا۔ پرویز شاہدی اس وقت کلکتہ سی. ایم. او، ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اس اسکول میں حسن نعیم کی تقرری 1952 میں سائنس کے ایک استاد کی حیثیت سے ہوئی۔ اس وقت مظہر امام بھی اسی اسکول میں استاد تھے۔ یہاں لگ بھگ ایک سال ملازمت کرنے کے بعد حسن نعیم قسمت آزمائی کے لیے دہلی چلے آئے۔ ڈاکٹر سید محمود اس وقت 'ہسٹری آف فریڈم موومنٹ' کے چیرمین تھے۔ محمود صاحب حسن نعیم سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے حسن نعیم کو اپنا پرسنل سکریٹری چن لیا، اور 1954 میں جب وہ وزارت خارجہ میں وزیر مملکت ہوئے تو بطور سکریٹری حسن نعیم بھی ان کے ساتھ رہے۔ اس طرح ملازمت کا سلسلہ 1968 تک قائم رہا۔

1955 میں بینڈونگ (انڈونیشیا) میں ایک ایفروایشیائی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں بطور ڈیلی گیٹ حسن نعیم بھی شامل ہوئے تھے۔ 1956 میں جب پنڈت جواہر لعل نہرو سعودی عرب تشریف لے گئے تو دیگر افراد کے ساتھ حسن نعیم بھی اس سفر میں شامل تھے۔ اپنی ملازمت کے دوران حسن نعیم کا تبادلہ دوبار ہندوستان سے باہر ہوا۔ پہلی بار ساڑھے تین برسوں کے لیے (58 تا وسط 61) جدہ میں ہندوستان کے نائب قونصل رہے۔ اور دوسری بار چار برسوں تک (64 تا وسط 68) نیویارک میں انڈین مشن برائے اقوام متحدہ میں بطور اتاشی کام کیا۔ اس کے علاوہ ایشیا، افریقا، یورپ اور امریکا کے کوئی پندرہ بیس ممالک کی سیر و سیاحت کے دوران انھیں وہاں کی طرز رہائش اور تہذیبی اقدار کو سمجھنے کا موقع ملا۔

حسن نعیم کی شادی 26 مارچ 1950 کو مقبول افسانہ نگار احمد یوسف صاحب کی بہن سے ہوئی۔ یہ ایک نیک سیرت اور نیک صورت خاتون تھیں، جن کا اصل نام حشمت آرا بیگم تھا۔ گھر پر لوگ ممی کے نام سے پکارتے تھے۔ انھوں نے 'شاہدہ یوسف' کے نام سے اردو کے کئی اچھے افسانے لکھے ہیں، جو مختلف رسالوں میں شائع ہوتے رہے۔ ان کی وفات 23 فروری 2000 میں ہوگئی۔

حشمت آرا بیگم کے بطن سے سات اولادیں ہوئیں۔ جن میں چار اولادیں (دو لڑکیاں اور دو لڑکے) بقید حیات رہیں۔ سب سے پہلے میمونہ نعیم (عرف منا، دادی جان کے نام

'میمونہ خاتون' کی مناسبت سے) پیدا ہوئیں جو فی الوقت ذاکر باغ، دہلی میں رہتی ہیں۔ اس کے بعد 1953 میں ایک لڑکا ارشد نعیم کی ولادت ہوئی لیکن ایک ہی سال ہنسنے کھیلنے کے بعد اس کی وفات ہوگئی۔ اس کی وفات پر حسن نعیم نے دو قطعے کہے۔ 1955 میں حسن نعیم مع اہل وعیال پٹنہ چھوڑ کر کارنوالس روڈ (انڈیا گیٹ کے پاس) دہلی میں ایک فلیٹ لے کر رہنے لگے، اور دہلی کے ہی ہو کر رہ گئے۔ یہاں ان کی تیسری اولاد خالدہ نعیم پیدا ہوئیں لیکن یہ بھی زندہ نہ رہ سکیں۔ چوتھی اولاد منی پیدا ہوئیں جو ایک مہینہ کے اندر ہی چل بسیں۔ لیکن ہر حادثے کے بعد منا (میمونہ نعیم) کا وجود حسن نعیم کے زخموں کا مداوا بنتا رہا۔ جدہ میں پوسٹنگ کے دوران حسن نعیم اور ان کی اہلیہ ممی کی طبیعت اکثر خراب رہا کرتی۔ چنانچہ انھوں نے کہا: ؎

اتنا دل نعیم کو ویراں نہ کر حجاز
روئے گی موج گنگ جو اس تک خبر گئی

جدہ کے قیام کے دوران پانچویں اولاد شہیرہ نعیم پیدا ہوئیں، جنھیں حسن نعیم 'حسن نجم' بھائی علی نعیم 'حور عرب' اور گھر میں لوگ تفریحاً 'چڑیل' کہا کرتے تھے۔ یہ فی الوقت انگریزی کی صحافی ہیں اور اپنی سسرال خرم نگر، لکھنؤ میں رہ رہی ہیں۔ جدہ میں ہی 'ارشی' (ارشاد نعیم) پیدا ہوئے۔ انھوں نے ایم. اے. تک کی تعلیم حاصل کی اور ابھی روزگار کی تلاش میں ہی تھے کہ تھری وہیلر سے سفر کرتے ہوئے ایک حادثہ کے شکار ہوگئے۔ یہ اپنی بہن شہیرہ کے پاس لکھنؤ میں رہتے ہیں۔ ارشاد نعیم ہیں تو باحیات لیکن جسمانی طور پر معذور اور ڈاکٹروں کی رائے میں مکمل صحت یابی کی امیدیں موہوم ہیں۔[6] اس حادثے نے حسن نعیم کو بہت رُلایا جس کی ٹیس وہ اپنی آخری سانس تک محسوس کرتے رہے۔ آخری اولاد اشعر نعیم پیدا ہوئے جو فی الوقت مسقط میں برسرروزگار ہیں۔ حسن نعیم کو اپنی اولاد سے بے حد محبت تھی اور بچے بھی اپنے ابی سے اسی قدر مانوس تھے۔ نیویارک کے دوران قیام سے ہی حسن نعیم نے اپنی اولادوں کے تعلیمی سلسلے کو شروع کر دیا تھا۔

حسن نعیم اپنی زندگی میں بہت سارے نامساعد حالات سے گزرے جس کی ابتدا 1968 سے ہی شروع ہوگئی تھی۔ اسی سال فارن کی اتنی بڑی ملازمت کو استعفا دے دیا اور اسی سال فروری میں ان کے بڑے بھائی سید احمد تپش کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں بعد پرویز شاہدی

کا انتقال ہوگیا۔ اتنے سارے غموں کا بیک وقت بوجھ برداشت کرنا حسن نعیم کے لیے جوئے شیر کے لانے سے کم نہ تھا۔ اپنے سگے بھائی اور خالہ زاد بھائی کی تعزیت میں انھوں نے بہت سے اشعار کہے ہیں۔ ستمبر 68 میں حسن نعیم مجبور، نڈھال اور دل گرفتہ ہوکر نیویارک سے ہندوستان پہنچے۔ لیکن فوراً ہی انھیں کسی اور سفر پر روانہ ہونا پڑا جس کی ترجمانی انھوں نے اس شعر میں کی ہے: 7

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

حسن نعیم ایک دوراندیش، خوش مزاج، انا پسند اور یار باش انسان تھے۔ تنک مزاجی اور اپنی راہوں کو اوّل وآخر جاننا بھی ان کی فطرت میں داخل تھا۔ ان کی آنکھیں تو خانقاہ میں کھلیں لیکن زندگی میکدوں کی سیر میں گزر گئی۔ ملازمت کے دوران وہ جب بھی امریکا سے ہندوستان چھٹیاں گزارنے آتے تھے تو دہلی، بمبئی، علی گڑھ اور پٹنہ کے ادیب و شاعران کے اردگرد ہوتے تھے۔ ان کے لیے محفلیں منعقد ہوتی تھیں، شامیں سجائی جاتی تھیں اور ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیے جاتے تھے۔ چنانچہ 1963-1960 کے دوران دہلی میں ایک ادبی تحریک 'ادبی سماج' کے نام سے متحرک تھی اس میں حسن نعیم کی کارگزاریوں کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کی رپورٹ ماہنامہ 'تلاش' دہلی میں محفوظ ہے۔ 8

امریکا میں حسن نعیم کو زیادہ دنوں رہنا نصیب نہ ہوسکا۔ وہ امریکا کی سماجی زندگی میں دخل دینے لگے۔ گورے اور کالے کی نسلی سیاست میں دلچسپی لینے لگے۔ انھیں یہ بات قطعی گوارانہ تھی کہ انسانیت کی عالمی قدریں گورے اور کالے کے بھید بھاؤ میں پامال ہوجائیں۔ لیکن حسن نعیم کی یہ دلچسپی حکومت کی سیاسی پالیسی کے اعتبار سے معیوب سمجھی گئی اور ان کو اس نسلی سیاست سے دور رہنے کی تاکید کی گئی۔ لیکن حسن نعیم:

> ''مسلسل کالے ادیبوں اور شاعروں کے باغی اجتماعات میں ہندوستان کی نمائندگی کرتے رہے۔'' 9

اس کے علاوہ حسن نعیم کے مشرب رندانہ سے انڈین ایمبیسی (embassy) پریشان تھی۔ انھیں کئی بار تنبیہ کی گئی کہ وہ اپنے فطری رویے میں تبدیلی لائیں لیکن حسن نعیم اپنی فطرت

اور مزاج کو کیوں کر بدلنے والے تھے۔ انجام کار انھیں وہاں سے پھر سعودیہ منتقل کر دیا گیا۔ لیکن سعودیہ پہنچ کر بھی حسن نعیم کا شعار وہی رہا۔ قبل اس کے کہ انھیں معطل کرنے کے لیے چارج شیٹ تیار کی جائے وہ خود استعفا دے کر دہلی لوٹ آئے۔ [10]

فارن کی سروس سے مستعفی ہونے کے بعد حسن نعیم پہلی ستمبر 1970 کو 'دہلی میں آل انڈیا غالب سینٹینری کمیٹی (تشکیل 22 فروری 1970) میں ڈائریکٹر کی حیثیت سے بحال ہوئے۔ فخرالدین علی احمد اس کے جنرل سکریٹری تھے۔ اس کمیٹی کے لیے حسن نعیم کا انتخاب کرنے والوں میں جناب فخرالدین علی احمد، قاضی عبدالودود اور یوسف حسین خان تھے۔ ''آل انڈیا غالب سینٹری کمیٹی'' کے قیام کے بعد جب اس کے سارے نظام درست کر لیے گئے تو یہ کمیٹی 1971 میں 'غالب انسٹی ٹیوٹ' کے نام سے منتقل ہوگئی۔ (یہ انسٹی ٹیوٹ دہلی میں آئی، ٹی، او کے پاس ہے جسے 'ایوانِ غالب' بھی کہا جاتا ہے) بحیثیت ڈائرکٹر حسن نعیم نے اپنی انتھک کوششوں سے تین سال کے قلیل عرصے میں کافی اہم خدمات انجام دیں۔ منسٹری سے گرانٹ لینا، سیمینار منعقد کرانا، اقتصادی حالات درست کرانا، غالب پر مطالعے کے نئے راستے ہموار کرنا اور عمارت کے تعمیری کاموں میں دن رات لگے رہنا ان کا ایک محبوب مشغلہ بنا رہا۔ جناب ایم. الٰہی اور خان ایم. اے. یو، جو اپنے وقت کے دہلی کے ایک مشہور آرکیٹیکٹ تھے، ان کے ذریعے آڈیٹوریم کے تعمیری کاموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ قاضی عبدالودود اس وقت 'ایوانِ غالب' کی مجلس عاملہ کے ممبر اور ٹرسٹی تھے۔ حسن نعیم میں ایک ناظم کی بہترین صلاحیت تھی۔ بیگم عابدہ احمد جو جناب فخرالدین علی احمد کی شریک حیات ہیں ان سے فنڈ اکٹھا کرنے میں حسن نعیم کو بڑی مدد ملی۔ اپنے دوران ملازمت حسن نعیم نے 'ایوان غالب' کی تعمیر و تشکیل کی ایک منظم رپورٹ دفتر میں موجود ریکارڈ کی بنیاد پر تیار کی تھی جو بعد میں 1976 میں شائع شدہ 'غالب نامہ' جلد 1,2 میں دیکھی جا سکتی ہے۔ حسن نعیم لکھتے ہیں:

> ''میں وہاں ('ایوانِ غالب' میں) لگ بھگ ساڑھے تین سال رہا۔ میں نے ہی آڈیٹوریم بنوایا، دفتر قایم کروایا اور اس کا جو سالانہ آڈٹ وغیرہ ہوتا ہے وہ سب ڈھرے پر لایا۔ اس کے علاوہ وہ منشور بنائے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کیا کام کرے گا۔ یہ ساری ڈرافٹنگ وغیرہ کی۔'' [11]

بحیثیت ڈائرکٹر حسن نعیم کی کارگزاریوں کو بیان کرتے ہوئے شہباز حسین لکھتے ہیں:

> ''ایوانِ غالب، کو تکمیل کے مراحل تک پہنچانا اور وہاں غالب سے متعلق سرگرمیوں کو شروع کرنے میں حسن نعیم کی خدمات کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔'' 2ملہ

حسن نعیم جب تک 'ایوانِ غالب' سے وابستہ رہے، اس درمیان 'DCM' کی طرف سے ہر سال ہولی کے ایک دن قبل اکثر مشاعرے ہوا کرتے تھے اور جو شعرا مدعو ہوتے تھے ان میں سے بیشتر کا قیام حسن نعیم کے یہاں ہوتا تھا۔ ان کے یہاں ادیبوں سے لے کر سیاست دانوں تک کی دعوتیں ہوتی رہتی تھیں اور حسن نعیم بڑی خوش ذوقی سے سبھوں کا استقبال کیا کرتے تھے لیکن یہ دور بھی زیادہ دنوں تک قائم نہ رہ سکا۔ 'ایوانِ غالب' کی ملازمت کے دوران حسن نعیم نے جہاں اپنی غیر معمولی ذہانت اور اخلاقیات کے ثبوت فراہم کیے، وہیں ان سے کچھ غلطیاں بھی سرزد ہوئیں۔ 'ایوانِ غالب' کی مجلس مشاورت کے کچھ لوگ ان سے خفا ہو گئے۔ ہوتا یہ تھا کہ اکثر و بیشتر حسن نعیم اپنی مرضی سے 'ایوانِ غالب' میں سیمینار کرادیتے تھے۔ دوم یہ کہ شام غزل منعقد کر کے دوسروں کی کم اور اپنی غزلیں زیادہ، خوش لحن مغنیوں سے پڑھواتے تھے، اور یہ چیزیں کسی ادارے کی تنظیم کے خلاف تھیں۔ قاضی عبدالودود صاحب اس بات سے کافی برہم ہوئے۔ لیکن اس کے باوجود شاید ہی کوئی ایسی شام رہی ہو جب وہاں محفلِ غزل نہ سجائی گئی ہو۔ ان میں دہلی کے احباب شعرا اور موسیقاروں کے علاوہ شہر کے نامور غزل سرا استاد اقبال احمد خان، ہلال احمد خان، کوکب درّی، مسز اوشا سیٹھی، وندنا واجپائی، شری متی نینا دیوی، اور اردو ادب کی مشہور کلاسیکی غزل سرا بیگم اختر کے ساتھ شہر بانو بھی حاضر رہتی تھیں۔

حسن نعیم کی ان ذاتی کارگزاریوں سے قاضی عبدالودود کے ساتھ ساتھ بیگم عابدہ احمد بھی خفا ہو گئیں۔ شہباز حسین لکھتے ہیں:

> ''اس کی وجہ تو کچھ حد تک حسن نعیم کا غیر محتاط انداز گفتگو تھا جسے بڑھا چڑھا کر لوگ قاضی صاحب کو سناتے رہے اور کچھ حد تک قاضی صاحب کا اندیشہ تھا کہ حسن نعیم، فخرالدین علی احمد صاحب (جو اس ادارے کے سکریٹری تھے اور

صدر وزیر اعظم اندرا گاندھی تھیں) کا قرب حاصل کر کے انھیں 'ایوانِ غالب'
کے معاملات میں بے اثر نہ بنا دیں۔" 13

مندرجہ بالا بیانات کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ قاضی عبدالودود اور حسن نعیم دونوں ہی تنک مزاج آدمی تھے۔ ایک دوسرے کی تھوڑی سی کوتاہی بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ جن دنوں یہ آپسی تناؤ پیدا ہوا قاضی عبدالودود اکثر و بیشتر پٹنہ میں ہی رہا کرتے تھے لیکن چاہتے تھے کہ پروگرام جب بھی ہو میری رائے کے باہر نہ ہو اور حسن نعیم تھے کہ ان سے رائے لینے پٹنہ جانا یا خط و کتابت کرنا کبھی گوارا نہ کرتے تھے۔ اس آپسی تناؤ میں اضافے کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ قاضی صاحب کے منصوبے کے مطابق حسن نعیم نے ایک رپورٹ تیار کی کہ کس طرح 'ایوانِ غالب' وجود میں آیا اور کن کن لوگوں نے کیا کردار ادا کیا۔ غرض جو ریکارڈ 'ایوان غالب' میں موجود تھا اس کی بنیاد پر حسن نعیم نے رپورٹ تیار کی۔ لیکن اس ریکارڈ کے ایک دو ناموں سے قاضی صاحب کو اعتراض تھا اور وہ چاہتے تھے کہ رپورٹ سے ان ناموں کو حذف کیا جائے۔ لیکن حسن نعیم کا کہنا تھا:

> "جو چیز ریکارڈ میں ہے اور اندرا گاندھی کے دستخط سے جو رپورٹ بھیجی گئی ہے میں اس میں سے کچھ بھی حذف نہیں کر سکتا۔" 14

غرض اس وقت لوگوں کی طرف سے بہت کوششیں ہوئیں کہ قاضی عبدالودود اور حسن نعیم کے اندرونی تناؤ ختم ہوں۔ لیکن دونوں حضرات میں سے کسی کے اندر نرمی نہ آئی۔ شہباز حسین صاحب کے ذریعے قاضی صاحب سے چھیڑی گئی گفتگو کے دوران حسن نعیم کہتے ہیں:

> "میں خود تنگ آ چکا ہوں... اب ایسا ہے کہ میں جانتا ہوں کہ آڈیٹوریم، میں چلا گیا تو مکمل نہیں ہوگا اور آپس کے جھگڑوں میں پڑ جائے گا تو میرا اندازہ ہے کہ چھ مہینے کے بعد یہ آڈیٹوریم کمپلیٹ ہو جانا چاہیے... اس کے بعد میں خود استعفادے دوں گا۔" 15

لیکن اندرونی تناؤ اتنا بڑھتا گیا کہ آڈیٹوریم کے کمپلیٹ ہونے میں صرف چند ہفتے ہی باقی تھے کہ حسن نعیم نے 10 جولائی 1973 کو 'ایوانِ غالب' کے ڈائرکٹر کے عہدے سے

استعفا دے دیا۔ حالاں کہ استعفا دے دینے کے بعد قاضی صاحب، بیگم عابدہ احمد اور جناب فخرالدین علی احمد کو بھی کافی افسوس ہوا۔

11 فروری 1977 کو فخرالدین علی احمد کے انتقال کے بعد 'ایوانِ غالب' میں ایک تعزیتی نشست ہوئی تھی۔ اس نشست میں سیاست دانوں، ادیبوں اور شاعروں سے لے کر عام لوگ شریک ماتم تھے۔ حسن نعیم نے اس نشست میں مرحوم جناب فخرالدین علی احمد کی وفات پر ایک منظوم خراج عقیدت پیش کیا، 16؎ اسے سن کر عوام وخواص کو اندازہ ہوا تھا کہ حسن نعیم کی قربت جناب فخرالدین علی احمد سے کس قدر تھی۔ حاضرین نے اس منظوم خراج عقیدت کی بڑی تعریفیں کی تھیں۔ 17؎

'ایوانِ غالب' سے علاحدہ ہونے کے بعد 1975 میں یونین پبلک سروس کمیشن نے ترقی اردو بیورو، وزارت تعلیم حکومت ہند کے پرنسپل پبلی کیشنز آفیسر کے عہدے کے لیے حسن نعیم کو طلب کیا۔ شہباز حسین کے بقول:

> ''حسن نعیم نے اس عہدے کے لیے درخواست نہیں دی تھی۔ لیکن کمیشن کو یہ اختیار ہے کہ وہ کسی بھی شخص کو انٹرویو کے لیے بلا سکتا ہے۔'' 18؎

اس وقت ڈاکٹر اخلاق الرحمٰن قدوائی کمیشن کے چیرمین تھے اور پروفیسر عبدالعلیم اردو بورڈ کے چیرمین تھے۔ ایک مرتبہ علیم صاحب کی شہباز صاحب سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ حسن نعیم صاحب کا انتخاب ہو گیا ہے۔ لیکن شہباز حسین کے بقول:

> ''مگر نہ معلوم کن اسباب کی بنا پر کمیشن نے حسن نعیم کو آفر نہیں دیا اور اس جگہ پر ڈاکٹر شارب ردولوی کا تقرر عمل میں آیا۔'' 19؎

'ایوانِ غالب' کے ڈائرکٹر کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد حسن نعیم کی زندگی کی گرم جوشی خموشیوں میں تبدیل ہو گئی جو اپنی انا اور محفل یاراں کی نزاکت میں ٹکراؤ کا نتیجہ تھی۔ دہلی کی ادبی محفلیں خواہ شعر و شاعری کی کوئی نشست ہو یا ادبی سیمینار تمام سرگرمیوں سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ دوست احباب، اپنے بیگانے جتنے تھے سبھوں سے علاحدہ ہو گئے۔ دہلی میں مسلسل سات آٹھ برسوں تک سخت معاشی بحران سے دوچار رہے۔ کچھ ترجمے اور کچھ دیگر ذرائع سے اپنا مسئلۂ معاش حل کرتے رہے۔ جس محفل کے لیے انھوں نے اپنی پوری زندگی کا

اثاثہ لٹایا، جسے آراستہ کرنے میں اپنا خونِ جگر جلایا اور جس پذیرائی کے لیے وہ زندگی کی آخری سانس تک سرگرداں رہے وہ شہرت اور پذیرائی محفل یاراں میں نہ ہو سکی۔ محض تصور اتنا تھا کہ وہ اپنی انا کے سامنے کبھی جھکنے کو تیار نہ ہوئے۔ لہٰذا زندگی کے ان سخت تجربات نے ہجوم روزگار اور محفل یاراں سے کنارہ کشی کا فیصلہ دیا اور پھر وہ درویشانہ زندگی گزارنے پر آمادہ ہو گئے۔

حسن نعیم اپنے ایک انٹرویو میں مظفر حنفی سے فرماتے ہیں:

> ''میں اپنے تجربات کی بنا پر یہ سمجھتا رہا ہوں کہ جو لوگ تخلیقی کام کو اولیت نہ دے کر اپنی شہرت کے خواہاں ہوتے ہیں، وہ لوگ مشہور ہونے کے بعد اوّل تو لائق ذکر کام نہیں کر پاتے۔ دوسرے جن ذرائع سے مشہور ہونا اردو ادب میں طے پایا ہے، مجھے ان سے سخت اختلاف ہے۔ پھر میں نے اپنے تجربات کی بنا پر یہ طے کیا کہ اگر کوئی آدمی اپنے فن کی بنیاد پر مشہور ہو جاتا ہے تو صحیح ہے، ورنہ اوّلیت اس بات کو دینی چاہیے کہ وہ جو کام کر رہا ہے، اس میں اس کا خلوص اور اس کی لگن کس حد تک ایماندارانہ ہے۔'' 20

یہ سچ ہے کہ حسن نعیم کی اس دور کی غزلوں میں زیادہ توانائی پیدا ہو گئی ہے اور دوسری بات بھی حقیقت سے پرے نہیں۔ اردو غزل کا ہمارا آئیڈیل شاعر غالب خود ایسے ہی کرب کا مارا ہوا ہے۔ ذوق کے سامنے اس وقت عوام نے کبھی غالب کو نہیں سراہا اور یہاں تک کہا کہ ''مگر اپنا کہا وہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے'' یا پھر یہ کہ ان کی شاعری کو ''کوہ کندن و کاہ برآوردن'' سے مثال دی۔ لیکن جوں جوں ان کی شاعری اور ماحول کے چہرے سے دھول، گرد صاف ہوتی گئی لوگوں کے سامنے ان کی غزلوں کی تہہ داری اور معنویت کا نقاب بھی کھل کر آ گیا۔ حسن نعیم بھی اپنی شاعری اور وقتی ناقدری سے مایوس نہیں:

وقت ہی ناقد ہے ایسا، جس کو سب معلوم ہے
حرف کے پردے میں کس نے کیا کہا، کیسا کہا

یہ امر مسلم ہے کہ کوئی بھی معیاری ادب اپنی طرف گہری توجہ کا طالب ہوتا ہے۔ قاری کی سرسری اور سطحی نظریں فن اور قاری دونوں کے لیے مضر ہوتی ہیں کیوں کہ فن کے اندر چھپے ہوئے جواہر پارے نظروں کی الٹ پھیر میں گرفت سے باہر رہ جاتے ہیں۔

بہرحال میں یہ بیان کر رہا تھا کہ 'ایوانِ غالب' سے کنارہ کش ہونے کے بعد حسن نعیم کی زندگی طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار رہی۔ یہ اوقات ان کے لیے بہت صبر آزما تھے۔ اہل وعیال کی ذمے داری، بچے اور بچیوں کی تعلیم، اپنے ذاتی اخراجات کے مسئلے وہ کیسے کیسے حل کرتے رہے اس ضمن میں بہت ہلکے اشارے ہمیں مل پاتے ہیں۔ ایسا ہی کچھ سوال مظفر حنفی نے بھی پوچھا تھا تو حسن نعیم کا جواب تھا:

''یہ آپ نے وہ سوال کیا ہے جس کا جواب میں تفصیل سے نہ دے سکوں گا۔ دراصل میرا آنے والا مجموعہ 'دبستان' ہے جس کے ابتدائیہ 45 صفحات میں میں نے اپنی سوانح عمری لکھی ہے۔ تفصیل اس میں آپ کو مل جائے گی۔'' 21

لیکن یہ مجموعہ ان کی وفات کے بعد شہر بانو کے ذریعے شائع ہو کر 1992 میں منظر عام پر آیا جس میں حسن نعیم کی سوانح عمری کے یہ 45 صفحات حذف ہیں۔ البتہ شہر بانو کی حسن نعیم سے متعلق اپنی عرض داشت سات صفحات میں شامل ہیں۔ اگر یہ سوانح 'دبستان' کے ساتھ شائع ہو جاتی تو حسن نعیم کی زندگی کے باب اور روشن ہو جاتے۔

حسن نعیم نے اپنی زندگی کے آخری ایام شہر بانو کے یہاں ہی گزارے۔ شہر بانو ان کی دوسری اہلیہ کہی جاتی ہیں۔ لیکن میری حاصل شدہ تحقیق سے یہ امر قابل غور ہے کہ حسن نعیم نے دوسری شادی کی تھی یا نہیں؟ 22

حسن نعیم میں وہ لگن اور قابلیت تھی کہ زمانے سے جب جو چاہا وہ انھیں ملا۔ وہ وزارت خارجہ میں ایک اونچے عہدے پر فائز رہے۔ امپورٹ ایکسپورٹ کے ایڈیشنل کنٹرولر رہے، جدہ اور نیویارک میں حکومت ہند کے ڈپلومیٹ رہے، ایوان غالب کے ڈائرکٹر رہے، بہت روپئے کمائے، لیکن جیسے کمائے ویسے ہی لٹا دیے۔ دوست احباب کا ان کے یہاں تانتا لگا رہتا تھا۔ لہٰذا اپنے پلے انھوں نے کچھ بھی بچا کے نہیں رکھا۔ انور ظہیر خان لکھتے ہیں:

''دیس میں رہے یا بدیس میں اونچی کرسی نے (حسن نعیم کا) ہمیشہ سواگت کیا۔ بلکہ پہلی کرسی نے دوسری کرسی کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مگر انھوں نے بوریہ نشینی سے پیمان وفا باندھ رکھا تھا۔ دنیا کے سارے سورگ انھیں بلاتے

رہے۔ مگر وہ تھے کہ نرک میں بھسم ہوکر کشتہ بنتے رہے۔ ڈھیروں کمایا،
ڈھیروں لٹانے کا جتن کیا۔ چنانچہ کبھی پلے کچھ نہیں رہا۔ جیب جہاں چھیے
بھرتی دامن جھٹک کرکل کی فکر کرنے لگتے۔"23

اپنی اس تہی دستی کی لاج رکھنے کے لیے حسن نعیم تراجم اور تبصرے سے کسی طرح کچھ پیسے حاصل کرتے رہے۔ کچھ رقم تو اپنی آبائی جائیداد سے جا کر لاتے رہے۔ دو پرائیویٹ ملازمتیں بھی کیں۔ اور ان احباب نے بھی بطور قرض کچھ مدد کی جن کی ترقی اور خوش حالی میں حسن نعیم کا بھی ہاتھ تھا۔ حسن نعیم کے بڑے بھائی جو پاکستان میں پانی کے جہاز پر کپتان تھے اور جن کے جہاز ہندوستان بھی آتے تھے وہ بھی کسی نہ کسی طرح ان کا تعاون کرتے رہے۔ لیکن یہ عارضی سہارے کب تک کام آسکتے تھے۔ دلی میں وہ جس مکان میں رہتے تھے وہ کرایے کا مکان تھا۔ ایک عرصے سے اس کا کرایا نہیں چکایا تھا۔ جو تھوڑے بہت پیسے ہوتے تھے بچوں کی تعلیم میں صرف ہوتے گئے اور مکان کا کرایا پانچ، سات ہزار روپئے واجب الادا ہو گئے۔ نوبت یہاں تک آپہنچی کہ مالکِ مکان نے مقدمہ کردیا۔ دہلی میں ایک طرف تو محفل یاراں سے کنارہ کشی اور دوسری طرف یہ معاشی مسئلے اور تیسرے اپنی طبیعت کی جولانی ان کے لیے وبال جان بنتی رہی۔ اسی دوران مجروح سلطان پوری، علی سردار جعفری اور کیفی اعظمی کی قربت سے انھیں اندازہ ہوا کہ بمبئی چل کر کچھ پیسے کمائے جاسکتے ہیں اور دوسری بات یہ تھی کہ حسن نعیم کے مداحوں میں ظ انصاری، ندا فاضلی، باقر مہدی وغیرہ بھی بمبئی میں ہی قیام فرما تھے۔ اس امید نے حسن نعیم کو بمبئی کے سفر پر آمادہ کیا۔ چنانچہ 1981 میں حسن نعیم نے بمبئی کا رخ کیا۔ حسن نعیم نے دوستوں کے صلاح ومشورے سے ایک ڈراما اسٹیج کیا، جس میں شبانہ اعظمی نے بھی کام کیا تھا۔ لیکن اپنی ناتجربہ کاری کی وجہ سے یہ ڈراما کامیاب نہ ہوسکا اور بجائے منافع کے جو چار پانچ ہزار اپنے روپئے لگے تھے وہ بھی ڈوب گئے۔

پھر اس کے بعد احباب نے فلموں میں گانے لکھنے کے مواقع فراہم کیے۔ چند ایک فلموں کے لیے گانے بھی لکھے جو فلمائے نہ جاسکے۔ لیکن فلمی دنیا کی نزاکت حسن نعیم کی اَناپسندی کب برداشت کرسکتی تھی۔ ڈائرکٹر سے نہیں بن سکی اور اس مفلوک الحالی میں بھی اپنی کج کلاہی کو سر سے اتارنا گوارا نہ کیا۔ بقول مجروح:

سر پر ہوائے ظلم چلے سو جتن کے ساتھ
اپنی کلاہ کج ہے اسی بانکپن کے ساتھ

بقول نثار احمد فاروقی ''حسن نعیم ایک ہمہ وقتی شاعر تھے''24اور یہی حقیقت تھی کہ انھوں نے اپنی شاعری کے سامنے دنیا کی دیگر قدروں کو ہیچ سمجھا۔ ان کو اپنی شاعری سے دیوانگی کی حد تک پیار تھا۔ انھوں نے بڑے سے بڑا سرکاری عہدہ، گھر بار اور بیوی بچے سبھوں کو تیاگ کر خلوت نشینی اور گداگری کو اپنا شعار بنالیا۔ آخری وقت میں اپنی بیوی حشمت آرا بیگم سے حسن نعیم کے تعلقات کشیدہ ہوگئے تھے۔ تعلقات کیوں کشیدہ ہوئے تھے اس سے متعلق تفصیلات مجھے نہیں ملیں۔ عین ممکن ہے کہ حسن نعیم کی آزادہ روی حشمت آرا بیگم کی سکون پسند طبیعت میں خلل پیدا کرنے لگی ہو۔ دہلی چھوڑ کر حسن نعیم کے بمبئی چلے جانے کی ایک بڑی وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن حسن نعیم اپنی بیوی سے بچھڑ کر کبھی خوش نہیں رہے۔ بیوی کی یادیں اور وارداتیں حسن نعیم کو زندگی کی آخری سانس تک ستاتی رہیں:

یہ بھی تسلیم کہ تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے
تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

حسن نعیم کو جس قدر اپنی شاعری سے عشق تھا اور جیسے جیسے اونچے مناصب پر وہ فائز رہے، یہ ذرائع ان کی شاعری اور شہرت میں چار چاند لگا سکتے تھے لیکن حسن نعیم اس ذریعۂ شہرت کے مخالف رہے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے رہے کہ پہلے فن کار کے فن پر بحث کی جائے ان کے معائب اور محاسن اجاگر کیے جائیں اور پھر حق و انصاف کے ساتھ جس کا جو معیار ہو قائم کیا جائے۔ لیکن حسن نعیم کے کلام کا لوگوں نے خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا اور اس وجہ سے نظر انداز کر دیا کہ وہ ایک انا پرست انسان تھے۔ وہ سر محفل کسی کی بھی گرفت کر بیٹھتے تھے۔ اس بات سے کسی کو انکار نہیں کہ انھوں نے جو کچھ کہا حق کے سوا کچھ نہ کہا۔ لیکن یہ بات جانتے ہوئے کہ کسی فن کار کے فن کا صحیح معیار متعین کرنے میں فن کار سے اپنے ذاتی تعلقات کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ فن کار اور ناقد کے آپسی تعلقات کا، فن کے معیار متعین کرنے میں حائل ہونا سم قاتل سے کم نہیں۔ لیکن نہ جانے کیوں حسن نعیم کا فن ان کی انانیت کی زد میں آتا رہا۔ اس کے باوجود حسن نعیم کی غزلوں کی غنائیت اور معنویت دانشوران ادب کے ذہن کے تاروں

کو جھنجھوڑتی رہی اور انھیں اپنے ہم عصروں میں ایک منفرد لب و لہجے کا توانا شاعر تسلیم کیا گیا۔ ان کی غزل گوئی پر مطالعے کا باب جوں جوں کھلتا رہے گا اس کے محاسن روز افزوں منور ہوتے رہیں گے۔

بمبئی میں قیام کے دوران بھی حسن نعیم کو کوئی معقول روزگار نہ ملا۔ آخری وقت میں 'نیشنل غزل سینٹری' کے نام سے ایک بڑا ادارہ قائم کرنے میں مصروف ہوئے۔ اس ادارہ کے قائم کرنے کی غرض بتاتے ہوئے حسن نعیم لکھتے ہیں:

> ''اس ادارے کے ذریعے غزل کے سرمایے کو سلسلہ وار دوسری ہندوستانی زبانوں میں منتقل کرنے اور غزل گائیکی کو صحیح خطوط پر رواج دینے کا کام کیا جائے گا۔''25

لیکن فائنینشیل ذرائع نہ ہونے کی وجہ سے یہ کام کچھ دنوں تک چھوٹے پیمانے پر چلنے کے بعد بند ہوگیا۔ اپنے مسئلہ معاش کے لیے گاہے گاہے فلمی، علمی اور عملی بے گار بھی کی جس سے وقت بہ وقت کچھ مدد ملتی رہی۔ دوست احباب یہاں بھی کچھ کام نہ آسکے۔ لیکن اس کو کیا کیا جائے کہ جب اچھے دن ہوتے ہیں تو پرائے اپنے بن جاتے ہیں اور برے دنوں میں دانت کاٹی روٹی کھانے والے راستے کاٹ جاتے ہیں۔ البتہ کچھ ایسے دوست بھی تھے جنھوں نے حسن نعیم کی قدر کی اور حوصلہ بڑھایا۔ یہاں ظ انصاری، باقر مہدی، ندا فاضلی اور شمیم طارق سے بھی قربت رہی۔ لیکن سچائی یہی ہے کہ حسن نعیم کی زندگی بمبئی میں خانہ بدوشوں کی طرح گزرتی رہی۔ صبح کہیں، شام کہیں اور رات کہیں گزرتی رہی۔ 26

آخری وقت میں حسن نعیم، شہر بانو نام کی ایک مغنیہ کے یہاں بمبئی سے کافی دور دہسر ایسٹ کے علاقے میں رہنے لگے تھے۔ شہر بانو سے دوستانہ تعلقات دہلی سے ہی تھے، جب وہ 'ایوانِ غالب' میں ڈائرکٹر تھے۔ (بقول مخمور سعیدی) یہ حسن نعیم کی غزلوں کی مداح کی حیثیت سے لوگوں کے درمیان مشہور ہوئیں اور اپنی محفلوں میں بیشتر حسن نعیم کی غزلیں ہی گاتی تھیں۔ حسن نعیم کے مجموعہ کلام 'دبستان' کے دیباچہ میں 'ان کی یادیں' کے تحت شہر بانو لکھتی ہیں کہ:

> ''حسن نعیم صاحب میری پناہ میں آئے تو انھوں نے اپنا گھر بار پہلے ہی چھوڑ دیا تھا وہ میرے ساتھ رہنے لگے تو مجھے احساس ہوا کہ میرے گھر پڑوس اور

دنیا والے نہ تو یہ سوچیں گے کہ میں نے ایک عظیم شاعر کو پناہ دی ہے نہ ہی یہ خیال کریں گے کہ میں نے ایک پریشان حال شخص کو سر چھپانے کی جگہ دے کر ثواب کا کام کیا ہے۔ چنانچہ ہم نے نکاح کرلیا جس میں میرے گھر والے اور قریبی لوگ شریک ہوئے۔ میں حسن نعیم کی دوسری بیوی اور وہ میرے پہلے شوہر تھے۔ جن دنوں نکاح ہوا تھا مسلسل صدموں سے وہ بہت ٹوٹ چکے تھے اور اچھے دنوں کی یادوں کے علاوہ ان کے پاس کچھ نہیں رہ گیا تھا۔"

حسن نعیم کی وفات کے ڈیڑھ دو مہینے بعد مخمور سعیدی کا "جانے والوں کی یاد آتی ہے" کے تحت 'ایوان اردو، اپریل 1991' کے شمارے میں ایک مضمون شائع ہوا تھا اس مضمون میں موصوف نے لکھا تھا:

"گھر والوں سے (حسن نعیم نے) بگاڑ پیدا کرلیا اور کئی برس تک خانہ بدوشی کی زندگی گزاری۔ آخر میں وہ بمبئی کی شہر بانو صاحبہ کے ساتھ رہنے لگے تھے جو ایک مہاراشٹرین خاتون ہیں... محفلوں میں وہ زیادہ تر حسن نعیم کی غزلیں گاتی ہیں۔"

اس کے جواب میں شہر بانو صاحبہ کا 'ایوانِ اردو' کے مئی 1991 کے شمارے میں ایک خط شائع ہوا۔ شہر بانو صاحبہ لکھتی ہیں:

"حسن نعیم، آخر میں بمبئی کی شہر بانو صاحبہ کے ساتھ رہنے لگے تھے جو مہاراشٹرین خاتون ہیں۔" اس پر مجھے اعتراض ہے۔ کسی کے ساتھ رہنے اور بیوی کے ساتھ رہنے میں بڑا فرق ہے۔ حسن نعیم صاحب میرے شوہر تھے۔ بس اتنا بتانا چاہتی ہوں۔ مجھے مخمور سعیدی کے اس جملے سے کافی تکلیف پہنچی۔"

لیکن یہ انکشاف شہر بانو کی تحریروں سے ہوتا ہے اور بس۔ 27 تعجب ہے کہ حسن نعیم نے اپنے خودنوشت تذکرہ 'تذکرہ کاملان بہار' میں بھی اپنی دوسری شادی کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے جسے 1995 کے درمیان خدا بخش لائبریری نے شائع کیا ہے۔ اس تذکرہ میں حسن نعیم لکھتے ہیں:

''تیسرا مجموعہ جس میں تقریباً ڈیڑھ سو منتخب غزلیں ہیں' دبستان' کے نام سے
ترتیب پا چکا ہے۔ انشاء اللہ آیندہ دو تین مہینوں میں شائع ہو جائے گا۔''

ان باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ حسن نعیم نے یہ خودنوشت تذکرہ 'دبستان' کی اشاعت کے دوران ہی لکھا ہے۔ انھوں نے اپنی وفات سے ایک سال قبل یعنی 1990 میں 'دبستان' کا مسودہ کاتب کے حوالے کر دیا تھا۔ دوسری بات یہ کہ حسن نعیم اپنی وفات سے ایک ڈیڑھ سال قبل سے ہی شدید بیمار تھے۔ ایک اور قابل غور امر یہ ہے کہ 1987 میں مظفر حنفی نے حسن نعیم سے ایک طویل انٹرویو لیا تھا جو اسی سال بیسویں صدی مئی 1987 کے شمارے میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حسن نعیم نے اپنی ادبی زندگی کے علاوہ ذاتی زندگی پر بھی خاطر خواہ گفتگو کی ہے لیکن اس انٹرویو میں بھی شہر بانو سے متعلق کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ حسن نعیم کی اس دوسری شادی کا پیچیدہ سرا سلجھانے کے لیے میں نے حسن نعیم کے قریبی دوستوں اور رشتہ داروں کے علاوہ ان کی دختر شہیرہ نعیم سے بھی فون پر رابطہ کیا جو آخر وقت تک اپنے ابی سے ملنے بمبئی جایا کرتی تھی یا ان کے ابی خود جب تک چلنے پھرنے کے قابل تھے دہلی اپنے بچوں سے ملنے آیا کرتے تھے، انھوں نے بھی یہی جواب دیا کہ ایسی کوئی بات ہم لوگوں کے علم میں نہیں۔ علاوہ ازیں ان کے بہت قریب کے دوستوں ندا فاضلی، 28 شہباز حسین 29 اور مخمور سعیدی 30 کو بھی معلوم نہیں کہ حسن نعیم نے شہر بانو سے شادی کی تھی یا نہیں۔ ہاں احباب اتنی بات ضرور بتاتے ہیں کہ حسن نعیم سے شہر بانو کے ساتھ ہماری جب بھی ملاقات ہوئی انھوں نے شہر بانو کا ایک دوست کی حیثیت سے تعارف کرایا۔ ایک بات یہ بھی قابل غور ہے کہ حسن نعیم نے اپنی بیماری سے قبل ہی شادی کر لی تھی تو پھر بمبئی میں صبح کہیں اور شام کہیں کیوں گزرتی تھی؟ بہرحال حسن نعیم کی زندگی کا یہ باب اس قدر مبہم نہ رہ جاتا اگر ان کی خودنوشت سوانح جو 45 اوراق پر مشتمل تھی 'دبستان' کے ساتھ شائع ہو جاتی۔

اپنی زندگی کے آخری ایام میں حسن نعیم کو اپنے خاندانی صوفیانہ طرز روش سے لاتعلقی کا احساس شدت سے ہونے لگا تھا۔ وہ شخص جس نے صرف مذہب کی تعلیم حاصل کی تھی لیکن مذہب سے کوئی واسطہ نہ تھا آخر دنوں میں تصوف کے مطالعے میں غرق ہو گیا۔ انور ظہیر خان لکھتے ہیں:

"مگر نہ جانے کیابات تھی کہ جیون کے آخری سرے پر پہنچتے پہنچتے وہ تصوف
کے مطالعے میں کھو گئے۔ وہ گھنٹوں تصوف کے مدارج و منہاج پر بولتے
رہتے اور یہ بھی کہتے جاتے کہ میں صوفیا کے خانوادے سے ہوں۔"[31]

آخری وقت میں حسن نعیم کے رہنے سہنے کے طور طریقے بدل گئے تھے۔ مزاج میں تلخی کی جگہ نرمی نے لے لی تھی۔ لیکن حالات بد سے بدتر ہوتے گئے۔ وہ عارضۂ قلب میں مبتلا ہو گئے۔ اس وقت وہ بمبئی کی ایک تاریک کوٹھری میں ایک بوسیدہ بستر پر پڑے رہے۔ کوئی یار اور کوئی پرسان حال نہ تھا۔ ندا فاضلی اور شمیم طارق جیسے کچھ دوست اور عزیز، وقت بہ وقت ان کی عیادت کو پہنچ جایا کرتے تھے لیکن پیسے پاس نہ تھے کہ مستقل کوئی علاج ہو۔ دوست احباب کے سامنے ہاتھ پھیلانا انھیں قطعی گوارا نہ تھا۔ اپنے ہر غم کو اپنی ذات تک محدود رکھنے کے عادی ہو چکے تھے:

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی دردِ نہ جی کا لکھا

طبیعت جب زیادہ خراب ہو گئی تو شہر بانو نے بمبئی کے KEM اسپتال میں داخل کرادیا تھا لیکن حالات بجائے سدھرنے کے بگڑتے گئے۔ بالآخر 22 فروری 1991 کو بوقتِ شب اردو غزل کا ایک توانا شاعر داغِ مفارقت دے گیا۔ موت سے چند دنوں قبل کے احوال بیان کرتے ہوئے ندا فاضلی لکھتے ہیں:

"حسن نعیم کی موت ہمارے عہد کا ایک ادبی المیہ ہے۔ مرنے سے ایک ہفتہ
پہلے انھوں نے مجھے فون کیا تھا۔ وہ اس وقت بھی بیمار تھے۔ چلنے پھرنے سے
معذور تھے۔ لیکن فون پر اس مختصر سی گفتگو میں ان کی بیماری کا کوئی ذکر نہیں
تھا۔ وہ اپنی شاعری پر مجھ سے مضمون لکھوانا چاہتے تھے۔ فون کی غرض بھی
اس کی یاددہانی تھی۔ ان کی آواز میں لرزہ تھا اور سانس بھی ہر جملہ میں بار بار
ٹوٹ رہی تھی۔ میں نے جب ان کی طبیعت کے بارے میں پوچھا تو صرف
اتنا ہی کہا، تھوڑی سی کمزوری ہے، ٹھیک ہو جائے گی۔ ان کی حالت کا اندازہ
فون پر ان کی آواز سے ہو رہا تھا۔ میں پہلی بار دسمبر میں ان کا مکان تلاش

کرتا ہوا ان تک پہنچا۔ وہ ایک نیم تاریک چھوٹے سے کمرے میں میلے کچیلے بستر پر آنکھیں بند کیے سمٹے سمٹائے لیٹے تھے۔ مجھے دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ آواز میں کمزوری اور چہرہ پر سوجن تھی۔ وہ اخلاقاً کچھ دیر بستر پر بیٹھے اور پھر معذرت کرکے تکیہ پر سر ٹکا کر لیٹ گئے۔ آثار کچھ اچھے نہیں تھے۔ انھیں فوری طبی مدد کی ضرورت تھی۔ لیکن ان کے مالی حالات اس بار کو اٹھانے کے قابل نہیں تھے۔ میں نے اردو اکادمی کے اراکین سے اس کا ذکر کیا، انھوں نے ہمدردی بھی ظاہر کی، دو تین دن اس پر غور کرنے میں ضائع کیے اور آخر میں اکادمی کے قوانین نے اپنی مجبوری کا اظہار کرکے انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا۔ اکادمی کے اراکین سے ان کے لیے اس طرح مدد کی درخواست کرنا انھیں پسند نہیں تھا۔ اکادمی کے انکار سے انھیں شدید تکلیف ہوئی تھی۔ اسے انھوں نے اپنی ہتک تصور کیا۔ اور ذلت کی زندگی رینگنے کے بجائے عزت کی موت کے لیے تیز رفتار ہوگئے۔ میں ان دنوں چار پانچ دنوں بمبئی سے باہر رہا۔ واپسی پر میں انھیں اپنے طور پر ہوسپٹل میں داخل کرانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ لیکن وہ میرے لوٹنے سے پہلے ہی جسم کی سرحد کو پار کر چکے تھے۔"32

حسن نعیم نے اپنی زندگی میں بہت کم لکھا، اس معاملے میں ان کی شعوری سنجیدگی ہر جگہ حاوی رہی۔ جو لکھتے ان پر مہینوں اور برسوں غور کیا کرتے تھے۔ اردو فارسی اور انگریزی ادب پر اچھی نگاہ تھی۔ ہندی اور عربی سے بھی واقف تھے۔ اپنے ہمعصر شعرا، ناقدین اور احباب سے اردو، فارسی اور انگریزی ادب کے کسی نہ کسی پہلو پر اکثر مباحثے کرتے تھے۔ ان مباحثوں میں کسی سے مصالحت تو کسی سے منافرت ہوجاتی تھی۔ ان کی زندگی میں اور موت کے بعد مختلف زبانوں میں، اپنے اپنے طرز پر غزلوں کے انتخاب کے ساتھ چار مجموعۂ کلام شائع ہوئے۔ دو اردو میں، ایک ہندی میں اور ایک گجراتی میں۔

حسن نعیم کا پہلا مجموعہ کلام نومبر 1971 میں شالیمار پبلی کیشنز حیدر آباد سے محمود خاور نے 'اشعار' کے نام سے شائع کرایا۔ جس پر محمود ہاشمی، پروفیسر وہاب اشرفی اور خلیل الرحمٰن اعظمی

کے تبصرے شائع ہوتے رہے۔ اس کے بعد ان کی غزلوں کے انتخاب کا دوسرا مجموعہ ہندی میں 'غزل نامہ' کے نام سے اکتوبر 1980 میں نیشنل ادبی پریشد سے جناب مہاویر گپتا کے تعاون سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کی غزلوں پر شمس الرحمٰن فاروقی، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، راجندر سنگھ چندا بانی، زبیر رضوی اور ڈاکٹر کیدار ناتھ سنگھ وغیرہ نے اظہار خیال کیا۔ تیسرا مجموعہ کلام 'دبستان' کے نام سے شہر بانو نے آرٹ ہوم ممبئ سے حسن نعیم کی موت کے ایک سال بعد 1992 میں شائع کرایا۔ حسن نعیم نے اپنی زندگی میں ہی 'دبستان' ترتیب دے کر کاتب کے حوالے کر دیا تھا اور موت کے بعد شہر بانو نے ادھورا کام پورا کر دیا۔ 'دبستان' کے دیباچے میں شہر بانو کی اپنی عرض داشت کے علاوہ ڈاکٹر شمیم طارق کا ایک جامع مضمون بھی شامل ہے، جو 'دبستان' کے مقدمے کی حیثیت رکھتا ہے۔ علاوہ ازیں 'دبستان' کی غزلوں سے متعلق کالی داس گپتا رضا اور اصغر علی انجینئر کے تاثرات بھی شائع ہوئے ہیں۔ حسن نعیم کی غزلوں کا چوتھا اور آخری انتخاب کا گجراتی ایڈیشن 'اردو سخنور شریئی' کے نام سے ندا فاضلی اور کیلاش پنڈت نے 1994 میں شائع کیا۔ اس مجموعے میں ندا فاضلی اور کیلاش پنڈت کے طویل مقدمے بھی شامل ہیں۔ اس مجموعے کا ہندی ایڈیشن 'وانی پرکاشن' دہلی نے شائع کیا ہے۔

حسن نعیم دوسرے شعرا کی طرح کسی اکادمی یا سرکاری قسم کے اعزازات و اکرامات سے نوازے نہیں گئے۔ 6 مارچ 1991 کے روزنامہ 'قومی تنظیم' پٹنہ میں ایک اعلان پڑھنے کو ملا تھا کہ حسن نعیم کو 'بہار اردو اکادمی ایوارڈ' دیا جائے گا لیکن وہ بھی نہیں ملا۔[33] بہر حال کسی ادب یا ادیب کی شناخت اعزازات و اکرامات سے نہیں ہوتی۔ ادب بذات خود ایک آئینہ ہے جہاں ناقد فنکار کے چہرے کے خال و خط کا معائنہ کرتا ہے۔ عین تابش لکھتے ہیں:

> ''کسی اکادمی یا سرکاری قسم کے اعزازات و اکرامات کسی کی حیثیت میں
> اضافے کی سند نہیں بن سکتے کیوں کہ ایسا ہوتا تو بہادر شاہ ظفر کے استاد اور
> دربار کے رئیس الشعرا شیخ ابراہیم ذوق کے سامنے بیچارے اسد اللہ خاں کا
> توشہ سٹ چکا ہوتا۔''[34]

ان کے ہم عصروں میں بعض شعرا و ناقدین کو یہ شکایت رہی ہے کہ حسن نعیم کو اپنی برتری کا مبالغہ آمیز احساس تھا یا وہ اپنے نزدیک کسی اور ہم عصر شاعر کو تسلیم ہی نہیں کرتے تھے۔ لیکن

یہ بیانات کلی صداقت پر مبنی نہیں۔ جن لوگوں نے حسن نعیم کو قریب سے پرکھا ہے یا ان کی تحریروں کا غائر مطالعہ کیا ہے انھیں معلوم ہے کہ شاعری کے میدان میں اس کے آئیڈیل شاعر غالب، میر، درد، مومن اور بیدل تھے۔ اپنے ہم عصروں میں ناصر کاظمی، خورشید احمد جامی، خلیل الرحمٰن اعظمی، شہر یار، بانی، منیر نیازی، ابن انشا، شکیب جلالی، ظفر اقبال، ساقی فاروقی، مظہر امام، مظفر حنفی، شاذ تمکنت، مجروح اور جذبی وغیرہ کی غزلوں کو خوب سراہا ہے۔ 35 اور ہم عصر ناقدین میں پروفیسر محمد حسن، خورشید الاسلام، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، پروفیسر قمر رئیس، ڈاکٹر خلیق انجم، پروفیسر وہاب اشرفی، وحید اختر، پروفیسر نثار احمد فاروقی، شہباز حسین اور ظ انصاری کے علاوہ اوروں سے بھی کافی متاثر رہے ہیں۔ البتہ حسن نعیم اپنے دور کے ان ناقدین سے ہمیشہ نالاں رہے جو فن و تنقید کی گروہ بندی کر کے کچھ مخصوص فنکاروں کو اچھالتے رہے اور ان کے علاوہ کسی اور شاعر یا ادیب کے فن کو مڑ کر دیکھنے اور پرکھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔ حسن نعیم کے اس گلہ کی تصدیق خلیق انجم کے ان جملوں سے ہوتی ہے:

> ''انھیں (حسن نعیم کو) وہ ناقد نہیں مل سکے جو پرتھما کی منڈی میں آواز لگا کر ان کا مال بیچتے، لیکن اس کا فائدہ انھیں یہ ہوا کہ ادبی گروہ بندی سے اوپر اٹھ کر انھوں نے اردو شاعری میں وہ مقام حاصل کرلیا جو کسی بھی شاعر کے لیے قابل رشک ہوسکتا ہے۔ اس مقام کو حاصل کرنے میں انھیں برسوں جدو جہد کرنی پڑی۔ جو شاعر اردو کے کچھ ناقدین کے کندھوں پر سوار ہوکر آئے تھے وہ شاعر اور ان کے ناقد دونوں ہی وقت کی دھول میں روپوش ہوگئے۔ آج تاریخ کے اوراق میں ان کا نام کہیں نہیں۔'' 36

حسن نعیم نے آخری وقت میں ان ہم عصر ناقدوں کے گلے شکوے کو بھلا دیا تھا:

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قید انا
انتظار روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا

حسن نعیم کی شخصیت اور ذہنی تشکیل میں ان کی موروثی تعلیم کا بہت بڑا دخل ہے۔ تصوف ان کا بیک گراؤنڈ تھا۔ تصوف کے اندر جو انسان دوستی اور انسانی قدریں ہوتی ہیں وہ حسن نعیم میں بہ درجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔ سرکشی اور کج کلاہی ان کے یہاں مارکس اور تصوف کے راستہ

سے آئی۔ درگاہ مخدوم پر اگر چہ سجادہ نشینی کا شرف انھیں حاصل نہ ہوسکا اور اس کا انھیں دکھ بھی تھا لیکن وہ ہمیشہ وہاں جا کر تصوف کی تفہیم حاصل کرتے رہے۔ حسن نعیم کی اس تعلیم اور ذہنی تشکیل کو سمجھنے کے لیے ان کے اسلاف اور ان کی تعلیمات کا تجزیہ لازمی ہے۔

حسن نعیم ایک درمیانہ قد اور گوری گلابی رنگت کے خوبصورت آدمی تھے۔ چہرے مہرے سے خاندانی شرافت اور وجاہت ٹپکتی تھی۔ مہذب اور شائستہ، دیر آشنا، حق گوئی، بیباکی، کم گوئی مگر اپنے کو لیے دیے رہنے والے، دولت کی ناقدری اور گداگری یہ وہ صفات ہیں، جو انھیں اپنے اسلاف سے وراثت میں ملی تھیں اور جنھیں عمر کی اس آخری منزل تک جہاں وہ ایک اندھیرے اور چھوٹے سے کمرے میں بوسیدہ بستروں پر پڑے تھے، سنجوئے رکھا۔ بقول مفکر اسلام:

باپ کا علم نہ بیٹے کو اگر ازبر ہو
پھر پسر قابلِ میراثِ پدر کیوں کر ہو

حسن نعیم کا شجرۂ نسب جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا ہے ساتویں پشت میں پیر امام الدین سے، چودھویں، پندرھویں پشت میں مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحیٰی منیری سے اور پینتالیسویں پشت پر حضرت امام حسنؓ سے جا ملتا ہے۔ حسن نعیم کے دادا سید شاہ غلام قاسم پیر امام الدین کے سجادہ نشین تھے۔ اس کے بعد سید شاہ غلام قاسم کے چھوٹے بھائی سید شاہ محمد یوسف سجادہ نشیں ہوئے۔ پھر ان کے بعد حسن نعیم کے والد سید محمد نعیم سجادہ نشیں ہوئے۔ سید محمد نعیم کے بعد ان کے بڑے بھائی اور حسن نعیم کے بڑے چچا سید محمد ابراہیم سجادہ نشیں ہوئے اور ان کے خاندان میں سجادہ نشینی کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور درگاہ مخدوم ان کے خاندان کے دیگر وارثین سے آباد ہے۔ حسن نعیم اکثر و بیشتر اس درگاہ پر تعلیم کی غرض سے قیام کرتے تھے۔

ہندوستان میں حسن نعیم کے اس درگاہی خاندان کا سلسلہ حضرت مخدوم الملک کے پر دادا حضرت امام محمد تاج فقیہ سے شروع ہوتا ہے۔ حضرت تاج فقیہ، بختیار خلجی کے 1199 میں مشرقی ہندوستان پر فتح کے ساتھ دیار عرب سے آکر بہار کے قصبہ منیر شریف میں آباد ہوگئے۔ امام محمد تاج فقیہ کی تین اولادیں ہوئیں۔ شیخ محمد اسرائیل، شیخ محمد اسمٰعیل اور شیخ عبدالعزیز۔

امام محمد تاج فقیہ کے بڑے لڑکے شیخ محمد اسرائیل کے صاحبزادے شیخ یحییٰ منیری کے صاحب زادے مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری ہیں۔ امام محمد تاج فقیہ کے منجھلے لڑکے شیخ محمد اسمٰعیل کے چار صاحب زادے ہوئے۔ ان میں شیخ صلاح الدین سے سجادگی کی نسل آگے بڑھی اور ساتویں پشت پر شیخ فضل اللہ ابومحمد عرف محمد قاضن شطاری تھے، جن سے بہار میں سلسلۂ شطاریہ کی ترویج و اشاعت ہوئی۔ محمد قاضن شطاری کے عبداللہ شطار کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کے ساتھ بہار میں شطاریہ سلسلے کا آغاز ہوا۔ عبداللہ شطار پندرھویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں ہندوستان تشریف لائے تھے اور جنھوں نے مانڈو میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی۔ 37

شیخ محمد قاضن شطاری سے قبل اس شجرہ کے صوفیا 'فردوسیہ' کے نام سے جانے جاتے تھے اور قاضن شطاری سے 'شطاریہ' سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ شیخ محمد قاضن شطاری کی ساتویں پشت پر پیر امام الدین شطاری (وفات 1717) خلیفہ ہوئے، جن کا شجرہ قاضن شطاری کے داماد میر سید علی عرف منجھن شطاری سے چھٹی پشت پر جاملتا ہے۔ حسن نعیم کے دادا سید شاہ غلام قاسم شطاری، پیر امام الدین کے ہی سجادہ نشیں تھے جن کا شجرہ چھٹی پشت پر پیر امام الدین کے داماد سید شاہ ملا عبدالسمیع زاہدی سے جاملتا ہے اور ساتویں پشت پر پیر امام الدین سے۔ پیر امام الدین کی صاحب زادی بی بی فاطمہ سے سید شاہ ملا عبدالسمیع زاہدی کا نکاح ہوا تھا۔ اس طرح حسن نعیم کا شجرۂ نسب ان کے دادا سید شاہ محمد قاسم شطاری سے لے کر پیر سید امام الدین راجگیری، مخدوم الملک شیخ شرف الدین احمد منیری اور حضرت امام حسنؓ تک کی تفصیل کے لیے نقش ملاحظہ کیجیے۔ 38

حسن نعیم کا شجرۂ نسب اور درگہہ مخدوم پر سلسلۂ سجادگی

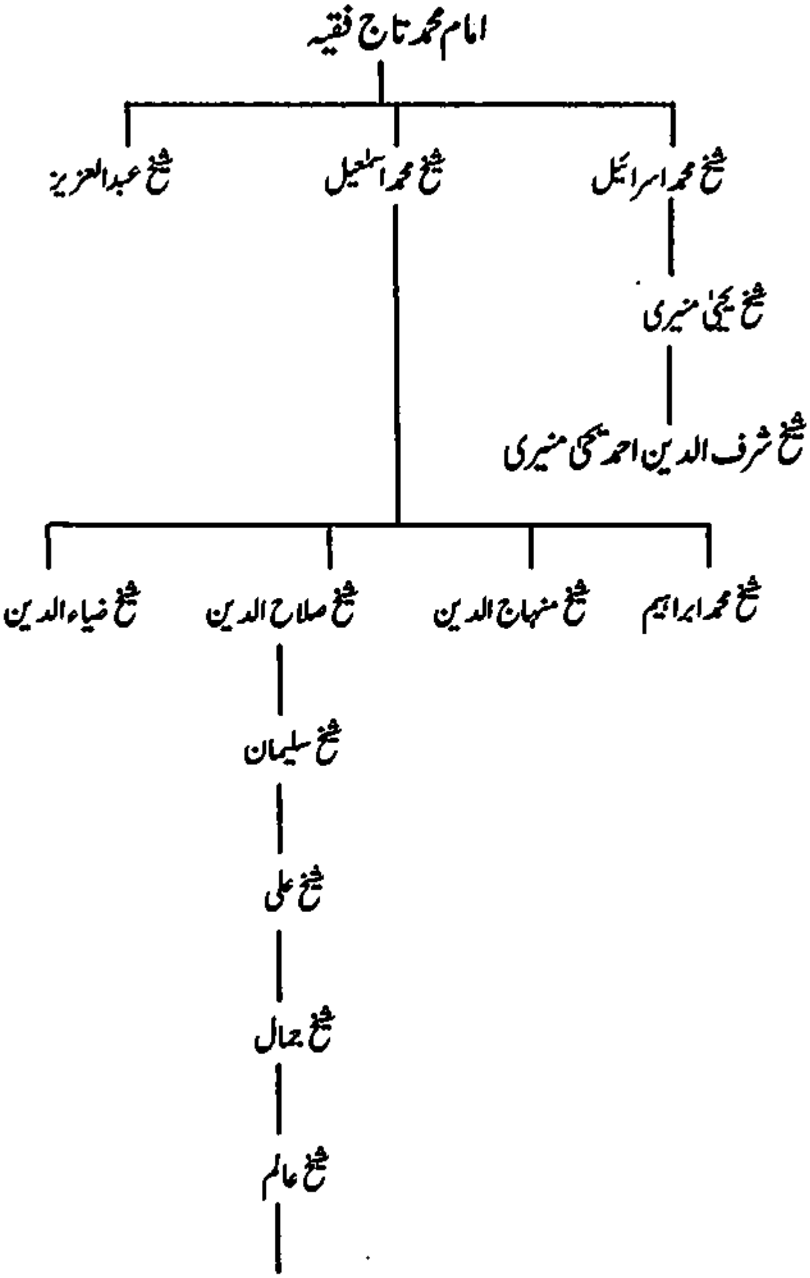

شیخ محمد علا

(سلسلۂ شطاریہ) شیخ فضل اللہ ابو محمد عرف قاضن شطاری

شیخ اویس | شیخ عبدالرحمٰن | ابوالفتح ہدیۃ اللہ سرمست

شیخ عبدالوہاب عرف رکن الدین

(داماد) جلیل اللہ عرف علاء الدین

شیخ عبدالباقی عرف شیخ قطب الدین محمود شطاری

(سجادہ نشیں) شیخ عبدالمومن عرف شیخ محی الدین | شیخ عبدالمہیمن عرف شیخ معین الدین شطاری

شیخ معین الدین عبدالباری عرف رکن الدین احمد

(سجادہ نشین) (برادر زادے) رکن الدین احمد شطاری

شیخ محمد شفیع شطاری (رکن الدین احمد شطاری کی صاحب زادی کے نواسے)

(خلیفہ) پیر امام الدین شطاری۔ (وفات (1717)

(صاحب زادی) بی بی فاطمہ

زوجہ

|

(داماد) ملا عبدالسمیع زاہدی

|

سید عبدالواحد

|

سید یار محمد عرف جمن

|

سید اشرف علی

|

سید شاہ احمد حسین

|

سید شاہ غلام قاسم (شیخ پوروی)

|

سید شاہ محمد نعیم

|

• سید شاہ حسن نعیم

نوٹ: (میر امام الدین، قاضی شطاری کے داماد میر سید علی عرف منجھن دانشمند کی اولاد میں چھٹی پشت سے تعلق رکھتے ہیں)

وضاحت: میر امام الدین بن میر سید تاج الدین ثالث بن سید محی الدین بن سراج الدین بن سید شہاب الدین بن سید علی منجھن دانشمند

سید قیام الدین نظامی قادری الفردوسی، نے اپنی کتاب 'شرفا کی نگری' میں پیر امام الدین سے لے کر حضرت امام حسنؓ تک کا شجرۂ نسب اس طرح نقل کیا ہے:

> "پیر سید امام الدین حسنی راجگیری، بن سید تاج الدین ثالث بن سید محی الدین بن سید سراج الدین بن سید شہاب الدین بن سید علی منجھن دانشمند بن سید محمد جیو دانشمند بن سید جگن بن سید عبداللہ بن سید احمد دانشمند بن سید محمود بن سید تاج الدین ثانی بن میر سید عماد الدین محمد حسنی البغدادی بن سید تاج الدین محمد بن سید محمد بن سید عزیز الدین حسین بن محمد القرشی بن سید ابو محمد بن علی مرتضٰی والی عراق بن رضی الدین بن علی بن حسین بن احمد بن محسن بن حسن بن ہسیر بن محمد بن حسین القوتی بن علی بن حسین بن علی بن حسن بن حسن الفتح بن اسمٰعیل الدیباج بن ابراہیم الغمری بن حسن المثنیٰ بن امام حسنؓ۔" 39

سید شاہ برہان الدین احمد نے اپنی تحقیق سے حسن نعیم سے لے کر پیر امام الدین تک کا جو شجرۂ نسب تیار کیا ہے وہ اس طرح ہے:

> "سید شاہ حسن نعیم ابن سید شاہ نعیم بن سید شاہ غلام قاسم بن شاہ احمد حسین بن شاہ اشرف علی بن شاہ یار محمد عرف میر جمن بن سید عبدالواحد بن بی بی فاطمہ (زوجہ ملّا عبدالسمیع زاہدی) بنت حضرت میر سید امام الدین راجگیری شطاری۔" 40

مندرجہ بالا تفصیلات سے واضح ہے کہ حسن نعیم کا تعلق صوفیا کے اس خانوادے سے ہے۔ انھوں نے سلسلۂ شطاریہ سے فیض حاصل کیا۔ سلسلۂ شطاریہ کیا ہے اور اس پر عمل پیرا ہونے والے کی بنیاد کیا ہوتی ہے اس کا بھی ایک مختصر مطالعہ کرتے چلیں۔

پیر امام الدین شطاری سترھویں صدی کے نصف آخر اور اٹھارھویں صدی کے اوائل میں شطاری سلسلے کے ایک ایسے بزرگ گزرے ہیں جنھوں نے سلسلۂ صوفیا میں کافی شہرت پائی، تصوف اسلام کی تاریخ میں سلسلۂ شطاریہ وہ واحد روحانی سلسلہ ہے جس کا نام روحانی خصوصیت کی وجہ سے رائج ہے۔ ورنہ تمام سلاسل کسی جگہ یا کسی روحانی پیشوا کے نام سے موسوم ہیں۔ پیر امام الدین نے شطاریہ عقیدے اور ان کے اوراد کو سمجھانے کے لیے کئی کتابیں

تصنیف کیں۔ اوراد سے متعلق ان کی ایک کتاب 'اوراد امام الدین راجگیری' ہے اور 'مناہج الشطار' سے ان کے عقیدے کی ذہنی وفطری تشکیل کا انکشاف ہوتا ہے۔ پیر امام الدین نے 'مناہج الشطار' میں 'شطاریہ' کی جو وجہ تسمیہ بتائی ہے وہ مفسرین کے مطابق ایک جامع اور مانع تعارف ہے: 41

> ''شطاریہ صیغہ مبالغہ شاطر است۔ الشطر بمعنی جانب وطرف آید۔ چوں طالب حق روئے ہمت از ہر سو گردانید متوجہ قبلۂ جمال الٰہی باشد شاطر شد۔ چوں فنا نفس و ہوا واماتت آں در ملاحظۂ توحید ذات وصفات وافعال الٰہی نمود وماسوی اللہ را عدم دید واصل حقیقی شد، شطار اطلاق یافت ولفظ شطار در رسالہ حضرت نجم الدین کبریٰ بالفاظ اخیار وابرار مذکورہ شدہ است۔ ایں ہمہ لفظ جمع اند۔ پس شطار ہم جمع شاطر بضم باشد۔ چنانچہ جہال وعقال وحکام کہ جمع جاہل وعاقل وحاکم بضم است، تا حسن مقابلہ اخیار وابرار باشد۔ دور طرح شطار بمعنی شطرنج باز وشتر تیز رو وکودک شوخ گفتہ ایں معنی دریں طایفہ یافتہ می شود کہ حق تعالیٰ مجاہدان فی اللہ کہ حق جہاد کہ معرفت ذات وصفات الٰہی حاصل نماید ووعدہ مشاہدہ رویت خود ایشاں را بعد مرگ طبعی در دار آخرت نمودہ کہ بقدر معرفت ایں جہان روایت ومشاہدۂ در آن جہان خواہش بخشید۔ چوں طایفہ موعودہ آخرت را بمرگ ارادی درین جہاں خواستند پس ہم شوخ وتیز رو وباز ندکا خودی نامیدہ شدند۔'' 42

(ترجمہ: 'شطار' شاطر کا صیغہ مبالغہ ہے۔ الشطر کے معنی جانب اور طرف کے ہوتے ہیں۔ جب طالب حق ہر طرف سے روگردانی کر کے جمال الٰہی کے قبلہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو شاطر ہو جاتا ہے۔ چوں کہ اس میں وہ فنا نفس و ہوا اور اماتت، ملاحظہ توحید اور ذات وصفات الٰہی سے دوچار ہوتا ہے اللہ کے سوا کسی کو نہیں دیکھتا اور واصل حقیقی ہوتا ہے۔ یوں شطار کا اطلاق اس پر ہونے لگتا ہے۔ لفظ شطار رسالہ حضرت نجم الدین کبریٰ میں اخیار اور ابرار کے ساتھ استعمال ہوا ہے۔ یہ تمام الفاظ جمع ہیں۔ چنانچہ شطار بھی جمع

ہوا۔ جیسا کہ جہال، عقال اور حکام۔ جاہل، عاقل اور حاکم کی جمع ہے۔ تاکہ ابرار و اخیار کے ساتھ حسن مقابلہ ہو سکے۔ شطار شطرنج باز، شتر تیز رو اور شوخ بچہ کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہ لفظ ان لوگوں کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے جو معرفت ذات اور صفات الٰہی کے لیے جہاد کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس کے ذریعے اللہ تعالیٰ انھیں بعد مرگ طبعی آخرت میں اپنے رویت اور مشاہدے سے نوازے گا۔ چوں کہ یہ لوگ آخرت مرگ ارادی سے اس جہاں میں حاصل کرتے ہیں۔ لہٰذا شوخ، تیز رو اور بازندۂ خودی کہلاتے ہیں)۔

'فردوسیہ' صوفیا کے سلسلے کی طرح 'شطاریہ' صوفیا بھی شاہانہ طمطراق کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہے۔ شاہ عبداللہ شطار کے سلطان غیاث الدین خلجی سے اچھے مراسم تھے۔ شیخ قاضن شطاری کے دربار میں سلطان حسین شاہ شرقی حاضر ہوا کرا تھا۔ فرخ سیر اپنے ایام شہزادگی میں کئی بار راجگیر آیا اور میر امام الدین سے ملاقاتیں کیں۔ مختصر یہ کہ ان صوفیائے کرام کی نسل اپنی شاہانہ طمطراق کے ساتھ آج بھی بہار کے اس قصبے راجگیر میں درگاہ مخدوم پر تصوف و عرفان کی شمع جلا رہی ہے۔

حسن نعیم اپنی معروفیت کے ہر سفر سے لوٹنے کے بعد درگاہ مخدوم پر حاضر ہو کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ لیکن حسن نعیم کے سامنے ایک طرف آشوب روزگار تھے اور دوسری طرف درویشی و گداگری۔ ایسے میں خود کو سنبھال نہ سکے۔ اپنے اسلاف کی تعلیمات تو یاد رہیں، لیکن بجائے خانقاہ کے اپنی جوانی کے بہترین ایام کو میخانوں کی نذر کر دیا۔ رندی و بیخودی ان کا مقدر بن گئی۔ دولت قدموں تلے جھکتی رہی، مناصب پاؤں چھوتے رہے، لیکن خود کسی کے سامنے جھکے نہیں۔ جو دولت جدھر سے آئی اُدھر کو ہی پانی کی طرح بہا دیا۔ ان کی یہ فطرت رندی و بیخودی میں بھی اپنے اسلاف کی تعلیمات کا ہی نتیجہ تھی۔ حسن نعیم کے ساتھ ایسے لمحے بھی آتے تھے جب انھیں اسلاف کے نقش قدم سے الگ اپنی بے راہ روی کا احساس ہوتا تھا:

یہ دکھ ہے کون بسائے گا درگہ مخدوم
نہ میں چراغ وراثت رہا نہ تو ہوگا

ایسے لمحوں میں وہ خواہ احباب ہوں یا اپنے اہل و عیال سبھوں کو بٹھا کر گھنٹوں تصوف و عرفان پر بحثیں شروع کر دیتے تھے۔ غرض رندی و بیخودی کے باوجود ان کے مزاج میں وہی ہوشیاری، حق گوئی، بیباکی، بے سروسامانی میں شاہانہ جاہ و جلال، فیاضی و دریادلی، یار باشی، اپنی خودی کی نگہبانی سب برقرار تھیں۔ یہ امر مسلم ہے کہ کسی انسان کی بنیادی تعلیم کے فطری اموراس انسان میں ہمیشہ کسی نہ کسی صورت میں برقرار ہوتے ہیں۔ چنانچہ حسن نعیم کی یہ آواز اور تیور:

یہ کوہساروں 43 کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے ہزار موج غبار لائے

حسن نعیم کی غزل گوئی ان کی اپنی ذاتی اور کائناتی زندگی کا نچوڑ ہے۔ ان کی شاعری میں ذات و کائنات کا ایک حسین امتزاج جلوہ گر ہے۔ ان کی شاعری کوئی مانگے کا اجالا نہیں۔ انھوں نے کسی کی شاعری پر شب خون نہیں مارے، جو کچھ کہا اپنا کہا۔ اپنے انداز اور اپنے لہجے میں کہا۔ انھوں نے ملک و بیرون ملک کے سفر سے بہت سارے تجربات حاصل کیے۔ عوام کے بیچ رہ کر زندگی کا گہری نظروں سے مشاہدہ کیا اور جو کچھ محسوس کیا اسے حقیقت کے رنگوں میں ڈھال دیا۔ ان کا مزاج حقیقت پسندانہ تھا۔ یہ ان لوگوں میں سے نہ تھے جو اندر کچھ اور باہر کچھ رکھتے ہوں۔ عظیم آباد کی ادبی محفلوں میں انھوں نے اپنے شعری ذہن کا خمیر تیار کیا۔ علی گڑھ میں ان کے ذہن کو ایک رخ عطا ہوا اور دہلی جہاں انھوں نے اپنا مسکن بنا لیا تھا یہاں کی تہذیب نے ان کی شاعری میں پختگی اور توانائی پیدا کی۔ دہلی کی زندگی پر ان کو بجا طور پر رشک تھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> "دہلی میں نہ صرف ہماری ادبی نشو و نما ہوئی بلکہ میری زندگی کے بہترین ایام یہیں بسر ہوئے۔ دہلی ہی دراصل وہ شہر ہے جس کی تہذیبی روایت سے آج کی غزلیں بھی سب سے زیادہ متاثر ہیں۔" 44

دہلی کی تہذیب حسن نعیم کی شاعری کا محور و مرکز تو ہے ہی ساتھ ہی ساتھ انھیں ملک کے شمال سے لے کر جنوب تک کی تہذیب کو قریب سے پرکھنے کے مواقع ملے۔ انھوں نے شاعرانہ شخصیت کی جاہ و جلال برقرار رکھنے کے لیے اپنی ہر دولت لٹا دی۔ پھر بھی پذیرائی کا جو

حق انھیں حاصل ہونا چاہیے تھے وہ نہ ہوسکا اور وہ بالآخر یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے:

اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا
پوچھنا دلی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

حسن نعیم نے غزلیں لکھیں، مثنویاں لکھیں، رباعی، قطعہ، قوالی اور شخصی مرثیے لکھے، تنقیدی مضامین لکھے جو برصغیر کے اردو ادبی رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔ 45ان کی پوری شخصیت پر کام کرنے والوں کے لیے یہاں روشن امکانات پوشیدہ ہیں۔

حواشی:

1. شجرۂ نسب کی وضاحت بعد کے صفحہ پر کی گئی ہے، ص 26
2. 'تذکرۂ کاملانِ بہار' حصہ اوّل، ص 237
3. راوی، مظہر امام
4. خودنوشت تذکرہ: حسن نعیم، 'تذکرۂ کاملانِ بہار' جلد اوّل، ص 237
5. بحوالہ 'پاپیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی'، احمد یوسف 'آہنگ' گیا، شمارہ 1، مارچ 1970
6. ان کا انتقال ہو چکا۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔
7. بحوالہ 'پاپیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی'، احمد یوسف 'آہنگ' گیا، شمارہ 1 مارچ 1970
8. توضیحی مطالعہ کے لیے 1960 سے 1963 کے درمیان ماہنامہ 'تلاش' کے شمارے دیکھے جاسکتے ہیں۔
9. 'حسن نعیم ایک ادبی المیہ'، ندا فاضلی ماہنامہ 'شاعر' جلد 62، 1991
10. شہیرہ نعیم کے بقول ابّی کو سعودیہ منتقل نہیں کیا گیا تھا۔ وہ نیو یارک سے دہلی واپس آگئے تھے اور یہیں سے انھوں نے استعفا نامہ دیا تھا۔ سعودیہ میں وہ اپنے احباب سے ملاقات کی غرض سے تشریف لے گئے تھے۔
11. 'باتیں حسن نعیم سے'، 'باتیں ادب کی'، مرتبہ: مظفر حنفی، ص 177
12. 'حسن نعیم: چند یادیں': شہباز حسین، ماہنامہ 'آجکل'، مئی 1991
13. ایضاً
14. 'باتیں حسن نعیم سے'، 'باتیں ادب کی'، مرتبہ: مظفر حنفی، ص 179
15. ایضاً
16. یہ منظوم خراجِ عقیدت ماہنامہ 'آجکل' کے مارچ 1977 کے شمارے میں 'مثنوی: فخر الدین علی احمد' کے عنوان سے شائع ہوئی ہے۔
17. راوی خورشید عالم، حالیہ اکاؤنٹنٹ آفیسر (ایوان غالب)، جن کی تقرری حسن نعیم کے وقت میں ہی ہوئی تھی۔

18. 'حسن نعیم: چند یادیں': شہباز حسین، ماہنامہ 'آجکل'، مئی 1991
19. ایضاً
20. 'باتیں حسن نعیم سے'، 'باتیں ادب کی' مرتبہ: مظفر حنفی، ص 73-172
21. ایضاً، ص 182
22. تفصیل صفحہ 17 پر
23. 'لامرکزیت کے شکار: حسن نعیم'، 'مت سہل ہمیں جانو'، انور ظہیر خان، ص 131
24. 'حسن نعیم: چند یادیں': شہباز حسین، ماہنامہ 'آجکل'، مئی 1991
25. خودنوشت تذکرہ، حسن نعیم مشمولہ 'تذکرۂ کاملانِ بہار'، جلد اوّل، ص 239
26. 'حسن نعیم ایک ادبی المیہ': ندا فاضلی، ماہنامہ 'شاعر'، جلد 62، 1991
27. شہر بانو صاحبہ حسن نعیم کی دوسری اہلیہ تھیں، اس کی تصدیق کتاب کی پہلی اشاعت تک کر پانے میں ناکام رہا تھا۔ لیکن اب اس سچائی کے اعتراف میں ہمیں کوئی تامل نہیں۔ مزید وضاحت کے لیے اس کتاب کے 'موصولہ خطوط' کے حصے میں محترمہ شہر بانو (مرحومہ) اور جناب شمیم طارق کے خطوط اور سند نکاح کا عکس دیکھیے۔
28. ندا فاضلی کا خط راقم الحروف کے نام
29. بحوالہ 'حسن نعیم: چند یادیں'، شہباز حسین، ماہنامہ 'آج کل'، مئی 1991
30. مخمور سعیدی سے ایک ملاقات، 15 نومبر 2000
31. لامرکزیت کے شکار حسن نعیم، مشمولہ 'مت سہل ہمیں جانو': انور ظہیر خان، ص 132
32. حسن نعیم ایک ادبی المیہ: ندا فاضلی، ماہنامہ 'شاعر'، جلد 62، 1991
33. تصدیق، فخر الدین عارفی (بہار اردو اکادمی، پٹنہ)
34. 'دانشوروں کی قحط میں حسن نعیم کی موت'، 'روزنامہ صدائے عام'، ممبئی 13 مارچ 1991
35. ملاحظہ کیجیے 'باتیں حسن نعیم سے'، 'باتیں ادب کی'، مرتبہ: مظفر حنفی، ص 201-196
36. ایک تاثر: ڈاکٹر خلیق انجم، 'غزل نامہ'، ص 12
37. سہ ماہی 'فکر و نظر' جنوری تا مارچ 1987 بعنوان 'سلسلۂ شطاریہ بہار میں'، ص 49

نوٹ: تاریخ میں سلسلۂ شطاریہ حضرت بایزید طیفور بسطامی (رحم) سے منسوب کیا جاتا ہے۔

38. نقش کے لیے معاون کتب و رسائل:

(i) 'سلسلۂ شطاریہ بہار میں': ڈاکٹر فضیل احمد قادری، سہ ماہی 'فکر و نظر' جنوری تا مارچ 1987

(ii) 'شطاری روایات کے جامع پیر امام الدین راجگیر ی': ڈاکٹر فضیل احمد قادری، سہ ماہی 'فکر ونظر' اپریل تا جون 1994

(iii) 'شرفا کی نگری'، حصہ اوّل، ص 22-304، سید قیام الدین نظامی قادری، پاکستان

(iv) 'مناہج الشطار' (مخطوطہ) پیر امام الدین راجگیر ی، خدا بخش لائبریری پٹنہ، ص 733

39. 'شرفا کی نگری' حصہ اوّل، ص 304 سید قیام الدین نظامی

40. سید شاہ برہان الدین احمد برادر سجادہ نشیں خانقاہ منیر شریف (حسن نعیم کے ساڑھو کے صاحبزادے)

41. 'سلسلۂ شطاریہ بہار میں' پروفیسر فضیل احمد قادری، سہ ماہی 'فکر ونظر' جنوری تا مارچ 1987

42. بحوالہ مناہج الشطار: میر امام الدین راجگیر ی، ص 33 (مخطوطہ، خدا بخش لائبریری، پٹنہ)

43. درگہ مخدوم بہار شریف میں بڑی درگاہ کہلاتا ہے اور راجگیر ایک قصبہ ہے جو کوہساروں کے دامن میں آباد ہے، جہاں شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری عبادت اور اوراد میں مستغرق ہوتے تھے۔

44. 'تذکرہ کاملان بہار' حصہ اوّل، ص 238

45. ایضاً، ص 239

نئی غزل، سمت و رفتار

'نئی غزل' سے مراد یہاں اس دور کی غزل گوئی ہے جس دور میں حسن نعیم کی غزلوں کو اعتبار حاصل ہوا۔ یہ وہ دور ہے جسے صحیح معنوں میں اردو غزل گوئی کی تجدید و احیا کا دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دور میں اردو غزل میں وہ کون سی انوکھی تبدیلیاں رونما ہوئیں جو اپنی سابقہ غزل گوئی سے یکسر نئی اور مختلف ہیں جن کی بنا پر اس دور کو ہم اردو غزل گوئی کی تجدید و احیا کا حقیقی دور تسلیم کرنے پر مجبور ہیں؟ اسی سوال کا جواب اس باب میں تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

ادب ہو یا سماج، یہاں کوئی بھی تبدیلی اچانک رونما نہیں ہو جاتی۔ اس کا وجود اور خمیر دھیرے دھیرے تیار ہوتا رہتا ہے اور پھر ایک وقت اور ماحول ایسا پیدا ہو جاتا ہے کہ برسوں سے چلی آ رہی تبدیلی ایک بڑی صورت میں نمایاں ہو جاتی ہے اور پھر وہ اپنے اسی وقت کے ساتھ جانی پہچانی جانے لگتی ہے۔

بیسویں صدی کے نصفِ آغاز میں اردو غزل میں جو رجحان نمایاں طور پر ہمارے سامنے آیا وہ اپنی سابقہ غزل گوئی کے تمام رجحانات اور تحریکات سے یکسر نیا اور مختلف تھا، جسے ہم غزل کی تازہ روایت یا 'نئی غزل' کے نام سے جانتے ہیں۔ یوں دیکھیے تو ہر دور کا ادب اپنے سابقہ ادب سے مختلف ہوتا ہے۔ ولی کی شاعری قلی قطب شاہ سے جدید ہے۔ میر کی شاعری

آرزو اور حاتم کی شاعری سے زیادہ جدید ہے۔ غالب و مومن کی شاعری میر سے کچھ زیادہ جدید ہے۔ وجہ یہ ہے کہ ہر دور کی شاعری کی بنیاد عصری آگہی پر ہوتی ہے۔ زمانہ اور ماحول ادب کو مکمل طور پر یا جزوی طور پر متاثر کرتا ہے اور فن کار انفرادی طور پر یا اجتماعی طور پر اپنے ماحول سے متاثر ہوتا ہے جس کی عکاسی اس کے فن میں براہ راست ہوتی ہے۔ ان خیالات کی روشنی میں ہم پہلے 'پس منظر' کے حوالے سے اردو غزل کی روایت، سابقہ غزل گوئی میں ان عوامل اور عناصر کی جستجو کریں گے جو 1950 کے بعد ابھرنے والی غزل کی تازہ روایت کی بنیادیں مستحکم کر رہے تھے۔ اس کے بعد ہم حسن نعیم کی معاصر غزل گوئی کے خد و خال پر 'پیش منظر' کے حوالے سے روشنی ڈالیں گے۔ جس سے ان کے عصر کی غزل گوئی میں ابھرنے والی وہ تبدیلیاں سامنے آئیں گی جس کے سبب اس دور کو اردو غزل گوئی کی تجدید و احیا کا حقیقی دور تصور کیا جاتا ہے۔

پس منظر

اردو ادب میں جدید شاعری کی ابتدا انیسویں صدی کے آخر سے مانی جاتی ہے۔ جب کہ سرسید، آزاد اور حالی کے ذریعے ادب میں جدت کی تحریک چھیڑی گئی تھی۔ 1857 میں صدیوں پرانی مغل حکومت ختم ہو گئی اور برٹش سامراج کو استحکام حاصل ہو گیا جس کی وجہ سے سماج مغربی اثرات سے بہت متاثر ہوا۔ سماج کے ساتھ ساتھ اردو زبان و ادب پر بھی مغرب کے بڑے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ اس دور میں سماج میں صنعتی اور مہاجنی تہذیب سر ابھارنے لگی جس کے ردعمل میں اہل فکر و بصیرت، روایتی تہذیب کو ایک بیماری تصور کرنے لگے اور اس کی تشخیص کر کے اس کا مداوا کرنا ان کے لیے عین لازم ہو گیا۔ اگرچہ 1857 کی جنگ آزادی ناکام رہی لیکن سماج کے اس مفکرین طبقہ میں یہ شعور ضرور پیدا ہو گیا کہ اپنے مستقبل کی ایک مثالی دنیا تعمیر کرنے کے لیے اپنے معاشرے میں اصلاحی تحریکیں پیدا کرنا لازمی ہوگا۔ چنانچہ سماج اور معاشرے کو ذلت اور پستی سے نکالنے کے لیے ان مفکرین نے جو لائحہ عمل تیار کیا وہ مجنوں گورکھپوری کے لفظوں میں کچھ اس طرح تھا:

> ''ہم کو نئی سرکار سے مصالحت کر کے، بلکہ ان کو اپنا سرپرست مان کر اس کی لائی ہوئی برکتوں سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ ان تحریکوں کا یہ نتیجہ ہوا کہ مغربی تعلیم و تہذیب

ہماری فکری اور عملی زندگی پر تیزی کے ساتھ اپنا اثر کرنے لگی۔"1

اس طرح سرسید نے سماجی اور معاشرتی حالات کو بدلنے کے لیے اصلاح کا بیڑا اپنے سر اٹھا لیا اور بہ قول ڈاکٹر بشیر بدر، "جس طرح وقت نے سرسید کو ڈھونڈ لیا تھا اسی طرح سرسید نے حالی کو تلاش کر لیا۔"2 سرسید کے رفقا میں حالی اور آزاد نے ادب میں نئے رجحانات کو قائم کرنے کے لیے بڑی کوششیں کیں۔ 1874 میں لاہور کی تحریک اسی سلسلے میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ لوگ نہ صرف غزل کو بلکہ پورے اردو ادب کو روایتی اور رسمی عناصر سے آزاد کروانا چاہتے تھے۔ غزل کے موضوعات میں خیالی دنیا سے الگ حقیقی واقعات کا عکس دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی کے نتیجے میں 1893 میں حالی نے 'مقدمۂ شعر و شاعری' لکھا اور شاعری کو حقیقت و اصلیت سے ہم کنار کرنے کا راستہ اس طرح دکھایا کہ:

"ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں"

سرسید اور حالی کی اس تحریک کا یہ اثر ہوا کہ لوگوں نے (ادبا و شعرا نے) زندگی کو قریب سے دیکھنا شروع کر دیا۔ ان کے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آیا کہ ہماری زندگی کی حقیقت کیا ہے؟ اور وہ کیسی ہونی چاہیے؛ 'مقدمۂ شعر و شاعری' کے نتیجے میں ہمارے ادبا و شعرا میں جو لہریں پیدا ہوئیں اسے اختر انصاری یوں رقم کرتے ہیں:

> "حالی کی تنقید کی بدولت غزل کے وہ عناصر جو خالص روایتی اور تقلیدی تھے اور جن کے باعث شعرائے وقت کا کلام اساتذۂ پیشین کی میمونہ نقالی بن کر رہ گیا تھا کھل کر سامنے آئے اور مروجہ شاعری میں ابتذال رکاکت، آورد، تصنع، مبالغہ اور اغراق اور صنعت طرازی اور قافیہ پیمائی کے جو طومار تھے ان کے خلاف عام بیزاری پیدا ہوگئی۔"3

ان کے ساتھ ساتھ حالی کی اس تحریک نے غزل میں جس چیز پر سختی سے پابندی عائد کی وہ عشق کی جذباتیت تھی جس کے نتیجے میں عشق کی ناکامی اور اس سے پیدا شدہ دیوانگی کی شدت شعر و ادب سے کافور ہونے لگی اور غزل کا عاشق ایک ہوش مند انسان کی شکل میں ظاہر ہوا۔ غم جاناں کی جگہ غم دوراں اہمیت کا حامل ہو گیا۔ اس طرح انسانی زندگی کی تلخیوں اور پیچیدگیوں کا شعور ابھرنا شروع ہوا۔ علامہ اقبال اور حسرت موہانی کی غزلیں انھی نظریات و احساسات کی بہترین مثالیں پیش کرتی ہیں۔

اس کے بعد اردو ادب میں جدت کا ایک اور انقلاب آیا۔ جسے ہم 'ترقی پسند تحریک' کے نام سے جانتے ہیں۔ اس تحریک کی بنیاد 1917 میں کارل مارکس کے نظریات سے متاثر ہوکر روس کے انقلاب سے پڑتی ہے، جس نے زار کی ظالم حکومت کا خاتمہ کردیا تھا۔ اس وقت ہندوستان کی صورت حال بھی روسی حکومت کی طرح تھی۔ ہندوستان انگریزوں کے ہاتھوں غلامی کی زنجیر میں جکڑا ہوا تھا۔ روس کے اس انقلاب نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے راستے دکھائے۔ چنانچہ عوام کو غلامی سے نجات دلانے اور سرمایہ داروں کے ظلم واستحصال سے غریب مظلوموں کو بچانے کے لیے روسی عوام کی طرح ہندوستانی عوام کو بھی ایک انقلابی راہ کی تلاش تھی۔ 1917 کے روسی انقلاب سے مزدوروں اور کسانوں کی فتح کی گونج ساری دنیا میں سنائی دی۔ اب لوگوں کو یقین ہوگیا کہ مظلوم عوام، جن کی تعداد انگنت ہے، اگر متحد ہوکر اٹھ کھڑے ہوں تو مٹھی بھر ظالم ان کے سامنے ٹِک نہیں سکتے۔ شاعر و ادیب جو اپنے سینے میں دردمند دل رکھتے ہیں۔ اس روسی انقلاب کا اثر ان کے اوپر شدید پڑا۔ ان کو احساس ہوا کہ ہم اپنے ادب کے ذریعے عوام پر ڈھائے جانے والے ظلم کے خلاف آواز بلند کرسکتے ہیں۔ چنانچہ مغربی ممالک میں تعلیم پانے والے ہمارے ملک کے کچھ نمائندہ نوجوانوں نے یہ بیڑا اپنے سر اٹھایا جس کی پیشوائی سجاد ظہیر کررہے تھے۔ لندن میں اپنی تعلیم پوری کرنے کے بعد سجاد ظہیر، ملک راج آنند، جیوتی گھوش اور محمد دین تاثیر وغیرہ ادبا جب اپنے ملک واپس لوٹے تو 1936 میں باضابطہ طور پر 'انجمن ترقی پسند مصنفین' کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں کیا اور یہ طے کیا گیا کہ ہم ہندوستانی شاعر اور ادیب اپنے ملک کی طبقاتی کشمکش میں حصہ لیں گے اور مظلوموں کی حمایت کریں گے۔ نسلی تعصب، فرقہ پرستی، غلامی اور انسانی استحصال کے خلاف آواز اٹھائیں گے۔ یہ رجحان ملک کی موجودہ صورت حال کے عین موافق تھا، اس لیے اس تحریک کو کافی فروغ ہوا۔ ادب کے لیے یہ پیمانہ طے ہوا کہ حسن کاری سے زیادہ مواد اور موضوع پر زور دیا جائے۔ اپنی بات عوام کی زبان میں کہی جائے، ابہام اور پیچیدگی سے گریز کیا جائے۔ یہ بھی کہا گیا کہ ادیب چوں کہ سماج کا ہی فرد ہوتا ہے اس لیے وہ سماج کی سماجی، معاشی اور معاشرتی ضرورتوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا۔ اس طرح ادب کی مقصدیت پر زور دیا گیا۔ اس تحریک سے ادب میں یہ فائدہ ہوا کہ اس کے اندر حقیقت نگاری کا فروغ ہونے لگا۔ ادب عوام کی امنگوں کا ترجمان ہوگیا۔ اس کے اندر موضوعات کا دائرہ وسیع

ہو گیا اور ادب صرف شہرت حاصل کرنے اور وقت گزارنے کا ذریعہ نہیں بلکہ زندگی سنوارنے اور بہتر بنانے کا وسیلہ بن گیا۔ شروع شروع میں اس تحریک نے صنف غزل کی مخالفت کی۔ کیوں کہ ان کا ماننا تھا کہ غزل میں پیغام کی گنجائش کم نظر آتی ہے۔ لیکن کچھ باشعور فن کاروں نے اپنی غزل گوئی سے یہ ثابت کر دیا کہ غزل زمانے کے ہر تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتی ہے۔ چنانچہ مجروح، مجاز، مخدوم، پرویز شاہدی، جذبی، فیض، تاباں اور جاں نثار اختر وغیرہ کی غزلوں میں ایسی آوازیں بخوبی پہچانی جا سکتی ہیں۔ ذیل کے نمونے ملاحظہ کیجیے:

در قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

(فیض)

ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک یہ ستم کی سیاہ رات چلے

(مجروح)

دل دھڑک اٹھتا ہے اپنی ہی ہر اک آہٹ پر
اب قدم منزل جاناں سے بہت دور نہیں

(مجاز)

اب کہاں میں ڈھونڈنے جاؤں سکوں کو اے خدا
ان زمینوں میں نہیں ان آسمانوں میں نہیں

(جذبی)

ادھر تو دیکھو خزاں کا وہ دور ختم ہوا
چمن چمن ہے بہاروں کا شوخ نظارہ

(تاباں)

میں نے دیکھا ہے ترے حسن خود آگاہ کا رعب
اجنبی نظروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا

(پرویز شاہدی)

جو آنسوؤں میں کبھی رات بھیگ جاتی ہے
بہت قریب وہ آواز پا لگے ہے مجھے

(جاں نثار اختر)

'نئی غزل' گوئی میں جو رجحانات قائم ہیں اور جس طور پر اس دور کے ادبا وشعرا ذاتی طرز اظہار کے حامی ہیں اس کے پیش نظر ان کا سلسلہ 'حلقۂ ارباب ذوق' سے بھی جوڑا جاتا ہے۔ حلقۂ ارباب ذوق بھی انفرادیت کے پکے حامی تھے۔ انھیں ترقی پسند تحریک کے بندھے ٹکے نظریات سے سخت مخالفت تھی۔ حلقہ والے بھی زندگی کو کلّی حیثیت سے دیکھنے کے حامی تھے۔ حلقۂ ارباب ذوق کی جو پہلی آواز سنائی دیتی ہے اس میں اس بات کی طرف زور ہے کہ ادبا وشعرا خود کو مقررہ ہیئت اور اسالیب بیان میں محصور رکھنے کی بجائے نئی ہیئت اور نئے اسالیب بیان کے تجربے پر زور دیں۔ اچھی شاعری اسے مانی جانی چاہیے جس میں اپنے ماحول سے آشنا ہوتے ہوئے اپنے اندر ہمہ گیر اثرات کو داخل کرنے کی صلاحیت ہو۔ غزل بطور صنف ادب ہماری نظروں میں بڑی وقعت رکھتی ہے۔ لیکن اس میں اتنی لچک موجود ہونی چاہیے کہ وہ وقت کے تاثرات کو قبول کرتے ہوئے صحیح رنگوں میں ڈھلتی جائے۔4

الطاف گوہر، ن م راشد اور میراجی حلقۂ ارباب ذوق کے نہایت سرگرم رکن رہے ہیں۔ ان حضرات کا ماننا تھا کہ فن کار کی انفرادیت کا تحفظ بنیادی مسئلہ ہے۔ باقی تمام دوسرے مسائل اس اہم مسئلے سے منسلک ہیں۔ حلقہ کے لوگوں نے فرائڈ کی نفسیاتی توضیح وتعبیر شدید طور پر قبول کیا۔ فرائڈ کا یہ ماننا کہ اس کائنات میں چاروں طرف نفسیاتی بے اعتدالی نظر آتی ہے جو سماج میں مرض کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ اس کے پیش نظر فرائڈ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگر افراد کی زندگی میں جبلت کی تہذیب وتنظیم ہو جائے تو بہتر معاشرہ اور بہتر سماج کی امیدیں کی جاسکتی ہیں۔ میراجی ایک جگہ لکھتے ہیں:

"لیکن ہم زندگی کی وسعت کو بھول کر وقت کے خط میں سے ایک نقطہ لے کر جزو کو کل سمجھ کر بیٹھیں گے تو کنویں کے مینڈک بن کر رہ جائیں گے۔ اس کے برعکس اگر ترقی پسندی کے صحیح مفہوم کو مشعل بناتے ہوئے ہم خیال افروزی کو مدنظر رکھیں گے تو وہ زندگی کے کسی شعبے سے تعلق رکھتی ہو تو وہی

اور جسمانی دوڑ میں ہماری پسماندگی کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ
نظم ونثر دونوں اصناف کے متعلق حلقہ ارباب ذوق کا نقطہ نظر یہی رہا ہے۔''[5]

ان بیانات پر غور کیا جائے تو پتا چلے گا کہ حلقہ ارباب ذوق نے 'نئی غزل' گوئی کے لیے راستے اور نظریے تو بہترین ہموار کر دیے لیکن عملی طور پر غزل کے باب میں نمونے کے لیے حلقہ کی کوئی پیش قدمی سامنے نہ آسکی۔ حلقہ ارباب ذوق نے بہترین افسانے اور بہترین نظمیں تو ضرور لکھیں لیکن غزل جمود کا ہی شکار رہی۔ میرا جی، ن م راشد، قیوم نظر اور ضیا جالندھری وغیرہ شعرا نے غزلیں اچھی خاصی تعداد میں لکھیں۔ لیکن ان میں کوئی ندرت اور انوکھا پن ایسا نہیں جو مثال کے طور پر پیش کی جاسکیں۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ نظریات کے مطالعے نے 'نئی غزل' کی راہیں ضرور روشن کیں۔

علی گڑھ تحریک، ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے الگ اردو غزل میں کچھ ایسی آوازیں وجود میں آئیں جو اپنا خالص غزل کا مزاج لے کر ابھریں۔ ان کی آوازیں کسی ازم، تحریک یا تنظیم کے بندھے ٹکے اصولوں پر قائم نہیں۔ لیکن یہ غزلیں اپنی روایات سے نئی ہیں۔ ان کے غور وفکر کرنے کا انداز بالکل جداگانہ ہے۔ جن میں شاد عظیم آبادی، ریاض خیرآبادی، اصغر گونڈوی، فانی بدایونی اور حسرت موہانی وغیرہ شعرا کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ ان شعرا نے جدت کا سبق اپنے زمانے اور ماحول سے لیا اور تحریک وقت کے بنائے اصولوں میں کبھی بھی اپنے آپ کو محصور ہونے نہ دیا۔ یگانہ چنگیزی، جگر مرادآبادی، فراق گورکھپوری، شاد عارفی جیسے شعرا بھی تھے جنھوں نے ترقی پسندی سے الگ اردو غزل گوئی کو ایک نیا اعتبار عطا کیا۔ اس دور میں جدید علوم کا عروج ہوا۔ زبردست سائنسی ترقی نے زندگی کے ہر شعبے کو متاثر کیا۔ اس کی وجہ سے ادب میں بھی سائنسی نقطۂ نظر پیدا ہو گیا۔ زندگی کی تلخ حقیقتیں سامنے آنے لگیں اور دھیرے دھیرے جھوٹ اور مبالغہ آرائی ختم ہونے لگی۔ مختلف زبانوں کے تراجم سے ادب میں وسعتیں پیدا ہونے لگیں جن سے غزل کے انداز بیان اور مضمون میں وسعتیں پیدا ہوئیں۔ یہی وجہ ہے کہ غزل پر سخت سے سخت اعتراضات کے باوجود اس کا شجر اور سایہ دار ہوتا گیا۔

مذکورہ بالا شعرا میں یگانہ، جگر، اصغر، فانی، شاد عارفی اور فراق کو نئی غزل کا پیش رو کہا جاتا ہے لیکن حقیقت میں دیکھا جائے تو ان میں سے کسی نے بھی غزل کے روایتی ڈھانچے میں

تبدیلی پیدا نہیں کی۔ لفظی اور معنوی سطح پر بھی جس قدر ندرت آنی چاہیے تھی، نہ آسکی۔ بس اتنا ہوا کہ کچھ نئے خیالات کو اپنے نئے ڈھنگ سے پیش کرنے کی کامیاب کوششیں کیں۔ غرض 1950 سے قبل کی غزلوں پر روایتی غزلوں کی طرح نصب العین، مسلک اور نظریے کا غلبہ دکھائی دیتا ہے اور اسی غلبے کے تحت 1950 سے قبل کی غزل کوئی اخلاقی، فلسفہ، رومانی اور انقلابی وغیرہ کے خانوں میں بانٹی جاتی ہے۔ مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> ''یقیناً یہ شعرا (فانی، حسرت، اصغر، جگر) میر، سودا، مصحفی اور آتش وغیرہ کی کلاسیکیت کو بیسویں صدی میں دوبارہ زندہ اور متحرک کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ہر چند کہ ہمارے بیشتر نقادوں نے ان کے دور کو غزل کی تجدید واحیا کا دور قرار دے کر انھیں اپنے عہد کی غزل کے چار ستونوں کی حیثیت دی ہے لیکن حق تو یہ ہے کہ ان کی مجموعی کاوشوں کو بھی جاں بلب بیمار کے سنبھالے سے زیادہ اہمیت نہ دینی چاہیے۔''[16]

بہر حال اس دور کی شاعری میں اپنی روایت سے آگے اتنی ندرت تو ضرور آئی کہ اس دور کے شعرا نے پہلی بار عشق کو ارضی سطح پر لا کھڑا کر دیا۔ روایت کی طرح ماورائی اور خیالی محبوب کا تصور جاتا رہا۔ گویا اس دور میں شعرا نے محبوب کو کلی وجود عطا کر دیا اور عشق اشارات و کنایات کے دبیز پردے میں نہ رہا اور اس کا براہِ راست بیان ہونے لگا۔ سیاسی اور سماجی زندگی کے عکس بھی غزلوں میں ابھرنے لگے۔ اس کے باوجود غزل کا دائرہ محدود ہی رہا۔ ہیئت میں کوئی تبدیلی نہ آسکی۔ رموز و علائم میں بھی وہی گل و بلبل اور صیاد و آشیانہ کے روایتی ڈھانچے برقرار رہے۔ البتہ اقبال کے یہاں غزل کو نیا رنگ و آہنگ دینے اور اس کے رموز و علائم میں تبدیلی پیدا کرنے کی کی کامیاب کوششیں اس دور سے قبل ہی دکھائی دیتی ہیں۔ ورنہ اس دور کے تمام شعرا وہی حسن و عاشق کے روایتی مضامین اور اس کے متعلقات پر اپنا زیادہ زور صرف کرتے نظر آتے ہیں۔ سوز و گداز، داخلیت اور نزاکت اس درجہ حاوی نظر آتی ہے جس میں زندگی کے دیگر اہم موضوعات کا در آنا ناممکن سا لگتا ہے۔ ان روایتی غزلوں کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر احتشام حسین لکھتے ہیں:

> ''ان کے عصری تقاضے بھی الگ ہوتے ہیں۔ اور وہ جدت اور ایجاد کی

خواہش بھی رکھتے ہیں اور کوشش بھی کرتے ہیں۔اس کے باوجود ان کی غزل
عصری مسائل اور سیاسی وسماجی حالات سے میل نہیں کھاتی۔"[2]

پھر بھی غزل کی اس ہیئت، مواد اور علائم کی دبی دبی آوازوں میں کچھ جزئیات ایسے پوشیدہ تھے جس سے نئی اردو غزل نے اپنی بنیادیں استوار کیں۔اور ان حوالوں سے یگانہ، جگر، اصغر، حسرت، فانی، شاد عارفی اور فراق جیسے شعرا کو 'نئی غزل' کا پیش رو تصور کیا جاسکتا ہے۔ ان سبھوں نے اپنی غزلوں میں اپنی اپنی انفرادیت کو استقلال بخشا۔ پرانے بہت سے فرسودہ ڈھانچے کو ان شعرا نے ڈھایا۔ جو غزل کل تک محض خانقاہوں، درباروں اور بازاروں کی رونق سمجھی جاتی تھی اسے زندہ دل، سوشل، حاضر دماغ اور گھریلو بنا کر ہماری حقیقی زندگی کے سماج اور معاشرے میں بٹھا دیا۔جس کے نتیجے میں اس کے اندر زندگی کی حقیقتیں ابھر کر آنے لگیں۔ سچائی، بے باکی، شوخی، تیکھاپن جیسی انسانی فطرتیں اپنے اصل رنگ میں دکھائی دینے لگیں۔ پروفیسر احتشام حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی اور ڈاکٹر مظفر حنفی وغیرہ ناقدین نے 'نئی غزل' پر اظہار خیال کرتے ہوئے اس بات کو تسلیم کیا ہے کہ مذکورہ شعرا نے خیالات، لہجے اور اسلوب کے لحاظ سے 'نئی غزل' کی بنیادیں ڈالیں۔ان شعرا نے 'نئی غزل' کی راہیں ہموار کرنے میں اپنے شعور و ادراک کو جہاں تک بروئے کار لایا ان رنگوں کو پہچاننے کے لیے ذیل کے اشعار دیکھے جاسکتے ہیں:

الٹی تھی مت زمانۂ مردہ پرست کی
میں ایک ہوشیار کہ زندہ ہی گڑ گیا

(یگانہ چنگیزی)

بہلانہ دل نہ تیرگی شام غم گئی
یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

(فانی بدایونی)

اس درجہ دل پذیر ہے آہنگ نغمہ کیوں
پنہاں لباسِ دور میں تیری صدا ہے کیا

(حسرت موہانی)

جھٹک کے ہاتھ کو دامن سے، جانے والے سن
ترے خیال کا دامن بھی چھوڑتا ہوں میں

(شاد عارفی)

یہاں کوتاہیٔ ذوقِ عمل ہے خود گرفتاری
جہاں بازو سمٹتے ہیں وہیں صیاد ہوتا ہے

(اصغر گونڈوی)

تجھے بھول جانا تو ہے غیر ممکن
مگر بھول جانے کو جی چاہتا ہے

(جگر مرادآبادی)

ان شعرا کی غزلوں کے چنندہ اشعار سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آتی ہے کہ کس طرح 1950 کے بعد ابھرنے والی غزل کی تازہ روایت 'نئی غزل' کی بنیادیں استوار ہو رہی تھیں۔ یہاں عشق کے فریب وستم کے خلاف احتجاج کی دبی دبی آوازیں، سماجی اور سیاسی مسائل کا دامن تھام لینے کی کوشش، اپنی بیزاری اور تنہائی کا وہ ردِعمل جسے شعرا کھل کر کہنا چاہتے ہیں، لیکن روایتی ہیئت اور رموز وعلائم میں ان کی آوازیں گھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں اور پھر زندگی کا بکھراؤ، پریشانیاں اور الجھنیں یہیں تک محدود نہیں رہیں۔ زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ اور بڑھتی گئیں اور شعرا کا روایتی پیرائے میں اپنے جذبات واحساسات کے اظہار کے لیے دم گھٹنے لگا۔ اسی ردِعمل میں بیسویں صدی کے نصف آغاز میں اردو شاعری وغزل گوئی نے ایک نئی کروٹ لی اور پھر جو غزلیں لکھی گئیں اسے 'نئی غزل' کا نام دیا گیا۔ یہی وہ 'نئی غزل' ہے جس میں شدید جدوجہد اور مسلسل تخلیقی تجربات کے سہارے اپنے آپ کو روایتی غزلوں سے آزاد کرانے میں کامیابی حاصل کی اور اسے ہی حقیقی معنوں میں غزل کی تجدید واحیا کا حقیقی دور تصور کیا جانا چاہیے۔ 'نئی غزل' کے اس ردِعمل اور تخلیقی تجربات کا مطالعہ آیئے ہم ذیل میں 'پیش منظر' کے حوالے سے کرتے ہیں۔

پیش منظر

آزادی کے بعد ترقی پسند تحریک اپنا دم توڑنے لگی، اور جدیدیت کا بول بالا شروع ہوا۔

جدیدیوں نے ترقی پسندی کی نظریاتی سطح پر مخالفت تو کی ہی ساتھ ہی ساتھ روایتی ادب کے بندھے ٹکے موضوعات کی بھی کھل کر مخالفت کی۔ روایتی علامتیں اور لفظیات کو بھی اپنے نئے طرز اظہار کے لیے فرسودہ تصور کیا، جس کے نتیجے میں بعض شعرا نے ٹھوکریں بھی کھائیں۔ بہر حال میری بحث یہاں غزل کے اس رجحان سے ہے جس کا تیور ترقی پسندی، جدیدیت اور کچھ حد تک روایت سے بھی باغیانہ مگر وابستہ تھا۔ ان میں نہ تو نظریاتی وابستگی تھی اور نہ ہی جدیدیوں کی طرح کلاسیکی ادب، یعنی اپنی بنیاد سے یکسر روتابی۔ غزل کے اس نئے رجحان نے اپنی روایتی غزلوں کے طے شدہ مضامین کی مخالفت کی۔ روایتی رموز و علائم اور لفظیات پر اکتفا نہ کر کے اس میں اپنی تخلیقی ہنرمندی سے وسعت پیدا کی اور اس طرح اردو غزل کو ایک نئی اور کھلی فضا میں سانس لینے کے قابل بنا دیا اور اس کی تنگ دامانی کے شکوے کو بہت حد تک دور کر دیا۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کے مثبت عناصر پر مبنی اسی درمیانی رجحان کو ادب میں غزل کی تازہ روایت 'نئی غزل' کے نام سے جانا گیا۔ اس رجحان کے غزل گو شعرا نے اپنی بیشتر سابقہ روایتی زنجیروں کو کاٹ پھینکا اور کھلی فضا میں سانس لینے لگے۔ ان شعرا نے اپنے داخلی احساس کو اپنا رہنما بنایا۔ اپنی آزادانہ سوچ کو پروان چڑھایا اور اپنے دل پر گزری ہوئی کیفیت کو اپنے طور پر پیش کرنے کا ہنر پیدا کیا۔ زندگی کی محرومیوں، ناکامیوں، مایوسیوں، اور کبھی کبھار حاصل ہونے والی چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو اپنی شاعری کا موضوع بنانا شروع کر دیا جن سے ان کے شعروں میں داخلی تجربات اور محسوسات رچ بس گئے۔ 'نئی غزل' کے شعرا نے اپنے جذبات و احساسات کے اظہار کے لیے روایتی غزل کے ہیئتی عناصر، رموز و علائم اور لفظیات کے نئے تلازمے سے فن غزل میں ایک ایسی وسیع فضا قائم کی جہاں ان کے اپنے آزادانہ اظہار کے لیے کھلی فضا تیار ہونے لگی۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی اس تازہ روایت کو اردو شعروادب میں ایک خوش گوار تبدیلی کا پیش خیمہ تصور کیا جاتا ہے۔

اردو غزل میں اس نئی تبدیلی کے وجود میں آنے کے کئی اسباب تھے۔ اوّل تو ترقی پسندوں نے جس اجتماعی شعور کا خواب دیکھا تھا وہ آزادی کے بعد شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔ ترقی پسندوں کی اجتماعیت [illegible] آزادی حاصل ہوگئی لیکن اس کے بعد خود اجتماعیت بکھرنے لگی اور آزاد ہند میں تقسیم کا [illegible] ہند [illegible]۔ ملک ہند و پاک کی شکل میں تقسیم [illegible]۔ فرقہ وارانہ فساد نے جڑ

پکڑ لیا۔ دو قومی نظریے کے ردعمل میں ملک میں خون اور آگ رقص کرنے لگے، نفرت، تعصب، جھوٹ، فریب، ظلم اور بربریت پھیل گئی۔ انگریزوں نے ایک طرف غلامی سے نجات دی تو دوسری طرف ہزاروں برسوں کی بنی بنائی برصغیر کی مشترکہ تہذیب کو پاش پاش کر دیا۔ فسادات کی زد میں انسانیت کچل کر رہ گئی۔ نانک اور گوتم کی وہ سرزمین جہاں میرا کے پریم بھجن سنائی دیتے تھے وہاں شیطان کے بھیانک قہقہے سنائی دینے لگے۔ نفرت، عداوت اور درندگی کے خون آلود منظر سامنے آنے لگے۔[8] اس طرح زندگی اس قدر پیچیدہ ہوگئی کہ فرد کو اپنے ہی سوالات کا دوٹوک جواب ملنا مشکل ہوگیا اور اس طرح آزادی کے بعد فرد کو اشتراکیت پر سے رہا سہا ایمان بھی اٹھ گیا۔ ترقی پسند تحریک تعطل کا شکار بن گئی۔ یہاں تک کہ جو ادبا و شعرا ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے وہی اس تحریک کی کھل کر مخالفت کرنے لگے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی، وحید اختر، محبّ عارفی، محمود ایاز وغیرہ تو ترقی پسند تحریک کے خلاف کھل کر پرچوں میں مضامین بھی لکھنے لگے۔ مظفر حنفی لکھتے ہیں:

> "یہ لوگ... ترقی پسند تحریک کی غلط نوازیوں اور نعرہ بازیوں سے بیزار ہو چکے تھے۔ اور ہر قسم کی گروپ بندی اور نظریاتی جکڑن سے بالاتر ہو کر کھلی ہوئی فضا میں شعر کہنا پسند کرتے تھے۔"[9]

اور دوسرا سبب یہ ظاہر ہوا کہ اس وقت مغربی ادب کے اردو تراجم کے ذریعے نیا ذہن، مغرب کی نئی شعری تحریکات کو جاننے کے لیے کوشاں تھا۔ اس کے نتیجے میں البیر کامیو (جن کو 1957 کا نوبل انعام ملا تھا) کے فلسفۂ وجودیت سے اردو دنیا بہت متاثر ہوئی۔ تیسرا سبب یہ ہوا کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے لوگوں کی زندگی کو نہایت ہی مشینی بنا دیا۔ ہر شخص اپنے آپ میں گھر گیا۔ دنیا سمٹ گئی اور لوگوں کی رسائی دنیا کے کونے کونے میں ہونے لگی۔ اس سے لوگوں کا وجود کسی ایک محدود جگہ میں برقرار نہیں رہا۔ اس کے نتیجے میں رشتے ناتے ٹوٹنے لگے اور انسان لوگوں کی بھیڑ میں رہ کر بھی تنہائی محسوس کرنے لگا۔[10]

جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے، اردو ادب میں ترقی پسند تحریک کے بعد ردعمل کے طور پر غزل کی 'تازہ روایت' 'نئی غزل' سامنے آئی اور اسی کے ساتھ ایک اور شدت پسند رجحان قایم ہوا جسے ناقدین نے 'جدیدیت' کا نام دیا۔ یہ وہ جدیدیت تھی جس کے بہت سارے فلسفے

تراشے گئے۔ جدیدیت کیا ہے؟ اس کی روداد کیا ہے؟ اس کی بنیاد کہاں سے پڑتی ہے اور کس طرح کے ادب کو جدیدیت میں شامل کیا جاسکتا ہے، یہ ایک طویل بحث ہے اور یہاں اس مختصر بحث میں اس تفصیل میں جانے کی قطعی گنجائش نہیں۔ یہاں میری بحث جدیدیت کے زیرسایہ ابھرنے والی صرف غزل کی اس تازہ روایت سے ہے جو کسی بندھے ٹکے اصول ونظریے کی پابند نہیں۔ یہ نہ تو ترقی پسندی اور روایت کی یکسر پاسداری کرتی ہے اور نہ ہی جدیدیت کے طویل اور پیچیدہ سخت اصولوں کی پابند ہے۔ یہ اپنے آپ میں آزاد ہے اور ادب میں ماضی، حال اور مستقبل کے ہر مثبت عناصر کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے لفظوں میں:

''جدیدتر شاعروں کی ایک نسل ایسی پیدا ہوچکی ہے جو انکار و اثبات کے دوراہے پر اپنی شخصیت اور اپنے ذہن کو پارہ پارہ ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہے۔ یہ نسل جو کافر ہے نہ مومن۔ زندگی، زمانہ، انسان، تہذیب اور کائنات کی ہرآن بدلتی ہوئی متحرک اور تغیر پذیر حقیقت کو سمجھنا چاہتی ہے۔ وہ انسان اور فطرت، جماعت اور فرد، محبت اور نفرت، ظاہر اور باطن، غم اور حسرت، زندگی اور موت اور کفر و ایمان کے ناگزیر لیکن بدلتے ہوئے رشتوں کو سمجھ کر زندگی کے آئین کو دریافت کرنا چاہتی ہے۔'' [11]

خلیل الرحمٰن اعظمی ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''صالح قسم کی جدیدیت وہ ہے جو وقت اور ماحول کے فطری تقاضوں اور ادیب کے اپنے احساس اور تجربے سے پیدا ہوئی ہے۔ یہ جدیدیت خلا میں لٹکی ہوئی نہیں ہوتی بلکہ اس کی جڑیں اپنی روایت میں ہوتی ہیں جو شاعری اپنے ماضی سے کٹ کر بالکل جدید ہوگی ہو وہ صحیح معنوں میں جدید ہی نہ ہوگی۔ اس میں انوکھا پن اور چونکانے کا انداز تو ہوگا جو وقتی طور پر ہماری توجہ کو مبذول تو کرسکتا ہے لیکن اس کا آب و رنگ بہت جلد پھیکا پڑ جائے گا۔'' [12]

اس کے باوجود 'غزل کی تازہ روایت' اور 'جدیدیت' کے مابین کچھ باتیں مشترک ضرور

ہیں۔ جس کا ذکر اس باب میں آئے گا۔ موضوعیت اور فلسفۂ وجودیت کا رجحان اس دور کے ادب میں کثرت کے ساتھ شامل ہوا۔ ادبا و شعرا نے یہ محسوس کیا کہ اگر چہ ہم ترقی کرتے جارہے ہیں مادی ترقی آسمان چھوتی نظر آرہی ہے لیکن جس کے لیے یہ ترقی ہورہی ہے خود اسی کا وجود مبہم سا ہوکر رہ گیا ہے۔ یعنی انسان اور اس کی حقیقت پس پردہ پڑتی جارہی ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اپنے وجود پر غور کریں اور ہر فرد اپنی ذات کا عرفان حاصل کرے۔ انسان بہ ذات خود آزاد ہے، اس کا مستقبل ہے اور جب تک انسان اپنی انفرادیت پر غور نہیں کرے گا ایک اچھی اجتماعیت کا تصور خیالی دنیا کی چیز ہوگا۔ کیوں کہ فرد سے ہی سماج بنتا ہے اور سماج کے ہی سہارے زندگی آگے کو کامران و کامیاب ہوتی ہے۔ اس طرح زندگی کی بنیاد ہی جب کمزور ہوگی تو ہم کامیابی کا منہ کبھی نہیں دیکھ سکتے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ادب کے ناقدین اور مفکرین نے انسانی وجود کو دو خانوں میں رکھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ ایک خانہ تو وہ ہے جس میں بتایا جاتا ہے کہ انسان بہ ذات خود مجبور محض ہے اور دوسرا خانہ وہ ہے جس میں بتایا گیا کہ انسان اپنے عمل کے ذریعے قوت اور عظمت پیدا کرتا ہے، اسی کے ذریعے شر سے الجھ کر اپنے خوابوں کی دنیا پر فتح حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح 1950 کے بعد ابھرنے والے ادب کے رجحانات سے ادب کے اندر وسیع النظری، کشادہ قلبی اور ایک کھلی فضا کی بنیاد پڑی۔ اب سے قبل یہی ادب جو مختلف نظریوں، نعروں اور فارمولوں کے درمیان گھرا تھا اس سے آزادی حاصل ہوگئی۔ اب فن کاروں نے زندگی کو کلی حیثیت سے دیکھنا شروع کردیا۔ ادب کے مفکروں نے یہاں تک کہا کہ وقتی اور ہنگامی فارمولے کے تحت وجود میں آنے والا ادب کا دائرہ محدود ہوتا ہے۔ دیرپا اور مستقل اثرات کا حامل وہی ادب ہوسکتا ہے جو آزادانہ طور پر زندگی کو کلی حیثیت سے دیکھنے کے بعد وجود میں آیا ہو۔ اسی طرح نئی شاعری میں فرد کی اپنی ذات کو بڑی اہمیت حاصل ہوگئی۔ اب اس کی اپنی ذات ہی اپنا مرکز ہے اور اسی کے سہارے وہ اپنے باطن کی طرف سفر کرتا ہے۔ اس سے خودداری اور خودشناسی بھی اس کے اندر آگئی۔ ایک فن کار چوں کہ عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے اس لیے اس پر ماحول و معاشرے کا کچھ زیادہ ہی اثر پڑتا ہے۔ مادی ترقی کے نتیجے میں سماج میں جو شکست خوردگی، بے سہارا پن، بے یقینی اور تنہائی آگئی تو ان فنکاروں نے انھیں شدت کے ساتھ محسوس کیا جن کے سبب ان

کے اندر غصہ، تر دّد، بے چینی، جھنجھلاہٹ اور اپنی ذات کی طرف گریز کا عمل شدید ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود ان میں خلوص کی کمی نہیں۔

آج کے مشینی زمانے میں تنہائی انسانوں کا مقدر بن گئی ہے۔ موجودہ مشینی دور کی برق رفتار زندگی نے انسان کو بالکل تنہا بنا دیا ہے۔ رشتے، ناتے ٹوٹتے اور بکھرتے جا رہے ہیں۔ چنانچہ ہر فرد ایک دوسرے کا باغی بن گیا ہے۔ ان کے زندگی جینے کا کوئی مقصد سمجھ میں نہیں آتا۔ ان کے پاس محبت کی مرکزیت ختم ہو چکی ہے۔ وہ کشمکش میں مبتلا ہے۔ دنیا اسے کاٹنے کھاتی ہے۔ وہ اپنے اس مرض کا علاج کبھی ماضی میں ڈھونڈتا ہے تو کبھی خوابوں اور یادوں کے سہارے جینا چاہتا ہے۔ وہ کبھی جنس میں حاصل زندگی نہیں ڈھونڈتا ہے۔ اسے اس بات کا بخوبی احساس ہو چلا ہے کہ ہم انسانوں کو قدرت نے لامحدود ذمے داریوں کے ساتھ اس دنیا کی بھیڑ میں تنہا اور اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ یہاں سب کے سب اسی ایک مسئلے میں الجھے ہوئے ہیں۔ کوئی کسی کا دکھ درد سننے والا نہیں۔ اس لیے یہ اعتماد اور بھروسہ بھی کرتا ہے تو صرف اپنی ذات پر کرتا ہے۔ اس احساس تنہائی کو موجودہ مشینی زمانے کی الجھنوں کا مرکز مانتے ہوئے ڈاکٹر لطف الرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''احساس تنہائی کے نتیجے میں مہملیت و بے معنویت، خوف و دہشت، مایوسی و ناامیدی، دکھ درد، اجنبیت اور بیگانگی، بوریت و بیزاری، الجھن، اکتاہٹ اور اکائی وغیرہ کے رجحانات عام ہوئے ہیں اور ان سے متعلق دوسرے متعدد رجحانات و میلانات کا سرچشمہ بھی یہی تنہائی ہے جو دراصل موجودہ میکانکی سماج اور مشینی تمدن کا عطیہ ہے۔'' 13

نئے شاعروں نے زندگی کو بہت قریب سے اور حقیقی صورت میں دیکھنا شروع کیا ہے۔ اپنی روایات پر آنکھ بند کر کے بھروسہ کر لینا انھیں قطعی گوارا نہیں۔ اس لیے نئے شاعروں نے اپنے نئے انداز بیان کے لیے اپنی روایات میں تجدید و احیا کا کام کیا۔ اسلوب اور مضامین میں بڑی ندرت اور تازگی آ گئی۔ لیکن ندرت اور تازگی میں انتہا پسند جدیدیے کی طرح ذہنی کھوکھلے پن اور طرز بیان کا کھردرا پن کہیں محسوس نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنی صالح روایات سے آنکھیں نہیں چرائی ہیں۔ وہ صالح روایات جن سے غزل کے مزاج کی نزاکت،

سلاست، شیرینی، روانی، اور نغمگی معنون کی جاتی ہے۔ لہٰذا غزل کی اس تازہ روایت میں بھی وہی لوچ اور نرم روی ہے جو کلاسیکی غزلوں میں پائی جاتی ہے یا مجموعی طور پر یہ کہہ لیں کہ جو خالص غزل کا مزاج ہونا چاہیے وہ تا حال برقرار ہے۔

اس میں شک نہیں کہ غزل کی یہ تازہ روایت (نئی غزل) اردو شعر و غزل میں ایک خوشگوار تبدیلی کا پیش خیمہ ہے۔ ادب میں کچھ خامیاں کہاں نہیں ملیں۔ جس بنیاد پر سردار جعفری اور احتشام حسین نئی غزل کے منفی رجحان کی طرف اشارے کیے ہیں اس میں ظاہراً کچھ جان نظر نہیں آتی۔ 41 کیوں کہ ایک سماج یا اجتماعیت کے اچھے یا برے ہونے میں اس میں شامل افراد کا ہی رول ہوتا ہے اور وہ افراد جب تک اندرونی طور پر صاف دل اور پاک باز نہیں ہوں گے ان سے ایک اچھے سماج یا اجتماعیت کا تصور بالکل محال ہے۔

زبان کے لحاظ سے نئی شاعری 'نئی غزل' کی شناخت اس انداز پر قائم ہے کہ اس کی زبان عوام کی بول چال کی زبان سے زیادہ قریب ہے۔ یہ وہ زبان ہے جسے اسلوب میر کی بازیافت سمجھا جاتا ہے۔ نئے شعرا نے غزل کی ہیئت اور علامتوں کے باب میں اپنی روایت سے منحرف ہو کر اپنے طور پر علامتیں اور الفاظ کے نئے تلازمے اپنی نئی غزلوں میں استعمال کیے ہیں اور جہاں کہیں پرانی علامتوں کو استعمال بھی کیا ہے تو اسے اس طور پر استعمال کیا ہے کہ اس میں اپنے عصر کی صدائیں کلی طور پر سما گئی ہیں۔ ان نئی غزلوں کا رشتہ اپنی زمین سے، اپنے معاشرے سے اور اپنے ماحول سے زیادہ مضبوط ہو گیا ہے۔

عشق اور عشق کے لوازمات نئی غزلوں میں بہ انداز دگر دکھائی دیتے ہیں۔ عشق کا موضوع اردو غزل میں ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ روایتی غزلوں میں عشق کو مرکزیت حاصل تھی۔ جہاں ایک عاشق اپنے محبوب کے سامنے سر تسلیم خم کیے کھڑا ہوتا تھا۔ وہ معشوق کے ہر ظلم و جبر، بے وفائی اور بے توجہی کو اپنی بدبختی اور رضائے الٰہی تصور کرتا تھا۔ اس لیے اکثر وہ اپنے خالق سے شکایت کیا کرتا تھا۔ اس کے عشق میں شدت ہوتی تھی۔ وہ اپنے عشق کے قدموں میں پوری دنیا نچھاور کر دینے میں اپنی شان سمجھتا تھا لیکن نئی غزل میں عشق کی یہ مرکزیت ختم ہو چکی ہے۔ نئی غزلوں کے عاشق کو اپنے زمانے اور ہجوم روزگار سے اتنی فرصت کہاں کہ وہ عشق محبوب میں ایک در سے لگا کھڑا رہے۔ ایسا نہیں کہ عشق کا وجود موجودہ سماج

اور معاشرے سے ختم ہو چکا ہے۔ ہاں اس کی خودمختاری ضرور ختم ہوگئی ہے اور اس کی شدت میں کمی آگئی ہے۔ اب عاشق اپنے عشق کے جذبے کے ساتھ ساتھ زندگی کے دوسرے مسائل کو بھی اہمیت دینے لگے ہیں۔ جس کی سب سے بڑی وجہ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی بتائی جاتی ہے۔ یہی سائنس وٹیکنالوجی ہے جس کے نتیجے میں ہمارے سماج میں مادہ پرستی، اصراف پسندی اور مصنوعی پن پیدا ہوگیا ہے۔ اس نئے زمانے کی نئی اڑان نے انسانی تعلقات میں ایک بڑی کھلبلی پیدا کردی ہے۔ رشتے اور ناتے بکھرنے لگے ہیں۔ خاندان ٹوٹنے لگے ہیں۔ جنسی بے راہ روی آگئی ہے۔ ازدواجی زندگی کشیدہ ہوگئی ہے۔ ہمارے معاشرے میں برہنگی، بے حیائی، لاابالی پن اور آزادانہ گم گشتگی نے طرز رہائش کا نقشہ ہی بدل کر رکھ دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ روایتی غزلوں میں استعمال ہونے والے پردہ، چلمن، محفل جاناں، ناز و ادا، رقیب اور جھروکا جیسے روایتی اشارے کنایے 'نئی غزلوں' سے عنقا ہوگئے ہیں۔ آج کا دور شدید، سماجی اور معاشی بحران کا شکار ہے۔ یہاں لاکھوں میں رہ کر بھی انسان تنہا ہے۔ دنیا سمٹ آئی ہے اور انسان بکھر گئے ہیں۔ جس کے نتیجے میں یہ تنہائی، بیزاری، برہمی، اپنی ذات کی تلاش، احتجاج، تشویش وتر ذد، سماجی غیر محفوظیت، معاشی نابرابری، سیاسی دباؤ اور استحصال، اقدار کی شکست و ریخت جیسے زندگی کے مسائل نے جنم لینا شروع کر دیا ہے اور ان تمام انسانی مسائل کی عکاسی 'نئی غزل' میں واضح طور پر ہوئی ہے۔ ظاہر ہے سماج میں شاعر کا طبقہ عام انسانوں سے زیادہ حساس ہوتا ہے وہ سماج کی ان کھلی حقیقتوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ ان کی آنکھیں محض ایک تماشائی کی نہیں ہوتیں۔ وہ ماحول و معاشرے میں گھلتا رہتا ہے۔ اس پر اس ماحول و معاشرے کا شدید اثر مرتب ہوتا ہے اور پھر ان اثرات کو قبول کرنے کے بعد اس کے اندر پوشیدہ باریکیوں کو حقیقی طور پر طشت ازبام کرتا ہے۔

آج کا ہمارا معاشرہ جو سیاسی اور سماجی بحران کا شکار ہے۔ ملک میں تقسیم ہند کے بعد جو فرقہ وارانہ فسادات اور دیگر برائیاں جنم لینے لگی تھیں وہ بجائے پست ہونے کے اور بڑھتی ہی جارہی ہیں۔ علاقہ پرستی، لسانی جھگڑے، مذہبی اختلافات اور غلط رسم و رواج جیسی سماجی برائیوں نے سر ابھار لیا ہے۔ ملک میں چوری، رشوت بازاری، اقربا پروری، جہیز کی لعنت، مزدوروں کا استحصال اور ہڑتال وتالہ بندی کا بازار گرم ہے۔ ان سماجی مسائل اور پیچیدگیوں

سے جدید شعرا نے خود کو اور سماج کو پیہم ابھارنے کی کوششیں کی ہیں۔ شعرا ان پیچیدہ مسائل سے بیزار ہو کر کبھی اپنے ماضی کی طرف پلٹ کر دیکھتے ہیں تو کبھی اپنے گریبان میں جھانکتے نظر آتے ہیں۔ سیاسی استحصال، سماجی ناانصافی اور بربریت کو دیکھ کر شعرا کا مذہب و عقائد سے بھی ایمان ختم ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ آج کی جدید شاعری میں برہمی کا اندازہ بخوبی کیا جاسکتا ہے۔ جدید شاعری کا مطالعہ کیجیے تو پتا چلے گا کہ بیشتر جدید شعرا ان مصائب کے اندر تہہ غم ہو کر رہ گئے ہیں۔ لیکن کچھ ایسی ہمت اور تیور کے بھی شاعر ہیں جنھوں نے ان سماجی اور انفرادی غموں کا مردانہ وار مقابلہ کر کے جینے کی مثبت راہیں ہموار کی ہیں۔ اردو غزل گوئی کے باب میں یہ تیور ایک انوکھی اور خوش گوار تبدیلی کی بشارت دیتا ہے۔

نئی غزل نے زبان و بیان اور اسلوب و انداز میں اپنی زمین سے جو رشتہ استوار کیا ہے، اس سے ہماری اردو شاعری سے اجنبیت کا غلاف اتر گیا ہے۔ یہاں ملکی رسم و رواج، تہذیب و تمدن، تاریخی اور جغرافیائی ڈھانچے اور اساطیری عناصر بکثرت دیکھے جاسکتے ہیں۔ سائنسی زندگی اور ماحول کے تحت 'نئی غزل' میں جو علامتیں اختراع کی گئی ہیں ان میں پتھر، پیڑ، جنگل، برف، سورج، دھوپ، آندھی، زمین، دھنواں، منڈیر، چھت، جھروکا، تنہائی، برگ، سایہ، سمندر جیسی علامتیں بالکل نئے اور انوکھے عصری پیمانے میں ڈھل کر سامنے آئی ہیں۔

عام رواج سے الگ چلنے کی کوشش میں ایجاد و اختراع اور نئی راہیں نکالنا انسان کی فطرت میں شامل ہے کیوں کہ ہر زمانے کا اپنا الگ الگ مزاج ہوتا ہے۔ ایک سچے فن کار کی ہمیشہ یہی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنے فن میں اپنے پورے عصر کو سمیٹ لائے لیکن اس جدت اور ایجاد و اختراع میں وہی فن زیادہ دیرپا ہوتا ہے جو اپنی زمین سے کٹ کر بالکل الگ نہیں ہوتا۔ وہ اپنے پیش رووں کے مستحسن اور توانا روایات کا استقبال بھی کرتا ہے۔ ورنہ بقول اعظمی، اس کا فن ایک محدود عارضی تجربے اور وقتی ذائقے سے زیادہ اثر قائم نہیں کرسکتا۔ 'نئی غزل' اس لیے آفاقی سمجھی جاتی ہے کہ اس کا رشتہ اپنی روایات کے مثبت عناصر سے بھی بہت گہرا ہے۔ اس 'نئی غزل' کے اولین نمونے مجموعے کی شکل میں 1955 میں منظر عام پر آئے۔ جب کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا مجموعہ 'کاغذی پیرہن' ابن انشا کا 'چاند نگر' اور ناصر کاظمی کا

'برگ نے' منظرعام پر آیا۔ 'نئی غزل' کے ایسے بھی شاعر ہیں جنھوں نے لکھنا تو بہت پہلے شروع کر دیا تھا لیکن ان کے مجموعے بہت بعد میں منظرعام پر آئے اور کچھ ایسے شعرا بھی ہیں جنھوں نے اس کی بنیاد قائم ہونے کے بعد اس رجحان سے اثر قبول کیا اور اپنی شاعری کو اس پیمانے پہ ڈھالا۔

حسن نعیم کے یہاں اس نئی آواز 'نئی غزل' کی ابتدا 1946-1945 سے ہی ابھرتی دکھائی دیتی ہے۔ اگر چہ ان کا پہلا مجموعہ کلام 1971 میں 'اشعار' کی شکل میں منظرعام پر آیا۔ مخمور جالندھری اور خلیق انجم لکھتے ہیں کہ 1953 میں جب حسن نعیم دہلی پہنچے تو ان کے ساتھ اردو غزل میں ایک نئی آواز آئی۔ لیکن حسن نعیم کی غزل گوئی کا احاطہ کیجیے تو پتا چلے گا کہ حسن نعیم کی غزلوں میں یہ نئی آواز اس سے سات آٹھ سال قبل سے ہی در آنے لگی تھی۔ حسن نعیم نے غزل میں اس نئی آواز کو اتارنے کا فن سب سے پہلے اپنے خالو رفیع الدین بلخی (جو جمیل مظہری کے گہرے دوست اور فن شاعری کے ایک اچھے نباض تھے) کی صحبت میں حاصل کیا۔

اس کے بعد جب وہ علی گڑھ میں بی ایس سی کرنے آئے تو یہاں انھیں چند نوخیز ہم عصر فن کاروں کی صحبت حاصل ہوئی۔ ان نوخیز فن کاروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، باقر مہدی اور شہاب جعفری وغیرہ تھے۔ خصوصاً خلیل الرحمٰن اعظمی جن کی شخصیت اردو ادب میں نئے شاعر سے زیادہ نئی غزل کے ایک قد آور ناقد کی حیثیت رکھتی ہے۔ ان سے حسن نعیم نے بہت استفادہ کیا۔ 1948-1946 کے تعلیمی دور میں حسن نعیم نے جب ڈاکٹر اعظمی کو اپنی غزلیں سنائیں تو ان کی غزلوں میں ایک نئی آواز کی لے پا کر ڈاکٹر اعظمی نے انھیں اپنے مفید مشوروں سے نوازا۔ نتیجتاً اس کے بعد حسن نعیم کی غزلوں میں مزید جدت اور توانائی ابھر کر سامنے آئی۔ جن قارئین و ناقدین نے حسن نعیم کی غزلوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ حسن نعیم نئی غزل کے ایک پیش رو اور آئیڈیل شاعر ہیں۔

حسن نعیم کے یہاں جدید تر لہجے کے ساتھ ساتھ فکر کی سبک خرامی اور اظہار کی آب دار نرم روی ملتی ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں اپنے ذاتی تجربات کو عصری حسیت سے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔ ان کے یہاں دل اور دنیا دونوں کا حال یکساں ہے۔ اسلوب اور فکر کے

معاملے میں میر و غالب کی مشترکہ روایات جس قدر حسن نعیم کے یہاں ملتی ہیں ان کے ہم عصر شعرا میں ناصر کاظمی کے علاوہ کسی کے یہاں دیکھنے کو نہیں ملتی اور تنوع میں تو حسن نعیم کی غزل یکتائے عصر ہے۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی حسن نعیم کو نئی غزل کا ایک آئیڈیل شاعر مانتے ہیں اور خلیق انجم لکھتے ہیں:

> ''ہندوستان میں ڈاکٹر اعظمی اہم شاعر ہونے کے علاوہ نئی غزل کے پہلے نباض اور سب سے زیادہ مستند نقاد تھے۔ جب کہ حسن نعیم نئی غزل کے پہلے ماڈل اور معتبر شاعر ہیں۔'' 15

حسن نعیم کے ایک ہم عصر شاعر بانی کا کہنا ہے:

> ''میں سمجھتا ہوں کہ نئی غزل کا پیش آہنگ تلاش کرنا مقصود ہو تو حسن نعیم کی آواز ہر طرف بکھری ملے گی۔ عصر آشنائی کے تفکر کو نئے آہنگ میں ڈھالنے کا رجحان نعیم کی غزلوں سے شروع ہوتا ہے۔ 16

حسن نعیم کے ہم عصر شعرا و ناقدین جس طرح نئی غزل کے باب میں حسن نعیم کی اولیت واہمیت کے قائل ہیں وہ ہماری اردو شاعری کی تاریخ میں حیرت انگیز اور حقیقت افروز فیصلے کی اہمیت رکھتا ہے۔ حیرت انگیز اس لیے کہ ایک زمانے کے شعرا اپنے حریفوں کے معاملے میں اپنی صاف گوئی سے کام لے کر اور کسی دوسرے ہم عصر کی برتری اور اوّلیت کو قبول کر لے یہ کم بڑی بات نہیں ہے۔

حسن نعیم کے علاوہ نئی غزل کے وہ ہندوستانی شعرا جن کی آوازیں 'نئی غزل' کی معتبر آوازیں مانی جاتی ہیں ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، راجندر من چندا بانی، شہریار، مظہر امام، محمد علوی، خورشید احمد جامی، زیب غوری، وحید اختر، باقر مہدی، کمار پاشی، مخمور سعیدی، مظفر حنفی، بشیر بدر، ندا فاضلی، شہاب جعفری اور پاکستانی شعرا میں ناصر کاظمی، ابن انشا، افتخار عارف، ظفر اقبال، منیر نیازی، سلیم احمد، شکیب جلالی، ساقی فاروقی، احمد مشتاق اور عبیداللہ علیم وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ حسن نعیم کی غزلوں کے ساتھ ان شعرا کے کلام کا احاطہ تو اگلے باب میں کیا گیا ہے جس کے ذریعے 'نئی غزل' کے خد و خال بھی ابھر کر سامنے آئے ہیں اور حسن نعیم کی

انفرادیت بھی واضح ہوئی ہے۔ بہرحال اتنی بات میں یہاں واضح کرتا چلوں کہ ان نئے شعرا کی جہد مسلسل، عمیق مطالعے اور تجربے کے نتیجے میں نموپذیر ہونے والی 'نئی غزل' تمام پابندیوں سے بالاتر ہوکر ایک توانا اور دیرپا صورت میں ہمارے سامنے آئی ہے جس میں حسن نعیم کی منفرد آواز اور نیا اسلوب ولہجہ ہرطرف بکھرا ہوا ہے اور بغیر اس کے تذکرے کے 'نئی غزل' گوئی کا ایک روشن باب ظلمت کے غلاف میں چھپا رہ جائے گا۔

○

حواشی:

1. غزل سرا: مجنوں گورکھپوری، ص 241
2. بحوالہ بیسویں صدی میں غزل: ڈاکٹر بشیر بدر، ص 11
3. غزل کی سرگزشت: اختر انصاری، ص 91
4. پنجاب کے نوجوان اسکول کا نظریۂ شعر: الطاف گوہر، 'ادبی دنیا' لاہور، اپریل 1945
5. ابتدائیہ '1941 کی بہترین نظمیں' ص 15، میراجی (بحوالہ 'اردو غزل کے جدید رجحانات: خالد علوی)
6. شاد عارفی: شخصیت اور فن، مظفر حنفی، ص 86
7. جدید تر غزل، چند اشارے: پروفیسر احتشام حسین، 'فنون' غزل نمبر، 1969
8. ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں: ڈاکٹر عابد حسین، ص 192
9. جہات و جستجو: ڈاکٹر مظفر حنفی، ص 46
10. معاصر اردو غزل، مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس، ص 81-80
11. جدید تر غزل: خلیل الرحمان اعظمی، بحوالہ جدیدیت تجزیہ و تفہیم، مرتبہ: مظفر حنفی
12. مضامینِ نو: ڈاکٹر خلیل الرحمان اعظمی، ص 67
13. احساس تنہائی اور نئی غزل: ڈاکٹر لطف الرحمٰن بحوالہ 'معاصر اردو ادب'، مرتبہ: قمر رئیس، ص 86
14. دیکھیے (i) نئی شاعری کی غلط طرف داری، سردار جعفری، بحوالہ جدیدیت تجزیہ و تفہیم، مظفر حنفی، ص 528 (ii) جدید غزل چند اشارے: احتشام حسین، فنون، غزل نمبر 1669، احمد ندیم قاسمی، ص 23
15. حسن نعیم کی 25 نئی غزلیں: ڈاکٹر خلیق انجم، (تعبیر و تفہیم، ص 156)
16. نئی غزل کا دانشور: حسن نعیم، بانی (برگ آوارہ، 16 جولائی 1977)

حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات

کسی بھی فن کے معیار کو استقامت بخشنے میں فن کار کی فکر، فن اور اس کے جذبے کا بڑا دخل ہوتا ہے۔ فن کار کوئی ماورائی دنیا کا پروردہ نہیں ہوتا، وہ بھی اسی زمین پر ہم آپ کی طرح سانسیں لیتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ ہم آپ سے زیادہ حساس اور دل و کائنات کا نباض ہوتا ہے۔ ایک فن کار اپنی زندگی اور ماحول سے کئی صورتوں میں اثر قبول کرتا ہے۔ کوئی محض اپنے اندرون کا راگ الاپتا ہے، کوئی زمانے کے غم کو اپنا غم بنا کر پیش کرتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جس کے دل کی دنیا کے کاروبار اور ماحول ویسے ہی ہوتے ہیں جس طرح زمانے کے کاروبار اور ماحول میں تگ و دو ہوتی ہے۔ ان میں موخرالذکر وہ عوامل ہیں جو کسی فن کار کے فکری محرکات میں ایک بڑی توانائی اور کس بل پیدا کر دیتے ہیں۔ گویا دل اور دنیا دونوں کے امتزاج سے فن میں ایک آفاقی قوت سما جاتی ہے، جس سے فن اور فن کار دونوں کا نقش لافانی ہو جاتا ہے۔ حسن نعیم کی غزل گوئی اسی موخرالذکر فکری محرکات سے مزین ہے۔

حسن نعیم کی ذاتی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو پتا چلے گا کہ بچپن سے لے کر عمر کے آخری ایام تک چھوٹے بڑے بہت سے آلام کا انھیں سامنا کرنا پڑا۔ ان کی زندگی طوفانوں سے گھری رہی، سر پہ قیامت بھی ٹوٹی لیکن تمام تکلیفوں کو ہنستے ہوئے گلے لگایا۔ کیوں کہ یہاں ''دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے''۔ حسن نعیم کی شاعری ایک ایسے معاشرے میں اپنی آنکھیں

کھولتی ہیں جہاں زندگی تمام تر پیچیدگیوں سے عبارت ہے۔ ہر انسان اپنے معاشرے سے کٹا کٹا سا لگ رہا ہے۔ ایک آدمی سے دوسرے آدمی کی قربتیں ختم ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں۔ انسان ایک چھت کے سایے سے محروم ہے۔ یہ وہ معاشرہ ہے جہاں بے مقصدیت، بے زاری، تنہائی، بے معنویت، برگشتگی، اعصاب شکنی اور لایعنیت جڑ پکڑ چکی ہے۔ جس سے شاعر قدم قدم پر دوچار ہو رہا ہے۔ شاعر اس کرب کو محسوس کرتا ہے۔ اس کا اظہار کرتا ہے لیکن اس کا بڑا کمال یہ ہے کہ وہ ان پیچیدگیوں میں سرے سے مدغم نہیں ہوتا بلکہ اپنے ذہن کے ارتقا اور اپنے دیدۂ بینا سے اس کے منفی پہلوؤں سے گریز کرنے کی راہ تلاش کر لیتا ہے۔ وہ اپنے معاشرے سے اکتا کر خود کو اس کی گرفت میں جانے نہیں دیتا۔ وہ اپنی سوچ اور اپنی فکر سے مثبت طور پر زندگی جینے کی راہ ڈھونڈتا ہے۔ ایسے میں شاعر کا تیور اپنے معاشرے سے بالکل باغیانہ ہو جاتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ "ہم سے ہے یہ زمانہ زمانے سے ہم نہیں۔" ایک باشعور انسان کے اندر بھی وہ خاصیت ہے جو ہر غم میں مسکراتے رہنے اور زندگی سے نبردآزما ہونے کا حوصلہ دیتا ہے اور پھر اسے گھٹن میں بھی ایک کھلی ہوئی فضا کا احساس ہوتا ہے:

وہی طالبِ ضیا ہو جو اٹھائے نازِ ظلمت
وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شامِ غم بھی

شامِ الم کو یاد رکھ صبحِ طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لے منزلِ شب کے بعد بھی

تجھ سے بتائیں کیا صبا ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود رخصتِ شب کے بعد بھی

کیا سمجھ کر مجھ سے الجھے ہیں حسنِ لیل و نہار
آپ اپنا روز و شب ہوں آپ عالم تاب ہوں

حسن نعیم زندگی کو ہمیشہ ایک سچے فن کار کی نظر سے دیکھتے رہے۔ ان کے نزدیک ان کے فن کے سامنے دنیا کی دیگر قدریں ہیچ تھیں اور یہ سچ بھی ہے کہ علم و فن کی شمع جلانے والے

خود اگر گل ہو جائیں تو ہو جائیں لیکن اس کی روشنی کی پائیداری سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ اس پر موت کا فرشتہ کبھی حائل نہیں ہوتا۔ سچا فن کار خود تہہ خاک ہو کر آنے والی نسلوں کی پناہ گاہ کے لیے ایک شجر سایہ دار چھوڑ جاتا ہے۔ حسن نعیم نے اپنی زندگی میں پل پل اس حقیقت کا احترام کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مسائل روزگار جہاں جہاں ان کے فن میں روڑے ثابت ہوئے اسے شعوری طور پر ٹھکرا دیا۔ خواہ بڑے سے بڑا سرکاری عہدہ ہو یا اپنا گھربار اور زمین جائیداد۔ وہ اپنے فن کے معاملے میں اتنے حساس تھے کہ ان کی سوچ میں دوسروں کی کسی طرح کی مداخلت گوارا نہ تھی۔ یہی وجہ تھی کہ انھیں ایک سے ایک اعلیٰ سرکاری منصب سے برطرفی کا خمیازہ بھگتنا پڑا۔ آخری وقت میں صورت حال اس درجہ ابتر ہوگئی کہ دو وقت کی روٹی بہ مشکل ہی نصیب ہو پاتی تھی۔ صبح کہیں اور شام کہیں کٹتی تھی۔ بھرے شہر میں کہیں ٹھکانہ میسر نہ تھا۔ دوست احباب بھی آنکھیں دکھا گئے۔ لیکن اس تنگ دستی اور بوریا نشینی میں بھی صبر کا دامن ہاتھ سے جانے نہ دیا اور فقیرانہ شان سے اپنے فن کے ساتھ دیانت داری سے کام لیتے رہے۔ بقول شاعر:

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

مصلحت کوشی اور خوشامد پسندی سماجی زندگی میں ایک بڑی غذا کا کام کرتی ہے۔ انسان کو من چاہی مراد حاصل ہوتی ہے۔ نااہل ہوتے ہوئے بھی انسان بڑے سے بڑے عہدے کا اہل بن جاتا ہے۔ لیکن یہ مصلحت کوشی اور خوشامد پسندی اس کی اپنی شخصیت اور صلاحیت کے لیے زہر ہلاہل کا کام کرتی ہے۔ اس کی اپنی شناخت دوسروں کے احسانوں تلے گم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی حقیقت ہے کہ مفکرین نے ہمیشہ مصلحت کوشی اور خوشامد پسندی کو انسانی وقار کے لیے ایک بڑا عیب قرار دیا ہے۔ سرسید احمد خان لکھتے ہیں:

''خوشامد ہمارے لیے ایسی ہی بدزیب ہیں جیسے دوسروں کے کپڑے ہمارے بدن پر۔''[1]

حسن نعیم کا بھی یہی ماننا تھا کہ مصلحت پسندی اور خوشامد سے انسان کی اپنی شخصیت دھول میں فنا ہو کر رہ جاتی ہے اور اپنے وہ تجربات جن سے اپنی کمیوں اور کوتاہیوں کو دبانے اور خود کو نکھارنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں، ہاتھ سے جاتے رہتے ہیں۔ یہی حقیقت تھی جس

کی بنا پر وہ زندگی کے ہر موڑ پر اپنی عقل وشعور سے کام لیتے رہے اور جیے تو اس تیور کے ساتھ کہ:

میں نہ طوفاں سے جھکا ہوں اور نہ آندھی سے دبا
ان درختوں سے تو اونچا ہوں بلا سے گھاس ہوں

شاعر کے اس تیور میں ان کے خاندانی تعلیم وتربیت کا بڑا دخل ہے۔ ذیل کا شعر دیکھیے:

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے ہزار موج غبار لائے

(درگہ مخدوم جہاں حسن نعیم تربیت حاصل کرنے کے لیے اکثر جایا کرتے تھے، یہ بہار شریف میں ہے جو بڑی درگاہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ایک قصبہ راجگیر ہے جو کوہساروں کے دامن میں آباد ہے۔)

حسن نعیم ایک انا پسند اور باغی ذہن انسان تھے۔ ان کی انانیت کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ خواہ اپنی نوعمری میں گوپی ناتھ امن کے یہاں مشاعرے میں اپنا کلام پہلی ہی دعوت میں نہ پڑھنے کا مسئلہ ہو، فراق کے ساتھ شعرفہمی کا معاملہ ہو، 'زندہ دلان بمبئی' کے پروگرام میں دعوت نہ ملنے پر زمین وآسمان سر پر اٹھا رکھنے کا واقعہ ہو، اکسٹرنل افیرس کی سروس کو خیرباد کہنے کا سانحہ ہو یا غالب انسٹی ٹیوٹ کے ترک کرنے کا المیہ ہو یہ سب اردو ادب میں ایک شخصی المیہ کے نام سے زندہ رہے گا۔ بہرحال حسن نعیم پہلے شخص نہ تھے جو اپنے کام کی جانب توجہ نہ دینے والوں سے نالاں اور بدظن تھے۔ ظاہر ہے اپنے حق کا انصاف نہ ملنے پر ایک خاموش طبیعت انسان بھی رنجیدہ ہو اٹھتا ہے اور حسن نعیم تو ایک انا پسند اور پرگو شخصیت کے حامل تھے۔ مومن نقارہ بجا کر کہتے ہیں کہ جو میری شاعری کا معتقد نہیں وہ مومن ہرگز نہیں ہوسکتا۔ میر نے اپنے آپ کو اجگر اور اپنے ہم عصروں کو حشرات الارض کہہ کے پکارا۔ یگانہ کو اپنی برتری جتانے سے طبیعت نہ بھری تو غالب شکنی پر آمادہ ہو اٹھے۔ یہ اور ایسے کتنے واقعے ہیں جو ہمارے ادب میں انا پسندی اور سرکشی کی مثال رکھتے ہیں۔ اس کے برعکس حسن نعیم نے اپنے بزرگوں [illegible] تسلیم کیا۔ غالب، میر، درد، مومن اور بیدل جیسے شعرا کو اپنا پیش رو تسلیم کر [illegible] روایت میں اضافے کیے۔ البتہ وہ اپنے ہم عصروں میں بیشتر شعرا سے خود کو برتر ضرور [illegible] تھے اور ان کی خوش گمانی بقول خلیق انجم بے جا نہ تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''ان کا (حسن نعیم کا) اسلوب اپنے تمام معاصرین کے اسالیب سے زیادہ تہہ دار، دل کش اور بامعنی ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہین قاری کو ان الفاظ کی تلاش کرنی ہوتی ہے جن کی کلیدی حیثیت ہے کیوں کہ ان الفاظ کے ہی تخلیقی استعمال سے ان کا طرز بیان پر اسرار بنتا ہے اور اپنے دائرۂ فکر میں بہت سے کوائف کو سمیٹ لیتا ہے۔''[2]

حسن نعیم کو اپنا یہی اصل حق نہ ملنے پر اپنے بعض ہم عصر ناقدین سے انھیں ہمیشہ شکوہ رہا۔ لہٰذا انھیں اپنے ہم عصروں میں دانشوروں کا قحط نظر آنے لگتا تھا اور پھر وہ شراب کے نشے میں اپنے ہم عصر کیا اپنے بعض پیش رووں سے بھی خود کو آگے سمجھ کر اس پر تقریریں کرنے لگتے تھے۔ جس سے ان کی انا کی تسکین ہوتی تھی۔ اس بات کی تصدیق نہ صرف ان کے سوانحی واقعے کو پڑھ کر ہوتی ہے، بلکہ ان کی شاعری بھی ہمارے سامنے زندہ مثالیں ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان کے یہاں شاعرانہ تعلی مناسب حدود کے اندر ہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اپنی شاعری میں حسن نعیم کی عقل وخرد اور شعوری سنجیدگی ہر جگہ حاوی نظر آتی ہے۔ وہ مہینوں اور برسوں ایک ایک شعر کی نوک پلک پر غور کیا کرتے تھے۔ اس لیے کم کہا مگر غور وفکر کے ساتھ کہا۔

اپنے فن اور شہرت کے معاملے میں حسن نعیم کافی جذباتی انسان تھے۔ وہ ہمیشہ یہی سوچتے رہتے اور اس بات کے ہمیشہ خواہشمند ہوتے کہ اپنے جیتے جی اپنا صحیح حق مجھے حاصل ہو جاتا۔ اہل ادب کے نزدیک میری خاطر خواہ پذیرائی ہو جاتی۔ لیکن ایسا انھیں کبھی نصیب نہ ہو سکا۔ اس سوچ نے ان کے باغیانہ ذہن کو اور ہوا دینا شروع کر دیا۔ ان کے مزاج میں تلخی اور طبیعت میں عجلت پسندی آگئی۔ اس کے نتیجے میں کسی شعری یا ادبی نشست میں اپنے کلام کی برتری پر وہ لمبی چوڑی تقریریں کر بیٹھتے تھے کہ خواہ مخواہ محفل میں بدمزگی پیدا ہو جاتی تھی اور اس کا الٹا اثر یہ ہوا کہ ان کے بیشتر ہم عصر ناقدین ان کے اور باغی ہو گئے اور ناقدین کو جو توجہ ان کے کلام پر دینی چاہیے تھی وہ نہیں دے سکے، اور ان کی شاعری کے محاسن ذاتی اختلافات میں گم ہو کر رہ گئے۔ حسن نعیم اس بات سے اچھی طرح واقف تھے کہ یہ دنیا لین دین کی جگہ ہے، ایک ہاتھ سے دو تو دوسرے ہاتھ سے لو، لیکن ان کی درویشانہ صفت طبیعت خوشامد پسندی اور سیاسی جوڑ توڑ پر کبھی آمادہ نہ ہو سکی۔ اس سلسلے میں حسن نعیم اور فراق سے وابستہ ایک واقعہ دہرانا ناگزیر معلوم ہوتا ہے۔

جس زمانے میں حسن نعیم، وزیر خارجہ ڈاکٹر سید محمود کے سکریٹری تھے اسی زمانے میں دہلی میں ایک مشاعرہ ہوا تھا۔ اس مشاعرے میں فراق گورکھپوری بھی تشریف فرما تھے۔ فراق کی اپنے میزبان سے کسی بات پر ان بن ہوگئی تھی۔ اس رات فراق حسن نعیم کے یہاں ایک مہمان کی حیثیت سے ٹھہر گئے۔ دوران قیام فراق نے حسن نعیم سے پوچھا: ''سنا ہے آپ کا مجموعہ تیار ہو رہا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس پر مقدمہ لکھوں۔'' باتوں باتوں میں فراق نے ظاہر بھی کر دیا کہ وہ مقدمے میں کیا لکھنے والے ہیں۔ یعنی فراق نے پہلے خود کو تسلیم کیا، پھر یگانہ کا نام لیا اور یگانہ کے بعد حسن نعیم کا مقام متعین کیا۔ حسن نعیم دل ہی دل میں بہت خوش ہوئے۔ مجموعہ کا نام 'حرفِ دل' قرار پایا تھا۔ مقدمہ لکھنے کے لیے فراق نے حسن نعیم کو الہ آباد آنے کی دعوت دی۔ حسن نعیم، فراق کی دعوت پر الہ آباد پہنچے۔ الہ آباد میں حسن نعیم کا تین دنوں تک قیام رہا۔ اس دوران فراق نے تقریباً اپنے ڈھائی ہزار اشعار حسن نعیم کو سنا دیے اور اس بات کا ذکر سرے سے غائب رہا کہ حسن نعیم کس لیے بلائے گئے ہیں۔ اشعار سنانے کے بعد فراق نے حسن نعیم سے پوچھا: ''آپ کا کیا خیال ہے، اردو کا سب سے بڑا غزل گو کون ہوا ہے؟'' تو حسن نعیم نے لوگوں کے ذاتی اختلافات کو دہراتے ہوئے اپنی پسند میں میر و غالب کو اوّلیت دی۔ اس جواب پر فراق کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ پھر فراق نے پوچھا: ''اگر تین بڑے شاعروں کا نام لیں تو؟'' تیسرے نمبر پر حسن نعیم نے مومن کا نام لیا۔ یہاں تک کہ فراق نے فہرست بڑھا کر دس کر دی۔ لیکن اس جوابی فہرست میں حسن نعیم نے کہیں بھی فراق کا نام نہ لیا۔ اس بات پر فراق برہم ہوگئے اور کہا ''اس شعر فہمی اور سخن دانی پر آپ چاہتے ہیں کہ میں آپ کے مجموعے کا مقدمہ لکھوں۔'' اس واقعے کا ذکر کرتے ہوئے حسن نعیم کہتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے سمجھ لیا کہ کیسے کیسے ہتھکنڈے سے شہرت حاصل کی جاتی ہے۔ اسی پس منظر میں انھوں نے یہ شعر کہا تھا:

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

اس واقعے کا حسن نعیم پر اتنا شدید اثر ہوا کہ انھوں نے ایک سال تک شعر کہنا چھوڑ دیا تھا۔[6]
حسن نعیم نے زندگی کے ہر نشیب و فراز سے تجربات حاصل کیے تھے۔ کبھی وقت نے اونچے مسند پر بٹھایا تو کبھی بوریہ نشینی ان کا مقدر بن گئی۔ لیکن اخلاقی معاملوں میں وہ کبھی زیر نہ

ہوئے۔ یہی وجہ تھی کہ ان کے یہاں دوست احباب کے تانتے لگے رہتے تھے۔ ان کے جب دن اچھے تھے تو دوستی کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ حسن نعیم نے سبھوں کے ساتھ وفا برتی۔ ان کی ہم نشینی میں کیسے کیسوں کے دن پھر گئے۔ وہ لوگ جنھیں اپنی شام کی فکر رہتی تھی وہ دوسروں کی شامیں سنوارنے کے اہل ہو گئے۔ لیکن حسن نعیم کے جب دن پھر گئے تو جن لوگوں سے دانت کاٹی روٹی تھی وہ بھی کافور ہو گئے۔ مگر اس کو کیا کیا جائے کہ یہ دنیا بھی عجیب واقع ہوئی ہے۔ یہ اچھوں کی دشمن اور بروں کی دوست بن جاتی ہے۔ لہٰذا حسن نعیم یہی سوچتے رہے:

وہ زمانے کا بدلتے رہے کردار نعیم
جن کے کردار زمانے کو گوارا نہ ہوئے

بستیاں چھان کے جانکلیں گے ویرانوں میں
تو جہاں ہوگا وہیں عیش کے ساماں ہوں گے
مل کے عارف سے اگر بن نہ سکے ہم مومن
ان فقیہوں میں کہاں پھنس کے مسلماں ہوں گے
ہم ہیں ناواقف آداب جہاں گرچہ نعیم
ہم ہی افسانۂ تہذیب کے عنواں ہوں گے

وسیع القلبی، مہمان نوازی، فیاضی اور صبر و شکر کی تعلیم اور کل کی طرف سے بیگانگی انھوں نے اپنے خانوادے سے حاصل کی تھی، جو ہر حال میں ان کا شیوۂ روزگار بنا رہا۔ اپنے خاندان کی تعلیم کے ہی زیر اثر ان کے کلام میں تصوف اور اسلامی تاریخ و فلسفے کی آوازیں بھی سنی جا سکتی ہیں جو آخر دنوں میں اور گہری ہو گئی تھیں۔ حسن نعیم اگر چہ مذہبی انسان نہیں تھے لیکن اپنے بزرگوں کی تربیت پر یک گونہ سکون کا اظہار کرتے تھے۔ وحدت الوجود کی طرح ذات و کائنات کو وحدت کے روپ میں دیکھتے اور پوری زندگی کا محاسبہ کرتے ہوئے زندگی سے براہِ راست ہم کلام ہوتے رہے:

اے دل یہ خط و خال نہیں ہے جمالِ کل
اک جزوِ حسنِ دوست ہماری نظر بھی ہے

کتنے افکار کا زینہ ہے تری زلفِ دراز
کتنے خوابوں کا چمن ہے تری گل پیرہنی

آبسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پر ہے مگر نام اسی کا لکھا

مثلِ سیاح کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے
دیکھوں میں حلقۂ زنجیر کہ دنیا دیکھوں

صوفیوں کے یہاں انشراحِ قلب کا یہ مضمون دیکھیے:

اس نے سینے سے لگایا جو کہا میں نے حسن
دل میں رکھنے کے لیے اپنا کوئی راز تو دو

حسن نعیم کو اپنے گھر اور وطن کی چیزیں بے حد عزیز تھیں۔ انھوں نے امریکا سے لے کر سعودی عربیہ اور پاکستان تک بہت سے ملکوں اور شہروں کی سیر کی لیکن اپنے گھر اور وطن کی محبت اور اس کے عشق میں ہمیشہ سرشار رہے۔ دنیا کی ظاہری آرائشیں ان کے وجود کو اپنی حقیقت سے کبھی منقطع نہ کرسکیں۔ فراق گورکھپوری نے لکھا ہے:

"جب تک گھر کے دیے کو چراغ طور سے پاکیزہ تر ہم محسوس نہ کریں گے۔ گھر کو جنت سے، گھر کے کھانے کو میوۂ جنت سے۔ اپنے گھڑے کے پانی کو کوثر وتسنیم سے، عالم نباتات کو باغ جنت سے، گھر کی لکشمی کو حورِ جنت سے زیادہ پاک ہم محسوس نہ کریں گے۔ ہمارا کلچر خلا کی چیز ہوگا اور ہماری شاعری بے بنیاد ہوگی۔"4

حسن نعیم کے یہاں ایسے بیشتر اشعار ملیں گے جن سے دردِ حب وطن اور کربِ غریب الوطنی کی آوازیں سنائی دیں گی۔ ذیل کے اشعار دیکھیے:

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

اتنا دلِ نعیم کو ویراں نہ کر مجاز
روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی

وہ تجھے ڈھونڈا کیا بازارِ دلّی میں نعیم
تم نہ جانے کون سے جنگل میں جا کے کھو گئے

حسن نعیم زندگی کو ایک کلی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ان کے یہاں غمِ جاناں اور غمِ دوراں کی حدیں سرے سے ختم ہیں۔ ان کے یہاں مختلف فکری رویے اور کشمکش دکھائی پڑتی ہے۔ تنہائی کا کرب، بیزاری، اپنی ذات کی تلاش، تشویش و تردد، سماجی، سیاسی اور معاشی نابرابری کا احساس، سائنس و فلسفہ، نسلی تصادم اور اس کے خلاف احتجاج وغیرہ ان کی شاعری میں ایک کلیدی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سبھوں میں اپنے داخلی کرب کی لہریں دکھائی پڑتی ہیں۔ ان کی غزلوں کا کینوس بہت وسیع ہے۔ ان کے یہاں دلبری اور قاہری کے نازک ترین لمحوں کی باتیں اور وارداتیں اور ان میں اپنی فتح و شکست دکھائی پڑتی ہے۔ جس میں حسرت و مسرت کے سوتے پھوٹتے نظر آتے ہیں۔ شاہد و شراب سے ان کی پوری زندگی عبارت رکھتی ہے۔ وہ شاہد و شراب کے دل سے قائل نہ تھے اور فرماتے رہتے۔ ''شاہد و شراب ایک آگ ہے آگ، اس سے بچ کر رہنا۔''[6] لیکن نہ جانے خود کون سا روگ پال رکھا تھا کہ اپنی زندگی کا قیمتی اثاثہ شاہد و شراب کی نذر کر دیا:

غم کو غرق مے کیا ہوگا کسی نے اے نعیم
میں وہ میکش ہوں جو وقتِ میکشی روتا رہا

مٹ گئے سب داغ، داغِ عشق تنہا رہ گیا
گر گئی دیوار لیکن اس کا سایہ رہ گیا

حقیقت میں دیکھیے تو کون ہے اس دنیا میں جس کے پاس چھوٹے یا بڑے غم نہیں۔ اگر شراب نوشی ہی غموں کا مداوا ہوتی تو سارے لوگ شرابی بن جاتے۔ ایک ایسا عصر جہاں ہجوم زندگانی اور مسائل روزگار سر چڑھ کر بول رہے ہوں وہاں دیار بتاں کی رسمیں کیسے نبھائی دیتی

ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عشق کی مرکزیت اور اولیت حسن نعیم کے یہاں ٹوٹتی اور بکھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ ایسا نہیں کہ شاعر کے نزدیک عشق کی ماہیت کا کوئی وجود ہی نہیں لیکن ان کے نزدیک جذبے اور احساس کی آماجگاہ روایتی طور کا عشق نہیں ہے۔ جس کا عین سبب سماجی اور اقتصادی بحران نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ انھیں اپنے محبوب سے بچھڑنے کا غم تو ضرور ہے لیکن اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے کھڑا رہنا گوارا نہیں۔ ذیل میں شاعر کا احساس دیکھیے:

حسن کا دربار بھی بازار دنیا ہے نعیم
اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لے کر چلے

سر اٹھانے کی کہاں آج مجھے تاب نعیم
وہ کسی چاند کے پیکر میں نہاں ہے تو رہے

حسن نعیم کی غزلوں میں طنزیہ لہجے کا بھی عمل دخل ہے جو اپنی ذات کی شدید گھٹن اور بے بسی کے نتیجے کی پیداوار ہے۔ اردو غزل میں یہ لہجہ کوئی نیا نہیں۔ اس طنزیہ لہجے کا رشتہ میر و غالب، ذوق و مومن اور آتش و ناسخ سے یگانہ اور شاد عارفی تک جڑا ہوا ہے۔ گویا اس کی جڑیں اردو غزل کی روایت میں دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔ حسن نعیم اپنے زمانے میں سماج کی متضاد قوتوں سے ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ جہاں دوست اور دشمن کی پہچان مشکل تھی۔ حق و انصاف کا وجود فرضی ہو چکا تھا۔ ایسے میں بیزاری، غصہ اور جھنجھلاہٹ کا پیدا ہونا لازمی تھا۔ طنز کا یہ پہلو حسن نعیم کے یہاں کبھی کبھی شدت کا رخ بھی اختیار کر گیا ہے۔ اس کے باوجود یہ طنزیہ پہلو بھی اپنے اندر حریف کے لیے روشن گوشے رکھتا ہے:

بندوں نے جب سے کام سنبھالا ہے دہر کا
نازل ہے روز قہر خدا کے بغیر بھی

وہاں جو ہوگا سو ہوگا حساب کا دھندا
عذاب جو یہ یہاں بھی عذاب آئے گا

جن دنوں اخلاص میں تھوڑی سی عیاری نہ تھی
حسن کے دربار میں ثابت وفاداری نہ تھی

صاف گوئی کی بنا پر جو انیسِ شام تھا
وقت کیا بدلا کہ وہ بھی ہاں نہیں کرنے لگا

میں جس کو وحشت میں ڈھونڈتا تھا ہر ایک جنگل ہر ایک قریہ
وہ مصلحت کا لبادہ اوڑھے صفِ عدو کے قریں ملا ہے

حسن نعیم کی غزلیں سیاسی صورت حال اور سماجی مسائل کی بھرپور عکاس ہیں۔ ان کی غزلوں میں انسانی نفسیات اور کائنات کے گہرے پیچیدہ مسئلے ہیں۔ انھوں نے روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات اور تجربات کو بھی موضوع شعر بنایا ہے۔ اپنے عصر کی زندگی کی بے مقصدیت، ذات کے بحران، وجود کی لایعنیت، تنہائی کے کرب، نفسیاتی الجھنوں اور ذہنی کشمکشوں پر ہی اپنی توجہ محدود نہیں رکھی ہے بلکہ ان کی آنکھیں اپنے گرد و پیش کا مطالعہ بھی کرتی ہیں۔ ایک ڈپلومیٹ سرکاری ملازم کی حیثیت سے سیاسی اور سماجی مسائل کا انھوں نے بہت قریب سے مشاہدہ کیا ہے۔ تقسیم ہند کے بعد فرقہ وارانہ کشیدگی، اپنی نئی دنیا اپنے نئے انداز سے بسانے کی جو ہما ہمی ایک ہی ملک کے دو فرقوں کے درمیان پھیلی تھی، اس تعصب اور نفرت نے ہماری ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب کی بنیادیں ہلا کر رکھ دیں۔ اس انگارے کی لپیٹ میں کلچر، مذہب، زبان اور سماجی زندگی کے دیگر گوشے آگئے۔ مذہبی رواداری کی جگہ لوگوں کے اندر غیر انسانی فطرتیں سر ابھارنے لگیں۔ اکثریت نے اقلیت پر، طاقت ور نے کمزوروں پر ظلم ڈھانا شروع کر دیا۔ معاشی اور سماجی ترقی تعطل کا شکار ہوگئی۔ نسلی فسادات، لوٹ مار اور آتش زنی نے سر ابھارنا شروع کر دیا۔ ان سے اخلاقی قدریں اس قدر گر گئیں کہ لوگوں کو اپنے مذاہب پر سے رہا سہا اعتقاد اٹھنے لگا۔ حسن نعیم کے شعروں میں نہ صرف ان سماجی بحران کی شدت کا مشاہدہ ملتا ہے بلکہ عوام کو شعوری طور پر انسانیت کی طرف پلٹ کر دیکھنے اور ظلم و جبر سے مردانہ وار مقابلہ کرنے کا ہنر بھی ملتا ہے۔

ندا فاضلی لکھتے ہیں:

''حسن نعیم کی غزلوں کے مرکزی کردار کا تیور بڑا توانا ہے۔ یہ تیور نہ صرف ان کو اپنے ہم عصروں میں منفرد کرتے ہیں بلکہ نئی غزل میں ایک نئے احساس اور رنگ کے آمد کی خبر بھی دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی اور ابن انشا کے تھکے ماندے اور ہجر زدہ عاشق کے مقابلے میں یہ کردار توانا اور مردانہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کی تہذیبی دنیا بھی زیادہ وسیع اور تہہ دار ہے۔ اس کا خمیر ہم عصر زندگی کے تضادات سے ابھرا ہے جو غم کو جی کا روگ بنانے کے بجائے اسے شعور کی تابندگی میں ڈھالتا ہے۔''[۵]

سجدہ ریزی سے نہ ہوگی کبھی دل کی تسکیں
آج یہ بات ہر اک داغ جبیں کہتا ہے

مری بزم دل کا نہ پوچھیے کبھی تیرگی کبھی روشنی
مری ایک بزم خیال ہے جہاں تیرگی کا گزر نہیں

کوئی سودا نہیں بازار جنوں میں سستا
دل بڑا چاہیے غم مانگنے والوں کا یہاں

یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا
میں نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی

حسن نعیم اپنے ماضی، خوابوں اور یادوں کی طرف بار بار پلٹتے دکھائی دیتے ہیں۔ جہاں جدید دور کی وحشت ناکی سے اپنی ذات کی پناہ گاہ تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔ شاعر کا یہ شعور اپنے عصر سے فرار نہیں بلکہ اپنی ذات کو محفوظ رکھنے کا ایک وسیلہ ہے۔ اپنے اسلاف کے مثبت رویے، بچپن کی یادیں، گاؤں کی فضا میں سکون کا احساس اور دیومالائی رشتے سے ربط کا رجحان شاعر کے اس شعوری فکر کی غمازی کرتے ہیں:

موجۂ وقت میں روپوش ہے وہ ماہِ تمام
چاندی ہووے جہاں یاد کا بجرا ہووے

یہ دکھ ہے کون بسائے گا درگہ مخدومؒ
نہ میں چراغ وراثت رہا نہ تو ہوگا

جبر شبّی کا صرف بغاوت علاج ہے
اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے

مجلسوں کی روشنی ہوں پھر بھی لگتا ہے نعیم
میں کسی گوتم کا دکھ ہوں رام کا بن باس ہوں

مل گئی یوں خاک میں اجداد کی محنت کہ اب
ہر نئی کونپل کی پیشانی پہ گردِ یاس ہے

ادب کی شعری روایات سے حسن نعیم نے بھرپور استفادہ کیا ہے۔لیکن تجربات میں کسی کی نقالی کو کبھی گوارا نہ کیا۔اپنے فن میں ان کا تیور غالب کی طرح ہمیشہ باغیانہ رہا۔الفاظ کی سطح پر بھی اور مضمون آفرینی کی سطح پر بھی۔ وہ اپنے فن پر مہینوں اور برسوں غور و خوض کیا کرتے تھے۔انجام کار اپنی شعوری سنجیدگی کے ذریعے لفظوں کو تخلیقی جہات بخشنے میں اپنے معاصرین پر انھیں سبقت حاصل ہوگئی۔ جس سے شعروں میں تہہ داری، دانائی اور توانائی ابھری۔ آپ جتنی بار پڑھیں گے ایک نئی فضا کا احساس ہوگا:

ہوا ہے گرم، اداسی کا زود منظر ہے
سبھی درخت ہری کونپلیں چھپائے ہیں

خلا کی سرد سلوکی مری زمیں میں نہیں
رہی نہ روح تو میں خاک خوش نما ٹھہرا

حسن نعیم جو کچھ کہتے ہیں اس کا ایک کلچر اور روحانی پس منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ انھیں فنی رموز پر جیسی قدرت حاصل ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ ان کے اشعار ہمارے دل و دماغ پر اس قدر اثر کیوں کرتے ہیں؟ اس تاثر کے اسباب کیا ہیں؟ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ ''حسن نعیم کے کلام میں غیر معمولی تاثر اور دل کشی کا بڑا سبب حرف وصدا کی ہم آہنگی ہے۔'' ان کی غزلوں کو پڑھتے ہوئے غور کیجیے تو یہ صداقت ذہن ونظر پر گہرے اثرات ڈالتی ہے۔ شمیم طارق لکھتے ہیں:

> ''فن موسیقی کے رموز سے وہ (حسن نعیم) اچھی طرح واقف تھے۔ غزل گائیکی کے فن کارانہ احساس اور اس احساس کی اپنی غزلوں میں فنی روایت سے انھوں نے ہر مصرعے بلکہ مصرعے کے ہر ٹکڑے کو مکمل Musical Unit میں تبدیل کر دیا ہے۔ کسی یونٹ کو پورا کرنے کے لیے کوئی حرف اِدھر اُدھر کرنا نہیں پڑتا اور ہر یونٹ سے معنی اور موسیقی کے کئی رنگ اور راگ پھوٹتے ہیں۔''2

حسن نعیم کی زبان سادگی و پرکاری اور بیخودی و ہشیاری کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ سہل پسندی ان کی رگ رگ میں پیوست نظر آتی ہے۔ 1950 کے آس پاس اردو غزل میں اسلوب میر کی بازیافت کی گئی جس کی متعدد سیاسی اور سماجی وجوہات تھیں جنھیں حسن نعیم کے ہم عصروں نے اپنی اپنی شاعری کے لیے وسیلۂ اظہار بنایا۔ گویا اسلوب میر میں اپنی بات کہنے کا رواج چل پڑا۔ حسن نعیم نے اپنے طور پر میر کے اس اسلوب کی نئی بازیافت کی:

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

دشت پیمائی ہے اپنی، عہدِ حاضر کا جنوں
بن چکے ہیں مجھ سے پہلے، میرے قدموں کے نشاں

حسن نعیم کے اس شعری اسلوب پر کسی ناقد کو اعتراض بھی ہے کہ یہ شعری اسلوب نہیں نثری منطق ہے۔ جو نہ صرف حسن نعیم پر بلکہ ان کے عہد اور اسلوب میر پر بھی کاری ضرب

ہے۔محمود ہاشمی کا وہ مضمون جس میں انھوں نے حسن نعیم کی شاعری کے ساتھ ان کے اسلوب کا جو بھونڈا مذاق اڑایا ہے۔ وہ محض صحافتی تبصرہ نگاری اور ذاتی پرخاش کا نتیجہ ہے۔ مضمون کا انداز بھی تبصرہ نگار کی کینہ پروری کا پردہ کھولتا ہے۔اس تبصرے کے جواب میں پروفیسر وہاب اشرفی اور عشرت ظہیر نے جو گرفت کی ہے لہٰذا سے پڑھ کر نہ صرف محمود ہاشمی کے دقیانوسی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ حسن نعیم کی شعر فہمی، شعوری سنجیدگی اور اسلوب پسندی کے مثبت رویے بھی قارئین کے سامنے منکشف ہوجاتے ہیں۔

حسن نعیم جو کچھ کہتے ہیں اس سے پہلے ان میں یہ احساس جاگتا ہے کہ میں کیا ہوں؟ میں کون ہوں؟ گویا 'میں' کا حادی رجحان جوان کا اسلوب بھی ہے ان کے ہر شعر میں آپ کو ملے گا۔ وہ 'میں' جو ذات انسان کے تشخص اور شناخت کا ضامن ہوتا ہے اور جو رجائیت کو جنم دیتا ہے۔ وہ قدم قدم پر آپ سے یہ کہتا سنائی دے گا کہ ''ہم سے ہے یہ زمانہ زمانے سے ہم نہیں۔'' ان کے اندر کی دنیا اور باہر کی دنیا میں تصادم ہے۔ زندگی کے گوناگوں نشیب و فراز، سماجی نابرابری، سیاسی بدحالی، معاشی بحران، معاشرتی بے اعتدالی، ترقی پسندی، ادبی گروہ بندی کے گلے شکوے، سائنس و فلسفہ، عشق و تصوف، غم پسندی و دردمندی، اور ان سب حقائق کے ساتھ انسانی ہمدردی اور دیگر چھوٹے چھوٹے موضوعات بھی ان کی شاعری میں دیکھے جاسکتے ہیں اور ان سب کے ساتھ ساتھ ان کا ایک خاص طرزِ اسلوب ہے جو نئی راہ کی تلاش ہے۔

O

حواشی

1. مضمون 'خوشامد' از مضامین سر سید، سر سید احمد خاں
2. 'حسن نعیم کی 25 نئی غزلیں' بحوالہ تعبیر و تفہیم: ڈاکٹر خلیق انجم
3. 'باتیں حسن نعیم سے'/ باتیں ادب کی، مرتبہ: مظفر حنفی، ص 175
4. اردو کی عشقیہ شاعری: فراق گورکھپوری
5. 'لامرکزیت کے شکار: حسن نعیم'/ مت سہل ہمیں جانو، انور ظہیر خان، ص 133
6. حسن نعیم ایک ادبی المیہ: ندا فاضلی، ماہنامہ 'شاعر' جلد 62، 1991
7. حسن نعیم کی شعری شناخت: شمیم طارق، ماہنامہ 'شاعر' جلد 62، 19991
8. 'شب خون'، جلد 7، شمارہ 75، اگست 1972
9. 'آہنگ' گیا، شمارہ 4، میں دیکھیے شمس الرحمٰن فاروقی کا خط شفیع جاوید کے نام۔
10. 'شب خون'، جلد 7، شمارہ 77، اکتوبر 1972

نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت

1950 کے آس پاس کا دور اردو غزل گوئی کی تاریخ میں ایک اہم دور تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس وقت غزل گو شعرا اپنی روایت کے مقابلے میں فکر و فن کی نئی شمعیں روشن کر رہے تھے۔ یہ وہ دور تھا جہاں نظم اپنے عروج پر پہنچنے کے بعد دھیرے دھیرے اس کی مقبولیت کم ہونے لگی تھی پھر بھی نظم و غزل کے درمیان تصادم کا ماحول گرم تھا۔ نظم کے طرف دار غزل کو معتوب ٹھہرا رہے تھے، غزل کے میدان کو فرسودہ اور پامال قرار دینے پر آمادہ تھے اور ایک غزل گو کی حیثیت بقول جگر ''شاعر نہیں ہے وہ جو غزل خواں ہے آج کل'' کے مصداق تھی۔ جب کہ غزل کے شیدائی نظم کے معائب ان لفظوں میں گنوا رہے تھے کہ نظم میں خیال کی افراط اور موضوع کا پھیلاؤ تاثر کو غارت کر دیتا ہے، لہٰذا نظم کے حوالے سے بہتر شاعری کا تصور ممکن نہیں ہے۔ ایسے ماحول سے نبرد آزما ہو کر 'نئی غزل' نے اپنی مضبوط عمارت کی مستحکم بنیاد ڈالی۔ شعرا نے غزلوں کو ایک نئی اور آزاد فضا سے ہم کنار کیا، جسے آگے چل کر اس دور کو اردو غزل کی تجدید واحیا کا حقیقی دور تسلیم کیا گیا۔ اسی 'نئی غزل' کے بنیاد گزار کی حیثیت سے ایک معتبر اور توانا شاعر حسن نعیم تھے لیکن افسوس کہ اس حقیقت کا تجزیہ کیا بھی گیا تو لوگوں نے اس کی طرف کوئی خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ان کی غزلوں کی تہہ داری، تنوع، غنائیت اور توانائی کا ہر سنجیدہ قاری کو قائل ہونا پڑا۔

'نئی غزل' میں حسن نعیم کی انفرادیت ایک توانا لب و لہجے کے شاعر کی حیثیت سے قائم ہے۔ ان کی غزلوں میں غم ذات اور غم کائنات کا ایک حسین امتزاج ہے اور ان غموں سے نباہ کرنے کا تیور بھی۔ صنف غزل اپنے دامن میں پناہ لینے والے سے جس ذاتی تیاگ کا تقاضا کرتی ہے وہ زمانے اور حالات نے حسن نعیم کی ذاتی زندگی سے بڑی شدت اور جبر کے ساتھ چھین لیا تھا۔ حسن نعیم کی زندگی کا ایک بڑا حصہ جس کرب واذیت میں گھر ا رہا، شام الم آکر جس طرح ان کے یہاں ٹھہر گئی تھی اور ان کی زندگی جس طرح پیچیدہ اور ناتواں ہوگئی تھی، ایسی صورت میں ایک انسان کا محرومیوں، ناکامیوں اور حسرتوں میں محصور ہو جانا بعید از قیاس نہیں تھا لیکن حسن نعیم کے سر پر لاکھ ہوائے ستم چلتی رہی پر انھوں نے قلب ونظر اور فکر و احساس کو ناتوانی کی زد میں کبھی آنے نہ دیا۔ اپنی زندگی میں غم وآلام کا استقبال کرتے ہوئے جس ہمت اور صحت مندی کا احساس ان کے دل میں جاگتا رہا اسے ہی وہ اپنی غزلوں کے قالب میں تاعمر ڈھالتے رہے:

ہے وہی شاعر جو ساز زندگانی پر نعیم
فکر کا نغمہ سنائے دل کا افسانہ کہے

جب لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلفِ خیال
یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

جن قارئین و ناقدین نے حسن نعیم کی غزلوں کا مطالعہ کیا ہے اور جو کچھ لکھا ہے ان کے خیال میں طرح طرح کی آرا ملتی ہیں۔ کوئی کہتا ہے حسن نعیم نئی غزل کا دانشور ہے، کسی کا خیال ہے حسن نعیم نئی غزل کے ایک توانا لب و لہجے کا شاعر ہے، کسی کا ماننا ہے کہ حسن نعیم نئی غزل کے پیش رو شاعر ہیں، کسی کی رائے ہے کہ حسن نعیم نئی غزل کا پہلا ماڈل شاعر ہے، تو کسی نے حسن نعیم کو نئی غزل کا امام وقت قرار دیا ہے لیکن حسن نعیم کی شعری شخصیت کا معیار قائم کرنے کے لیے ان کی غزلیں ناقدین سے ابھی بھی بحث کا تقاضا کرتی ہیں۔ وجہ ظاہر ہے کہ حسن نعیم کی غزلوں کے تعلق سے اب تک پرچوں اور مرتب شدہ کتابوں کے مضامین میں جتنا لکھا گیا ہے وہ بہت ہی کم ہے۔ اسی لیے حسن نعیم کی غزل گوئی کا حتمی معیار اب تک قائم نہیں ہوسکا ہے۔ ایک اچھے فن کار کے فن کا حتمی معیار قائم کرنے کے لیے ناقدین کو اس فن کار کے فن پر

برسوں ذہن کھپانے پڑتے ہیں، تب جا کر منفرد ذہن کی آرا سے کسی ایک نتیجے پر پہنچنا ممکن ہو پاتا ہے۔ غالب یا میر کی شخصیت نے اردو شعر وغزل میں آج یونہی اعتبار حاصل نہیں کرلیا ہے۔ ان پر مختلف نمبر نکالے گئے، مختلف کتابیں ترتیب دی گئیں۔ ان کے عہد اور معاصرین کا مطالعہ کیا گیا۔ ان پر مختلف سیمینار منعقد کیے گئے۔ تفہیم غالب یا تفہیم میر جیسی تشریحاتی کتابوں سے ان کی غزلوں کو سمجھا گیا اور یہ سلسلہ نہ صرف ماضی میں بلکہ تا حال جاری وساری ہے۔ کسی بھی ادب کا ایک معتبر فن کار جب اپنے پیچھے بیش قیمت ادبی سرمایہ چھوڑ جاتا ہے تو اس ادب کے قارئین اور ناقدین پر ایک بڑا فرض عائد ہوجاتا ہے کہ وہ اس فن کار کے فن کے ساتھ انصاف سے کام لے۔

حسن نعیم 'نئی غزل' کے ایک ایسے شاعر ہیں جن کی غزلوں میں بقول شخصے ''انسانی تعلقات کے پیچیدہ نفسیاتی مطالعے اور اپنے گرد وپیش کے نہایت دلآویز اور گہرے مشاہدے'' ملتے ہیں۔ ان کی تہہ دار غزلوں کو سرسری مطالعے سے سمجھنا آسان نہیں۔ ایک اچھا ادب یوں بھی ہر پل ادب وسنجیدگی کا تقاضا کرتا ہے۔ صرف اتنا کہہ دینا کہ ان کی غزلیں ان کے معاصرین سے مختلف ہیں اور حسن نعیم اپنے معاصرین میں اپنا ایک الگ انداز رکھتے ہیں، قطعی کافی نہیں۔ ان کی غزلیں قدم قدم پر اس بات کو منکشف کرتی ہیں کہ شاعر کا دماغ ایک باخبر اور دانشور انسان کا دل ودماغ ہے۔ ان کے شعروں میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاعر اپنی کھوئی ہوئی بساط کی جستجو میں کروٹیں پر کروٹیں لے رہا ہے۔ ان کا کلام ایک ذہین قاری کو معنی ومفاہیم کے مختلف الجہات گوشوں کو سمیٹنے پر آمادہ کردیتا ہے۔ کیوں کہ ان کے الفاظ کے تخلیقی استعمال سے ان کے طرز بیان میں ایک جہانِ معنی سمٹ آیا ہے۔

'نئی غزل' میں گہرے فکر وشعور کی لے پر کافی مباحثے ہوتے رہے ہیں۔ حسن نعیم کی غزلوں میں روایت کی طرح بوجھل فکری فضا کی جگہ زندگی کی آزاد اور کھلی ہوئی فضائیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ انھوں نے منطقی استدلال اور نتیجہ خیزی کی جگہ جذباتی تاویلات اور شاعرانہ توجیہات پر زور دیا ہے۔ یہ بات سچ ہے کہ غزل خالص فکر کی متحمل نہیں ہوسکتی بلکہ فکر وجذبہ کے خوش گوار امتزاج سے ہی ایک اچھی غزل پیدا ہوتا ہے۔ حسن نعیم کے یہاں یہ فکری وفنی تہہ داری جسے بزرگوں نے غزل کے اندر نشتر سے تعبیر کیا ہے، آپ جتنی بار پڑھیں گے ایک

کھلی فضا کا احساس ہوگا۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار کی توضیح پر غور کیا جاسکتا ہے:

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

یہاں کوئی نہیں کہہ سکتا کہ آخر انتظار کس چیز کا ہے۔ اس شعر میں تذبذب کی فضا ہر جگہ قائم ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسی تمام کیفیت میں یہ شعر ایک معنی قائم کرسکتا ہے۔ لفظوں پر غور کیجیے تو کوئی بھی لفظ لغت میں دیے ہوئے حقیقی معنی کا سراغ نہیں لگنے دیتا۔ بلکہ ہر لفظ معنی کے نئے امکانات کی طرف رواں دواں معلوم ہوتا ہے۔ دوسرا شعر دیکھیے:

وحشت سرائے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی
دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی شے ہے جس سے دل اور دماغ کا رشتہ قائم نہیں ہو پارہا ہے۔ کیا کوئی روحانی تصور ہے۔ کیا یہ کسی عقیدے کی کشش کا شعر ہے۔ کیا یہ مادی محبوب کے بارے میں ہے۔ کوئی بات وثوق سے کہی نہیں جاسکتی۔ لیکن شعر ذہن و دماغ کو جھنجھوڑنے لگتا ہے۔ ذہن کو وحشت سرائے کہنا بے پناہ افکار کی لو دے رہا ہے۔ 'وہ بھی' کے دو الفاظ کسی سے اتھاہ محبت کا پتا دیتے ہوئے بھی حاشیے پر جا کھڑا ہوتا ہے۔ پھر دل اور دماغ کی پرانی بحث یا روایتی بحث بھی یہاں موجود ہے۔ ایسے کتنے ہی اشعار دیکھے جاسکتے ہیں، مثلاً:

بہار باغِ تمنا ہے آرزو مندی
وگرنہ چشمۂ ویراں ہے، دیدۂ تر بھی

میں کہاں ہوں مری چادر میں ہیں کتنے موسم
تو بھی مانندِ کفِ خاک اٹھے تو دیکھے

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

دیکھنا ہے ظرفِ رنداں زہر پیتے ہیں کہ مے
موجِ خوں بھی چشمِ ساقی میں ہے میخانہ بھی ہے

جوئے رواں کے پاس ہے سویا ہوا کوئی
جھولی میں زادِ راہ نہ منزل کی گرد ہے

تڑپا قفس میں کون جو اے صبحِ نوبہار
روئے گل و گیاہ صبا چشمِ تر گئی

میں ایک باب تھا افسانۂ وفا کا مگر
تمھاری بزم سے اٹھا تو اک کتاب بنا

کیا بساطِ خار وخس تھی پھر بھی یوں شب بھر جلے
دوش پر بادِ سحر کے دور تک شعلہ گیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا

وہی شباہت وہی ادائیں مگر وہ لگتا ہے غیر جیسا
نعیم یادوں کی انجمن میں نہ جانے کس کو پکار لائے

حسن نعیم کے ایسے اشعار پر بحث کرتے ہوئے پروفیسر وہاب اشرفی فرماتے ہیں:

''حسن نعیم کی غزلیں ایک طرف تو کلاسیکی بج دھج سے اپنا رشتہ قائم کرتی ہیں تو دوسری طرف عصری رجحانات کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔ اس لیے ان کی غزلیں ہر دو صفحوں پر اپنا ایک واضح معیار قائم کرتی ہیں۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ حسن نعیم لفظوں کے طلسم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ تخلیقی سطح پر انھیں نئے معنوی آفاق تک لے جاتے تھے۔ یہ صورت ان کی غزلوں کے

نئے امکانات کا پتا دیتی ہیں... لفظوں کو تخلیقی جہات بخشنے میں (حسن نعیم)
اپنے معاصرین میں خاصے نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔‘‘[1]

اس بات میں شک نہیں کہ حسن نعیم غزل کے ایک بڑے رمز شناس تھے۔ وہ غزل کی دیرپا اور مستقبل کی قدروں سے واقف تھے۔ غزل کی تہذیب جس زبان اور مزاج کا تقاضا کرتی ہے اس کا انھیں بھرپور احساس تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعروں میں جہانِ معنی آباد ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی حسن نعیم کے پہلے مجموعۂ غزل ’اشعار‘ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ’’میر کی عظمت کی بنیاد انھی نشتروں (تہہ داری) پر رکھی گئی ہے اور غالب نے ناسخ پر آتش کو اسی بنیاد پر ترجیح دی تھی۔ اگر غزل میں ایسے نشتروں کا وجود نہیں تو اس کا کیا ہوگا۔ اس کو پڑھنے کی پھر نوبت نہیں آئے گی۔ بار بار اس شعری مجموعہ کو پڑھا جاتا ہے، جس کے شعر بار بار پلٹ کر آپ کو پکارتے ہیں۔ آپ جتنی بار اسے پڑھتے ہیں ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالب نے اپنے اشعار کو انھی معنوں میں تہہ دار اور پہلو دار کہا تھا اور میر نے اپنے معاصرین کو اپنے مقابلے میں ’ناطمان بے تہہ‘ سے تعبیر کیا تھا۔ غزل کی یہی واحد کسوٹی ہے۔ باقی سب اصطلاحات اسیران تغافل ہیں۔‘‘[2]

مستقل تازہ خیالی اور تازہ گوئی حسن نعیم کا خاص جوہر ہے۔ ایسا ہنر ہر کسی شاعر کو نصیب نہیں ہو جاتا۔ حسن نعیم نے میر، غالب اور یگانہ کی راہ پر چل کر غزل کے کینوس کو تازہ وسعت سے ہمکنار کیا ہے۔ ان کی غزلوں میں جتنی وسعت اور تنوع ہے اس کا احاطہ آسانی سے کر پانا مشکل ہے۔ ان کی غزلوں میں تکرار نہیں ملتی۔ ہر خیال، تجربہ، ترکیب اور نفسیاتی کیفیت اپنے نئے رنگ میں ابھر کر سامنے آتی ہے۔ ہر شعر میں ایک تازہ خیال ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے پاس کہنے کو ابھی بہت کچھ باقی ہیں۔ توانا لہجہ، بامعنی بنیاد، اظہار اور تخلیقی ربودگی یہ وہ عناصر ہیں جن سے حسن نعیم کی غزلوں نے اپنے لب و لہجے کی شناخت قائم کی ہے۔ ان کے یہاں جدید تر لب و لہجے کی گھن گرج کے مقابلے میں فکر کی سبک خرامی اور اظہار کی آب دار نرم روی کلیدی حیثیت رکھتی ہے۔ شعری روایات کے گہرے ادراک کے باوصف حسن نعیم کی شاعری میں عصری صداقتوں کا نہایات معنی خیز اظہار ہوا ہے۔ شکست خوردگی کے مقابلے میں

ان کے یہاں امید کی کرنیں ہر جگہ حاوی نظر آتی ہیں۔ تہذیبی اقدار کی پامالی، فرد کے مابین تصادم، اور کردار کی شتی ہوئی اہمیت کی بحالی کا عزم ان کی شاعری میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ اس تازہ شعور کا اضافہ جو حسن نعیم کا نمایاں اسلوب بھی ہے، جدید اردو غزل میں ہی نہیں بلکہ پوری اردو غزل میں ایک تاریخ ساز حیثیت کا حامل ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے حسن نعیم کے الفاظ کے تخلیقی استعمال اور اس کے ذریعے شعروں میں تہہ داری ومعنی آفرینی کو ان کے فن کا بنیادی پتھر بتایا ہے۔ بیشک حسن نعیم کو اپنے اس ہنر پر ناز بھی تھا۔ بے تہہ تجربے کی چونکا دینے والی کرتب سازی کے وہ قطعی قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جس قسم کی شاعری کو بعض نقاد نے جدید شاعری کہہ کر فروغ دیا اس کو حسن نعیم کی سنجیدہ مزاجی نے کبھی قبول نہیں کیا۔ رمزکاری ان کی غزلوں میں خوب پائی جاتی ہے جس کے سہارے انھوں نے اظہار ومعنی کی تہہ داری میں جادو جگا دیا ہے۔ حسن نعیم کی اس خصوصیت کو ڈاکٹر یوسف حسین خان نے مومن سے مشترک بتایا ہے۔ لیکن بانی لکھتے ہیں:

> ''میرے خیال میں قبلہ موصوف (یوسف حسین خان) نے (حسن نعیم کی) رمز شناسی کے باب میں ٹھوکر کھائی ہے۔ مومن کے یہاں رمز نہیں بلکہ جذبے کا اشاراتی اسلوب ملتا ہے۔ تہہ داری کے مقابلے میں پیچ دار کنایہ دکھائی دیتا ہے۔ میرے نزدیک رمزکاری کا ہنر تفکر کے وسیلے سے پیدا ہوتا ہے۔ شاعر تفکر کو واضح فلسفہ نہ بنانے کی غرض سے رمزکاری کا سہارا لیتا ہے جیسا کہ غالب نے کیا۔ نعیم کی رمزکاری بڑی حد تک غالب سے متاثر ضرور ہے لیکن نعیم نے غالب سے بچ نکلنے کا خوب صورت راستہ بھی تلاش کرلیا۔ وہ یہ کہ بلا واسطہ اظہار کے ذریعے شعری احساس کا رخ تلمیحات کی طرف موڑ دیا۔ اس طرح رمز اور تہہ داری پر نعیم کی گرفت مضبوط ہوتی چلی گئی۔''[3]

اپنے بیان کے حوالے کے طور پر بانی نے ذیل کے چند اشعار بھی پیش کیے ہیں:

کس کو کیا دیتا یہاں حصہ مرا ہی کیا تھا
آسمانوں سے تہہ سنگ گرا ہی کیا تھا

کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسن
برگِ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا تھا

حیراں ہے برگِ سبز جو سائے میں اس طرح
گم صم کھڑا ہوا کوئی صحرا نورد ہے

مرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیم
سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

دانشوروں کی قحط میں سید حسن نعیم
بیدل کی باولی پہ لگائیں سبیل کیا

حسن نعیم کی غزلوں کا عصری آگہی کے حوالے سے مطالعہ کیجیے تو ان کے اشعار ہر جگہ ان کی ذات اور کائنات پر مسلط نظر آتے ہیں۔ اردو غزل میں عشق کا موضوع ایک کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر زمانے میں شعرا نے اس موضوع کو نبھانے کی کوشش کی ہے۔ لیکن 1950 کے بعد جو نئی صورت ابھر کر سامنے آئی وہ ہمارے غزل کے باب میں بڑی انوکھی اور ہنگامہ خیز مانی جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہاں عشق اور محبوب دونوں ایسی کیفیتوں سے دوچار ہیں جہاں روایتی آدابِ عشق اور آدابِ غزل دونوں ہی موجودہ آدابِ زندگی کے سامنے بازیچۂ اطفال بن کر رہ گئے ہیں۔ آخر ایسا کیوں؟ اس کی تفصیل میں جانے پر اصل حقیقت ہمارے سامنے کھل کر آتی ہے۔ یہ وہ عہد ہے جہاں انسان ہجومِ روزگار سے پریشان ہے یا یوں کہہ لیجیے کہ کائنات کے دیگر لوازمات اتنے بکھر گئے ہیں کہ انسان کے پاس اتنی فرصت اور سکون نہیں جو لوازماتِ عشق کی نزاکتوں کو برداشت کر سکے۔ یہی وجہ ہے کہ حسن نعیم کے عشق کے اندر روایتی عاشقوں کی طرح شدت اور بے سروپائی نہیں ملتی۔ ہاں، مگر اس پیمان کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا کرب ضرور محسوس ہوتا ہے۔

سائنس اور ٹیکنالوجی کے زیرِ اثر جو مادہ پرستی، اصراف پسندی، انتشار اور تنہائی سماج میں سرایت کر گئی اس کے سبب انسانی تعلقات میں ایک انقلاب سا برپا ہو گیا۔ فرد کی آزادی پر زور

دینے ۔سے انسانی تعلقات اور مشترکہ خاندان ٹوٹنے اور بکھرنے لگے۔ ہمارے یہاں مغرب زدہ جنسی آزادی اور بے راہ روی سے سماج میں عریانیت راہ پانے لگی۔ عورت اور مرد کے درمیانی رشتے اور گھریلو ماحول میں کشیدگی آگئی۔ جگہ جگہ نمائش گاہ اور جم خانے کے فروغ سے جنسی کشش میں خلل پیدا ہوگیا۔ ایسے میں ایک عاشق کا اپنے محبوب کے سامنے سرتسلیم خم کیے کھڑا رہنا ایک لایعنی اور مہمل فعل بن کر رہ گیا اور ایک عاشق کی محبت جنسی ضرورت کی حد تک محدود ہوکر رہ گئی۔ لیکن ساتھ ہی فن کاروں میں اپنے اقدار کی پامالی کا احساس بھی تلاش کیا جاسکتا ہے:

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریک خواب بنا

(حسن نعیم)

تو کون ہے تیرا نام کیا ہے
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

(ناصر کاظمی)

سائے کو سائے میں گم ہوتے تو دیکھا ہوگا
یہ بھی دیکھو کہ تمھیں ہم نے بھلایا کیسا

(سلیم احمد)

کرتے ہیں یاد اب تک بیتی ہوئی بہاریں
آنکھوں سے چومتے ہیں اک ایک پنکھڑی کو

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

آگے آگے کوئی مشعل سی لیے چلتا ہے
ہائے کیا نام تھا اس شخص کا پوچھا بھی نہیں

(شاذ تمکنت)

نہ جس کا نام ہے کوئی نہ جس کی شکل ہے کوئی
اک ایسی شئے کا کیوں ہمیں ازل سے انتظار ہے

(شہریار)

تری تلاش میں کیا کیا نہ مرحلے آئے
ہر ایک راہ کہیں اور جانکلتی تھی

(مظفر حنفی)

مہتاب نے اتار دیا ہے لباس شب
افسون انتظار کے اسرار دیکھنا

(مظہر امام)

میں گھر سے جب چلا تو کواڑوں کی اوٹ سے
نرگس کے پھول چاند کی بانہوں میں چھپ گئے

(بشیر بدر)

ترا اقرار بھی ہم ترا انکار بھی ہم
جتلا کوئی ہو ایسے عذابوں میں کہاں

(مخمور سعیدی)

حسن نعیم کے یہاں تہذیب عشق کے پارہ پارہ ہونے کا کرب ذیل کے ان اشعار میں محسوس کیجیے:

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم
چاند کا آئینہ خانہ بادلوں کا گھر بھی تھا

رشکِ مہتاب ہے اک داغ تمنا کب سے
دل کا نظارہ کرو آ کے سرِ شام کبھی

یہ بھی تسلیم کہ تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے
تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

مجبوریاں بہت تھیں دستِ وفا طلب کی
دامن پکڑ کے ان کا چھوڑا ہے اپنے ڈر سے

دل کو اب بھی ہے یہی وہم کہ مجھ سے چھپ کر
پیچھے پیچھے مرے وہ جانِ وفا چلتی تھی

کس گھڑی کون سی وحشت میں کرے مجھ کو شریک
عشق کی ایک اسی بات سے جی ڈرتا ہے

میں اس کے جسم کی بیکل پکار سن بھی چکا
اب اس کی آنکھوں میں رکھا ہے کیا فسوں کے سوا

حسن کیوں ایک ہی خلوت میں گرفتار رہے
عشق جب اپنی روایات میں ہرجائی ہے

کٹی وہ زلف تو رشتہ کٹا روایت سے
دل و دماغ میں اب بوئے عنبریں بھی نہیں

تنہائی جدید میکانکی سماج اور مشینی معاشرے میں ایک کلی صداقت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس تنہائی کی تشریح کرتے ہوئے کہا گیا کہ آج کا سماج چہار سو اس قدر مصروف کار نظر آتا ہے کہ ہر فرد ہزاروں کی بھیڑ میں رہ کر بھی تنہائی محسوس کرتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسانوں نے جس قدر سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کی ہے، کمپیوٹر، انٹرنیٹ، ہوائی جہاز وغیرہ جیسے جدید آلات کی ایجاد نے دنیا کو ایک محدود خانے میں تبدیل کردیا ہے۔ یہ دنیا بالکل سمٹ سی گئی ہے اور انسان اس قدر بکھر گئے ہیں کہ ایک پل بھی اسے چین نصیب نہیں۔ تنہائی کا موضوع ہمارے کلاسیکی ادب میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ لیکن کلاسیکی تنہائی کا خلاصہ یہ تھا کہ راہ نجات حاصل کرنے کے لیے انسان، انسانوں کے ہجوم سے کٹ کر جنگل، مسجدوں، مندروں اور خانقاہوں

کی راہ لیتا تھا اور وہاں اپنی گم شدہ زندگی کے اصول و اقدار کی جستجو کیا کرتا تھا۔ گویا تنہائی کا مقصد صرف اور صرف اخلاقی اور روحانی قدروں کی سالمیت کے لیے ہوتا تھا۔ لیکن آج کے معاشرے میں تنہائی زندگی کی مرکزیت کا لازوال حصہ بن چکی ہے۔ اس کے نتیجے میں ہمارے آج کے معاشرے میں انسانوں کے اندر دکھ، درد، ناامیدی، اجنبیت و بیگانگی، خوف و دہشت، بوریت و بیزاری اور تشویش و تردد جیسی بیماری نے گھر کرلیا ہے۔ جدید غزل کے شاعروں نے اس تنہائی کو مختلف زاویوں سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں ذیل کے اشعار میں محسوس کیا جاسکتا ہے:

ان کے کوچے میں بسا میں کہ پھرا شہر بہ شہر
در بہ در ساتھ پھرا درد غریب الوطنی

(حسن نعیم)

بین کرتی ہے دریچوں پہ ہوا
رقص کرتی ہے سیہ پرچھائیں

(سلیم احمد)

کچھ دور پر بگولوں کی افواج ہیں کھڑی
کوئی بھی شہر میں نہیں کس کو خبر یہ دوں

(شہریار)

دل تو میرا اداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

(ناصر کاظمی)

لرز جاتا تھا باہر جھانکنے سے اس کا تن سارا
سیاہی جانے کن راتوں کی اس کے در پہ رکھی تھی

(بانی)

ہر دوراہے پر وہی بھیڑ تھی تنہائی کی
میں بھی اس بھیڑ میں شامل تھا اکیلا کب تھا

(مظہر امام)

لمبی سڑک پہ دور تلک کوئی بھی نہ تھا
پلکیں جھپک رہا تھا دریچہ کھلا ہوا

(محمد علوی)

اس تنہائی سے بیزار ہوکر جدید تر شعرا اپنی پناہ گاہ کبھی اپنے دل میں تلاش کرتے ہیں تو کبھی خوابوں اور یادوں کی دنیا میں کھونا بہتر سمجھتے ہیں۔ ہر شخص کے اندر اس تنہائی کے علاج کے لیے حیرانی ہے۔ یہ پریشاں رنگ دیکھیے:

آ مرے پہلو میں مرے جذب کا مرکز بن جا
میں بھی اک غم سے ہوں آزردہ و تنہا کب سے

(حسین نعیم)

عمر بھر مصروف ہیں مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام

(خلیل الرحمن اعظمی)

کچھ نہ کچھ تو ساتھ اپنے یہ سفر لے جائے گا
پاؤں میں زنجیر ڈالوں گا تو سر لے جائے گا

(بانی)

اس اکیلے پن کے ہاتھوں ہم تو فکری مرگئے
وہ صدا جو ڈھونڈتی تھی جنگلوں میں کھوگئی

(پرکاش فکری)

بجز لاحاصلی کیا اور بام و در پہ رکھا ہے
دیا بے منظری کا طاق ہر منظر پہ رکھا ہے

(فضا ابن فیضی)

نہ شاخ ہوں نہ شجر جانے کس لیے شب بھر
خزاں کے خواب دکھاتی رہی ہوا مجھ کو

(ظفر اقبال)

یہی تنہائی ہے جس کے سبب انسان کو انسان کی قربتیں حاصل کرنا ایک کارمحال بن گیا ہے:

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا

(حسن نعیم)

اب کسی میں اگلے وقتوں کی وفا باقی نہیں
سب قبیلے ایک ہیں اب ساری ذاتیں ایک سی

(منیر نیازی)

ہر آدمی میں ہوتے ہیں دس بیس آدمی
جس کو بھی دیکھنا ہو کئی بار دیکھنا

(ندا فاضلی)

یہ جو ذات ذات کا ہے سفر کہاں ختم ہو نہیں کچھ خبر
کوئی دوسرے سے پرے ہے تو کوئی اپنے آپ سے دور ہے

(من موہن تلخ)

اپنے معاشرے کے ٹوٹنے اور بکھرنے کا احساس جدید شعرا میں شدت سے محسوس کیا جاتا ہے۔ ہر قدم پر شعرا رک کر سوچنے پر مجبور ہے کہ آخر ایسا کیسے ہوتا جارہا ہے۔ اس کی وجہ تلاش کرتے ہوئے اپنی پرانی طرز روش کی پناہ گاہ میں جا چھپتے ہیں۔ کیونکہ انھیں احساس ہو رہا ہے کہ ہم اپنے اسلاف کے نقش قدم کو بھلا دینے کا خمیازہ آج بھگت رہے ہیں۔ لہٰذا اپنی قدیم اجتماعیت اور بھائی چارگی کی بحالی اور حال پر ثبت کرنے کے لیے ان کی تڑپ کا اندازہ ان شعروں میں کیا جاسکتا ہے:

کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں ان کی خوشبو کے سوا
صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لے کر چلے

(حسن نعیم)

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس
جانے یہ کون ہے؟ میں ایسا تھا؟ یہ میں تو نہیں

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

ہر موڑ پہ اپنی ہی نفی کرتے ہوئے میں
ہر سمت وہ آواز لگاتا ہے کہ میں ہوں

(مظفرحنفی)

ایک تنکے کی طرح ہیں ہم لوگ
وقت کے بہتے ہوئے دریا میں

(محمد علوی)

میں نے ہی ماضی کی تربت پہ جلائے ہیں چراغ
میں مجاور حال کا ہوں حجرۂ فردا میں ہوں

(مظہرامام)

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا کوئی

(شکیب جلالی)

'نئی غزل' میں اپنی ذات کا تصادم بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ یہ تصادم مادّیت اور روحانیت، ماضی حال اور مستقبل، روح اور جسم، حقیقت اور مجاز جیسے وسیلے سے دیکھنے کو ملتا ہے۔ اپنی ذات کا یہ کرب محض اس بات کا پتا دیتا ہے کہ وہ کسی نئی ذات کی تلاش میں نکل کر باہر جانا چاہتا ہے جس سے ایک نئے انسان کی تخلیق ہو سکے اور جس کے ذریعے موجودہ سماج سے انتشار، بیزاری اور تشویش وتر ڈد کا خاتمہ ہو سکے۔ وزیر آغا ذات کے اس کرب کو خوش آئند مستقبل تصور کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''درخت کی بیرونی چھال ہر جگہ سے تڑخ سی گئی ہے۔ اس لیے نہیں کہ درخت کسی روگ میں مبتلا ہے بلکہ اس لیے کہ موسم بہار کا پیغام پاتے ہی اس کے اندر ایک نئی اور تازہ چھال ابھرنے لگی ہے جو اپنے زورِ نمو سے باہر کی چھال کے ٹکڑے ٹکڑے کر رہی ہے۔''[4]

'نئی غزل' کا یہ مثبت رویہ غزل کے روشن مستقبل کی بشارت دیتا ہے۔ جس میں پل پل بدلنے والے رجحانات کو قبول کرنے کی صلاحیت موجود ہے:

عجز ہے سازِ نظر کا ورنہ شب کے دو بہ دو
دور تک پھیلا ہوا ہے روشنی کا سلسلہ

(حسن نعیم)

خلا کی سرد سلوکی مری زمیں میں نہیں
رہی نہ روح تو میں خاکِ خوش نما ٹھہرا

(حسن نعیم)

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

ہوا کی سخت فصیلیں کھڑی ہیں چاروں طرف
نہیں یہاں سے کوئی راستہ نکلنے والا

(ظفر اقبال)

دکھا کے لمحۂ خالی کا عکسِ لاتفسیر
یہ مجھ میں کون ہے مجھ سے فرار کرتے ہوئے

(بانی)

وہ برابر پیش قدمی کرنے والا کون تھا
پے بہ پے میرے لیے پسپائیاں، میں کون ہوں

(مخمور سعیدی)

تہ نشیں ہوجائیں گی پل بھر میں ساری صورتیں
سطحِ آئینہ پر اک عکسِ دگر رہ جائے گا

(سلطان اختر)

میں اپنے جسم سے غائب رہا کرتا تھا یا حیرت
وہ کوئی دوسرا تھا جو مرے پیکر میں رہتا تھا

(مظفر حنفی)

اپنے دور کی دہشت نا کی سے خوف زدہ اور بدظن ہوکر جدید شعرا اپنی ذات کے تحفظ کے لیے اپنے ماضی کے خوابوں اور یادوں کی دنیا میں پلٹتے ہیں جہاں ان کی پریت کے مستحکم دھاگے چھوٹ گئے ہیں۔ شعرا انھی دھاگوں میں دور جدید کے انتشار، کشمکش اور کرب کو گوندھنا چاہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید شعرا اپنے پیش روؤں کے عشق و محبت، بزرگوں کے نقش قدم، اپنی پرانی دیہی فضائیں اور اساطیری حوالوں سے رشتہ جوڑنے کی کوشش کرتے نظر آتے ہیں۔ حقیقت تو یہی ہے کہ زندگی نہ تو صرف حال کا نام ہے، نہ ماضی کا اور نہ مستقبل کا بلکہ حقیقی زندگی تو وہی ہے جس میں تینوں عہد کا شعور حاوی ہو اور ان شعور کے ذریعے زندگی کے گوشوں سے مثبت رویے نکال کر انسانیت کی بحالی کی جائے:

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی
دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی

(حسن نعیم)

کہرے میں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ دکھائی دے

(حسن نعیم)

جانے میری آنکھوں نے کس کا خواب دیکھا ہے
راستے میں پھولوں کے خوشبوؤں کا زینہ ہے

(محمد علوی)

ترا خیال تھا لپٹا ہوا دھندلکوں میں
سمندروں کا سفر تھا ہوا برہنہ تھی

(مظہر امام)

خشک پتوں کو چمن نے یہ سمجھ کر چن لو
ہاتھ پھر شادابی رفتہ کی نشانی آئی

(مخمور سعیدی)

حدِ جبریل سے آگے ہیں مرے نقشِ قدم
کیوں دہکتا ہوا سورج مری منزل ٹھہرے

(منیر نیازی)

ہم سے پہلے زمینِ شہرِ وفا
خاک تھی کیمیا ہمیں سے ہوئی

(ناصر کاظمی)

تم ہی صدیوں سے یہ نہریں بند کرتے آئے ہو
مجھ کو لگتی ہے تمھاری شکل پہچانی ہوئی

(عرفان صدیقی)

بیتے لمحے دھیان میں آکر مجھ سے سوالی ہوتے ہیں
تو نے کس بنجر مٹی میں امن کا امرت ڈال دیا

(شکیب جلالی)

یہ عہد ایسا ہے جہاں تہذیبی انتشار، قومی اور بین الاقوامی مسائل اور روزمرہ کے پیچیدہ واقعات نے سر ابھارنا شروع کر دیا ہے جس کے نتیجے میں انسانوں کے اندر نفسیاتی اور اعتقادی کشمکش پھیلنے لگی ہے۔ جذباتی ناآسودگی اور لایعنیت سے ذہنی اور نفسیاتی الجھنیں بڑھنے لگی ہیں۔ آزادی کے بعد تقسیم کو لے کر سماج میں ظلم و جبر اور تشدد کا ماحول گرم ہوگیا۔ ظلم و بربریت اس قدر بڑھ گئی اور انسانیت کا گلا اس طرح سے گھونٹا جانے لگا کہ لوگوں کا مذہب اور ایمان سے بھی اعتقاد اٹھنے لگا۔ لوگ بکھر گئے اور ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب پارہ پارہ ہوکر رہ گئی۔ اس پس منظر میں ناصر کاظمی کی شاعری انڈو پاک کے پورے ماحول کا احاطہ کرتی ہے۔ لیکن دیگر شعرا کے یہاں بھی اس کے شدید اثرات مرتب ہوئے۔ حسن نعیم کے یہاں شدت دیکھیے:

جو اپنی دنیا بسا چکا ہے اسے بھی مشکل کا سامنا ہے
کہاں سے شمس و قمر اگائے کہاں سے لیل و نہار لائے

کس لیے ظلم ہے روا اس دم
جس نے پوچھا وہ پائمال ہوا

پیمبروں نے کہا تھا کہ جھوٹ ہارے گا
مگر یہ دیکھیے اپنا مشاہدہ کیا ہے

روزمرہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات کو موضوعِ شعر بنانا جدید شعرا کا ایک حاوی رجحان ہے۔ ان میں بعض اشعار تو ایسے ہیں جو ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔ ذیل میں حسن نعیم کے ساتھ ان کے معاصر شعرا کے اس رجحان کا احاطہ کیجیے:

کون مجھ سے پوچھتا ہے روز اتنے پیار سے
کام کتنا ہو چکا ہے وقت کتنا رہ گیا

(حسن نعیم)

تو کون ہے تیرا نام کیا ہے
کیا سچ ہے کہ تیرے ہو گئے ہم

(ناصر کاظمی)

اپنے آپ کو خود ہی آنک ادھر اُدھر مت تاک جھانک
کچھ نہ بنے تو بالو پھانک اس کا بھی اک تاؤ میاں

(خلیل الرحمٰن اعظمی)

کسی کی بھابھی کسی کی سالی
غریب کا خاندان کیا ہے

(مظفر حنفی)

بچہ بولا دیکھ کے مسجد عالی شان
اللہ تیرے ایک کو اتنا بڑا مکان

(ندا فاضلی)

خدا اس شہر کو محفوظ رکھے
یہ بچوں کی طرح ہنستا بہت ہے

(بشیر بدر)

'نئی غزل' میں طنزیہ لہجہ بھی خوب ملتا ہے۔ یہ لہجہ حسن نعیم کے یہاں کثرت سے دیکھا جاسکتا ہے لیکن حسن نعیم نے اسے محض روایت اور فیشن کے طور پر قبول نہیں کیا ہے۔ اس لیے کہ حسن نعیم کو اپنی زندگی میں متضاد قوتوں کا سامنا قدم قدم پر ہوتا رہا۔ کبھی کبھی ایسے وقت بھی آپڑے جہاں دوست اور دشمن کی پہچان بھی مشکل ہوگئی۔ ایسے میں غصہ، جھنجھلاہٹ اور بیزاری کا پیدا ہونا بعید بات نہیں۔ اپنی انا اور اپنے طور پر جینے کی طرز روش نے حسن نعیم کی زندگی میں وہ زہر گھولا جس کی دوسری مثال ان کے ہم عصروں میں برصغیر کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں ڈھونڈے نہیں ملتی۔ یہی وجہ ہے کہ طنز حسن نعیم کے یہاں صرف رسمی خانہ پری کے طور پر نہیں بلکہ ان کی زندگی کا حقیقی خلاصہ ہے۔ یوں تو ان کے ہمعصروں میں طنزیہ پہلو، احمد مشتاق، ناصر کاظمی، ساقی فاروقی، شہریار، فضا ابن فیضی، ندا فاضلی، مظہر امام اور بانی وغیرہ کے یہاں بھی مل جاتا ہے۔ منیر نیازی اور مظفر حنفی نے طنز کو خصوصاً اپنی شاعری میں جگہ دی ہے لیکن حسن نعیم کا سا توانا حقیقی اور صحت مند لہجہ ان میں سے کسی کے یہاں نہیں ملتا۔ حسن نعیم کے ذیل کے اشعار ملاحظہ کریں:

میں نہ طوفاں سے جھکا ہوں اور نہ آندھی سے دبا
ان درختوں سے تو اونچا ہوں بلا سے گھاس ہوں

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے ہزار موج غبار لائے

رئیسِ نقد کہاں مجھ کو ڈھونڈتا کہ نعیم
کوئی دکان تھی میری نہ کوئی دفتر تھا

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

مل کے عارف سے اگر بن نہ سکے ہم مومن
ان فقیہوں میں کہاں پھنس کے مسلماں ہوں گے

بندوں نے جب سے کام سنبھالا ہے دہر کا
نازل ہے روز قہر خدا کے بغیر بھی

جن دنوں اخلاص میں تھوڑی سی عیاری نہ تھی
حسن کے دربار میں ثابت وفاداری نہ تھی

کچھ تو اوپر اٹھو گے اپنے سے
حاسدو جل کے راکھ ہو جاؤ

اگرچہ طنز غزل کا مقبول اسلوب نہیں رہا ہے۔ شاید اس وجہ سے کہ تغزل کے لیے جو نرمی اور گھلاوٹ درکار ہے وہ طنزیہ لہجے میں برقرار نہیں رہ پاتی۔ لیکن حسن نعیم نے اس علت سے بہت حد تک اپنا دامن بچالیا ہے۔ دوسرے یہ کہ طنز کے لیے اس سے بہتر صحت مند رجحان اور کیا ہوسکتا ہے کہ مخاطب اپنے حریف سے رنجیدہ تو ضرور ہوتا ہے۔ لیکن اس کے دل میں گرد وغبار کی جگہ اپنے حریف کے لیے روشن گوشے ہوں۔ مثال کے طور پر حوالے کا آخری شعر دیکھیں۔ شاعر اپنے حریف کو (حاسد کو) جل کر راکھ ہونے کی ہدایت کرتا ہے۔ بظاہر اس میں حاسد کی فنا نظر آتی ہے۔ لیکن جو قاری کشت زاری کے اصول سے واقف ہے اس کو راکھ کی زرخیزی کا ضرور پتا ہوگا۔ جو زمین میں پڑے ہوئے دانے کو غذا فراہم کرکے اوپر اٹھاتی ہے اور اس راکھ کے ذریعے دانہ کو تازہ زندگی عطا ہوتی ہے۔ اسے ہی کہتے ہیں 'گر خوار کند مہتر خواری نہ کند عیب'

'نئی غزل' کے ابتدائی دور میں شعرا کے سامنے ترسیل و ابلاغ کا مسئلہ آ کھڑا ہوگیا اور ایک عرصے تک ہماری جدید تنقید میں ترسیل کی ناکامی کا المیہ موضوع بحث بنا رہا۔ اس کا نتیجہ

یہ ہوا کہ الفاظ و معنی کے لیے نئے نئے امکانات کی دریافت جدید تنقید کا دلچسپ موضوع بن گئی اور پھر اپنی تخلیقی ہنرمندی کے ذریعے شعرا نے بامعنی الفاظ کے بہت سے ذخیرے جمع کیے۔

ترسیل وابلاغ کی ناکامی کی کسک حسن نعیم نے یوں محسوس کیا:

دیکھ لوں صورتِ الفاظ تو معنی دیکھوں
آرزو ہے کہ ہر ایک درد کا چہرہ دیکھوں

موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے خلائی سفر سے لے کر زمینی اور اندرونِ زمین کے سفر تک کا بھرپور معائنہ کیا ہے اور تسخیر کائنات میں بڑی کامیابی حاصل کی ہے۔ چاند اور ستاروں کی تسخیر کا جدید شعرا نے خوب خوب مطالعہ کیا ہے۔ حسن نعیم نے اس باب میں اپنے تجربات اور معلومات پر طویل بحثیں کی ہیں۔ حسن نعیم سائنس کے استاد بھی تھے، جدید تر سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ ممالک میں اس کا قریب سے مشاہدہ بھی کیا۔ انھوں نے چاند اور ستاروں کی فطرت کو بہت قریب سے پرکھا ہے اور اپنے شعروں میں نئے نئے معنی کا جادو جگایا ہے۔ سائنسی تحقیق آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت کو شعروں میں سمویا ہے۔ آئن اسٹائن کا نظریہ کہ، جو نظر آتا ہے وہی سچ نہیں ہے۔ مثلاً روز سورج آسمان پر چڑھتا، اترتا اور زمین کے گرد گھومتا دکھائی دیتا ہے۔ حالاں کہ زمین اپنے محور پر گھوم رہی ہے۔ حسن نعیم نے اس نظریۂ اضافیت کو یوں بیان کیا ہے:

مری مژہ پر جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

پھر مریخ کی بازیافت پر یہ شعر:

خلا کے ماتھے پہ ایک بندی نہ جانے کب سے چمک رہی تھی
اسے بھی اپنی زمیں کی خاطر ہوا میں اڑ کر اتار لائے

اور پھر چاند کے بیابان ہونے کی تحقیق کے بعد انسانی وجود کو دیگر ستاروں پر قائم کرنے کی ہوڑ اور اس کا کرب اس شعر میں محسوس کیجیے:

شب کے جنگل میں ہے گم ماہِ تمنا کب سے
ان ستاروں سے پریشان ہے دنیا کب سے

چاند کی ویرانی کا پتا ہونے کے بعد اس کی علامت سے نئے نئے معنی کا جادو ان شعروں میں دیکھیے:

دیکھیے کب تک ملے انسان کو راہِ نجات
لاکھ برسوں میں تو ویراں چاند کا رستہ ملا

مرے آفتاب نے کیا دیا مجھے قربتوں کا صلہ نعیم
ابھی داغ چاند کے دیکھ لو کبھی داغ اپنے دکھاؤں گا

دل کہ اب ہے جسم کا بے آب سا گوشہ نعیم
چاند کا آئینہ خانہ بادلوں کا گھر بھی تھا

اپنے داغوں کو تکا کرتے ہیں تارے شب بھر
چاند بھی اپنے ہی صحرا کا تماشائی ہے

خوشی اور غم کائنات کی فطرت اور انسانی زندگی کے دو اٹوٹ انگ ہیں۔ اگر زندگی اور کائنات سے ان دونوں رنگوں میں سے کسی ایک کا خاتمہ ہو جائے تو پھر کائنات، کائنات نہ ہوگی اور زندگی، زندگی نہ ہوگی۔ اس لیے خوشی اور غم میں سے کسی ایک کا انحراف زندگی کی حقیقت سے انحراف کرنے کے مترادف ہے۔ شاید یہی حقیقت ان ناقدین کے پیش نظر رہی ہے جو وہ یہ کہتے ہیں کہ غم کی جستجو تو شعرا کر لیتے ہیں لیکن اس کا مداوا ان کے پاس نہیں ہوتا۔ للہٰذا ان کے شعروں میں ایک منفی کردار ابھرتا دکھائی دیتا ہے۔ حسن نعیم کی شاعری ناقدین کے اس اعتراض سے بلند و بالا ہے۔ اس لیے کہ ان کے یہاں غم، بے بسی اور مایوسی کا جہاں استقبال ہے وہیں اس سے نباہ کرنے کا ایک توانا تیور بھی موجود ہے۔ حسن نعیم ہر قدم پر غموں کے سامنے مردانہ وار کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں یہ لہجہ ایک اسلوب بن کر سامنے آیا ہے جو اردو غزل کے لیے ایک خوش آیند مستقبل اور راہِ پُر خار سے مردانہ وار گزرنے کا ضامن دار ہے۔ ان کے ہم عصر شعرا کے یہاں بعض شعروں میں اس طرح کا لہجہ ضرور مل جاتا ہے۔ لیکن

حسن نعیم کے علاوہ کسی اور کے یہاں پوری شاعری اس اسلوب سے عبارت نہیں ہے۔
حسن نعیم کے یہاں غم و آلام کے ساتھ ہر شعر میں یہ آواز آپ کو ضرور سنائی دے گی:

وہی طالبِ ضیا ہو جو اٹھائے نازِ ظلمت
وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شامِ غم بھی

حسن نعیم نے جس طرح شعری فکر میں ندرت پیدا کی ہے اسی طرح ان کی شعری تراکیب بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے ہندوستانی مزاج کی علامتوں کو خوب رواج دیا ہے جن کا رشتہ ہماری دھرتی سے جڑا ہوا ہے۔ ہماری اردو شاعری پر بار بار یہ الزام لگایا جاتا رہا کہ اس نے غیر ملکی ماحول کو اپنے اوپر تھوپ رکھا ہے۔ لیکن 'نئی غزل' کی ابتدا کے بعد اس کی رہی سہی ساری شکایتیں دور ہوگئی ہیں۔ حسن نعیم نے ایسی علامتوں میں ہندوستانی رسم و رواج، یہاں کی تہذیب و تمدن، تیوہار، موسم اور تاریخی و اساطیری استعاروں کا بہت خوب صورت استعمال اپنی شاعری میں کیا ہے:

نقش ایسے ہیں کہ شرمائے صنم خانۂ چیں
میری غزلوں میں حسنِ ہند کی رعنائی ہے

مجلسوں کی روشنی ہوں پھر بھی لگتا ہے نعیم
میں کسی گوتم کا دکھ ہوں رام کا بن باس ہوں

یہی وقت سیلِ رواں لیے مری کشتیوں کو ڈبو گیا
کوئی لہر آبِ حیات کی ابھی گنگ میں نہ جمن میں ہے

جب ہوا میں رقص کرتی جارہی تھی اک پتنگ
جانے کس کے دل کا ٹکڑا چھت سے گر کر مرگیا

تو نے چھوڑا تو وہی دل ہے اب ایسا مندر
عود کی بو بھی نہیں نور کا ہالہ بھی نہیں

ہیر کا خواب پریشانی رانجھا سمجھیں
وہ جو چاہیں تو ہر اک عہد کا قصہ سمجھیں

مور کا پنکھ لگا کر وہی ناچے بن میں
جن کو تھا وقت کہ سورج کو بھی سایہ سمجھیں

پاؤں چھو کے نہ نالیو کہ حسن
کوئی صوفی نہ سنیاسی ہے

جس دشت کے مزاج سے گنگا تھی آب آب
اس دشت سے نکالتے نہر جمن کہاں

آج آبادی کا بیشتر حصہ شہروں کی طرف بھاگتا جا رہا ہے۔ گاؤں دیہات کی پھلواری، پرندوں کے نغمے اور چہچہے سب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ گاؤں کے گھر بار، کھیت کھلیان سب سونے پڑتے جا رہے ہیں۔ دیہات میں رہنے والی عورتیں اپنے گھروں میں گھٹ گھٹ کر تنہا زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ وہ رونق اور ہریالی جو کبھی دیہاتوں کی شان تھی ان سب کو نئے زمانے کی نئی اڑان ختم کرتی جا رہی ہے۔ شاعر کا احساس دیکھیے:

دمِ صبح آج ہے دوپہر نہ وہ چہچہے نہ وہ زمزمے
وہ پرندے اڑ کے کہاں گئے کوئی شور گاؤں نہ بن میں ہے

گوریاں اپنی منڈیروں پہ کھڑی ہیں کب سے
جانے کس دیس گئے ناز اٹھانے والے

وہ برا وقت پڑا ہے کہ پرندے روئے
شہر سے لوٹے نہیں دھوم مچانے والے

اٹھ کے چوپال سے کس اور نکل جاؤں نعیم
کھیت ویراں ہیں تو خاموش ہنسانے والے

ان اشعار میں گاؤں دیہات کا جیتا جاگتا ماحول نظر آتا ہے۔ ان میں کرب، گھلاوٹ اور سوز وگداز ہے اور ایک غم خوار کا دستِ شفقت بھی۔ یہاں پرندوں کی علامت میں ایک نئی ہنر مندی دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ پرندے وہ پرندے نہیں جو قفس کی تیلیوں اور نشیمن کے تنکوں سے وابستہ ہوں بلکہ ہمارے سماج کے وہ افراد ہیں جو اپنے جائے وجود کو سرسبز وشاداب بنایا کرتے ہیں۔

ناقدین ادب کا ماننا ہے کہ نئی غزل کی زبان میں وہ تراش خراش، قطعیت و پختہ کاری اور حسن تغزل نہیں جو کلاسیکی غزلوں کی یا غزل کے خالص مزاج کی شان سمجھی جاتی ہے لیکن یہ باتیں ان 'جدید غزل گویوں' کے بارے میں کہی جاسکتی ہیں جن لوگوں نے لفظیات کی توڑ پھوڑ مچا رکھی ہے۔ جس کی اہمیت میری سمجھ میں وقتی ذائقے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی حقیقت حسن نعیم کے پیش نظر تھی جو انھوں نے وقتی طور پر چونکانے والی لفظیات کے اختراع و استعمال سے اپنا دامن بچائے رکھا اور اپنی غزلوں کو اپنے عصر سے ہم کنار کرنے کے باوجود غزل کے طرۂ امتیاز کو برقرار رکھا۔ حسن نعیم کی غزلوں کا مطالعہ کرنے سے اس کی روانی اور نغمگی کا بے ساختہ احساس ہوتا ہے۔ حسن نعیم کا یہ اندازِ تغزل ان کے ہم عصروں میں عنقا نظر آتا ہے۔ ان کے یہاں بیشتر غزلیں ایک ہی موڈ کی ملتی ہیں۔ حسن نعیم نے موسیقی کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بنالیا تھا۔ اس کے زیر اثر انھوں نے نئے نئے الفاظ کی بھی نازکی اور تراش خراش کے ذریعے غزل کے خالص مزاج کو زائل نہ ہونے دیا۔ یہاں تک کہ پیکر تراشی اور علامت نگاری کی سطح پر بھی زبان کے حسن میں کوئی کھردرا پن محسوس نہیں ہوتا۔ حسن نعیم کی پیکر تراشی کے یہ اشعار دیکھیے:

جب مرے آنگن میں اترا مہرِ غم تو شک ہوا
کیا کوئی میرے حوالے کل زمین کرنے لگا

کس کس کو ہم دکھائیں عزائم کے لالہ زار
ہر آشنا کے پاس مصائب کا دشت ہے

ایک وردی پوش نے آنگن کو یوں مقتل کیا
شہر کی آب و ہوا میں اب لہو کی باس ہے

لگی وہ آگ کہ دیوار و در بھی چل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

دیکھنا ہے ظرف رنداں زہر پیتے ہیں کہ مے
موج خوں بھی چشم ساقی میں ہے، میخانہ بھی ہے

حسن نعیم کے یہ محاکاتی پیکر نظر افروز بھی ہیں اور دانش ورانہ بھی۔ ان میں کئی گوشے اور کئی پہلو ہیں جن میں فکر و خیال کا گہرا تاثر قائم ہوتا ہے۔

حسن نعیم کی غزلوں میں روایتی طور پر شعری صنعتوں کا شدید گزر بسر نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ 'نئی غزل' کے دور میں صناعی کو ایک عیب قرار دیا گیا اور بالکل بے باکانہ اظہار کو کمال فن تصور کیا گیا۔ البتہ علامتوں کے معاملے میں ان کے یہاں بڑی شعوری کوششیں ملتی ہیں۔ انھوں نے روایتی علامتوں سے شعوری طور پر پرہیز کیا اور اسی ماحول میں رہ کر نئی علامتیں اختراع کیں۔ ان کے یہاں ذاتی علامتیں، فطری علامتیں، پیچیدہ علامتیں اور دیومالائی یا مذہبی علامتیں ہر طرح کی علامتیں ملیں گی۔ مثالیں ذیل میں دیکھی جا سکتی ہیں:

حسین پھر ہیں رواں کربلا کی سمت حسن
خوشا کہ اب کے نہیں کم حسینی لشکر بھی

(مذہبی)

سب ہیں خلوت میں سوہنی، مریم
کون مرضی سے دیوداسی ہے

(دیومالائی)

زمیں سے پھوٹ پڑا چشمۂ جنوں ساماں
گلے میں سرد پڑی آتشِ قبا تجھ سے

(پیچیدہ)

موسم سیلاب آیا ندی نالا بھر گیا
بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

(فطری)

اردو شاعری میں معرکۂ کربلا کی علامت ایک روایتی مفہوم کی حامل رہی ہے۔ لیکن جدید غزل گویوں نے اس علامت میں مزید تہہ داری، تنوع اور تبدیلی پیدا کی ہے۔ پہلے معرکۂ کربلا کے واقعات کو صرف تلمیح کے طور پر استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن نئے غزل گویوں نے اسے تلمیح سے زیادہ استعارے کی شکل عطا کی ہے۔ یہ استعاراتی اظہار ہی نئی غزل کے نئے پن کا احساس دلاتا ہے۔ نئی غزل میں واقعۂ کربلا کا یہ نیا تخلیقی پہلو 1960 کے بعد ابھر کر سامنے آیا۔ جسے حسن نعیم کے ہم عصروں میں خلیل الرحمٰن اعظمی، شہریار، شاذ تمکنت، محسن زیدی، عرفان صدیقی، ظفر اقبال اور افتخار عارف وغیرہ نے برتا ہے لیکن حسن نعیم کے یہاں معرکۂ کربلا کی نئی علامت میں زیادہ وسعت، شدت اور گہرائی ہے:

جبرِ شبی کا صرف بغاوت علاج ہے
اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے

اسی امید پہ اس کربلا کی خدمت کی
کبھی تو اپنا لہو غنچۂ نمو ہوگا

یاد رکھنا میں بھی ہوں ابن علیؓ ابنِ حسینؓ
کربلا کی شان گویا میرے گھر کی شان ہے

خوش نصیبی سے ہوا ہوں وارثِ سوزِ حسینؓ
ورنہ ماتم کے لیے اک کربلا کس میں نہیں

مثل مشہور ہے 'پرانی بوتل میں نئی شراب بھرنا' حسن نعیم نے بھی اپنی اختراع کردہ لفظیات، اس کی تراکیب، علامتوں اور محاورات کو نئی شراب پلا دی ہے، جو اپنے اندر چھپے ہوئے راز کو ایک جھٹکے کے ساتھ کھول دیتے ہیں اور اسی وقت قاری کے ذہن پر معنی کی نئی

سطحیں ابھرتی ہیں۔ انھوں نے ایک ہی لفظ اور اس کی ترکیب کو جتنی بار استعمال کیا ہے ایک نیا معنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذیل میں الفاظ اور تراکیب کی تفصیلات دیکھیے:

(الف) فارسی اضافتوں (علامت کسرہ) کی مدد سے تشکیل شدہ ترکیبیں

سبوئے فکر، انیس جاں، انیسِ مجبوری، فکرِ آفتابی، مہرۂ قیامت، زلفِ خیال، ملازمِ موسم، مہرِ امکاں، ماہِ تمنا، نگاہِ ابر، برگِ ماضی، صحرائے تمنا، نگاہِ شب، حرفِ جاں، کتابِ جاں، نیاز مندِ جنوں، تحریرِ وقت، موجِ حیا، قریۂ جاں، لباسِ عشق، طرۂ لعلیں، دماغِ دہر، قبلۂ راہ، مدوجزرِ دل، حاسدانِ خوش نگاہ، تہذیبِ نغمہ، ستارۂ ویراں، بہارِ باغِ تمنا، چشمۂ ویراں، مہرِ غم، انیسِ شام، قیمتِ نالہ، شعلۂ امکاں، جوئے قند، رئیسِ نقد، جہانِ امکاں، وادیٔ فن، نگاہِ شعر، نوائے خواب، بوسۂ سحر، لباسِ خاص، وحشت سرائے ذہن، دستِ گماں، نہرِ جمن، خطِ غبار، تہذیبِ قتل گاہ، لعنتِ احساس، ناقدِ چشم گریاں، شامِ تار، حرفِ اضطراب، بامِ خورشید، سرائے خواب، خیمۂ شب، موجۂ اشک، موجِ غبار، خلدِ دانش، شہریارِ وقت، کتابِ نجم، قصبۂ گم نام، دیارِ فکر، لباسِ طنز، گردِ مسرت، وحشتِ جاں، گرمیٔ آغاز، زورِ وحشت، غزالِ شہر، عازمِ صحرا، قیدِ انا، سبوئے شعر، یوسفِ روز، تارِ شب، آبِ آتشیں، سازِ شعلہ، خیمۂ وفا، موجۂ وقت، ضیائے رفتگاں، بادِ امکاں، کوچۂ عقل، آتشِ فن، آتشِ رشک، رگِ احتجاج، افکارِ شب نواز، کشتِ آرزو، حرفِ شنیدہ، خوشبوئے جنوں، زرِ خیال، گرمِ گردش، حرفِ گزارش، موجۂ خون، سنگِ صد زمانہ، دماغِ جدید، پائے دانش، ہنگامۂ خوشبو، ضیائے کاشی، لباسِ شعر، ہوائے سبک، شہزادیٔ خیال، نہرِ ذات، انتظارِ سبزہ، طوفانِ خوں، سازِ ہوا، شعلۂ طلب، ردائے شب، بازارِ جنوں، مرگِ سراب، سامانِ صد چمن، کاروانِ ابر، سرِ خیمۂ وفا آباد، سرائے دل، دشتِ غربت۔

(ب) اردو اضافتوں (کا، کی، کے) کی مدد سے تشکیل شدہ ترکیبیں

قلب و جان کی الماری، عشق کی زمین داری، آندھی کا بونا، کیل کی چادر، آرزو کی باس، یاد کا بجرا، فکر کی بارش، سرکشی کا عہد نامہ، حسن کا علاقہ، لہو کی باس، شب کا جنگل، جذب کا مرکز، لہو کی مستی، مسکن احساس کا دماغ، عزائم کا لالہ زار، مصائب کا دشت، جنوں کا دوست، شجر کا سنگھار، ذہانت کا عدو، عمل کی شہ زوری، آرزو کی راکھ، گلوں کی بستیاں، حرف کے پردے،

آسمان کا جوہر، صدف کی قید، سیپ کا قلب، نور کا ہالہ، اشک رواں کی صورت، خواب کا لہجہ، قصر تمنا کا درجہ، جنوں کا جوہر، یاد کا پھول، غم کا شجر، آنچل کا تار، آس کی لہریں، خموشی کا پیالہ، بطوں کا جوڑا، روح کی برہنہ پائی، غزل کا حرف امکاں، مثنوی کا خواب، مایا کا اصل روپ، نئی کونپل کی پیشانی، جسم کی بیکل پکار، داغوں کا ہار، خلا کے ماتھے، ستم رانوں کا تجسس، خواب کے طوفان، غموں کی دھول، لفظ کی فانوس، امید کی سرحد، بلبلوں کی اذاں، نظر کی آنچ، وحشت کے پھول، جذب کا سراپا، ہوس کا کوچہ، ارمان کا چہرہ، فکر کا سبزہ، عشق کا جھاگ، فریاد کی قسمت، دن کا چہرہ، شب کے ٹکڑے، گلاب کا نوحہ، خیالوں کا قافلہ، خلا کی سرد سلوکی، یاد کی پروائیاں، عہد حاضر کا جنوں، یاد کی آنچ، چاند کا پیکر، کشت آرزو کی پیمائش، دل کے پرزے، خرد کا طوفاں، مصلحت کا لبادہ، ہنر کا ستارہ، سمندر کا خزانہ، لہو کی رسید، افکار کا زینہ، یادوں کے چاند، بادِ سحر کا دوش، گلوں کی وفات۔

(ج) حرفِ عطف (و) سے تشکیل شدہ ترکیبیں

فکر و تماشا، تپاک و مہر، رشک و رقابت، آمد و شد، خار و خس، وداع و آمد، آبشار و چمن، کنج و روش، رنگ و ذائقہ، کشت و صحرا۔

(د) علامت کی شکل اختیار کر لینے والے الفاظ

بازار، قیامت، دریچہ، دریا، گھٹا، سورج، چاند، ستارا، کربلا، حسین، حسینی لشکر، آنگن، مکتوب، پیڑ، در، ڈالی، زمین، فصل، جنگل، طوفان، ثمر، ناگ، ذہن، سرائے، دشت، نجوم، لاش، چراغ، دکان، گنگا، جمنا، چہرہ، صحرا، راکھ، آفتاب، مکان، پرند، سائبان، کہکشاں، کان، وطن، موسم، چھالا، جام، کوہسار، طوفان، موج، غبار، بندی، آب، موتی، سیپ، صرصر، دریا، سیلاب، بگولہ، سمندر، برگ، مہر، خیمہ، کتاب، پتنگ، بحر، کوچہ، شہر، درخت، دھوپ، ابر، سبو، نغمہ، راگ، ساز، شرار، داغ، خورشید، سراب، باراں، اذان، ہوا، جزیرہ، دھنواں، بادباں، پہاڑ، پتھر، سبزہ، شاخ، ببول۔

(ہ) اردو، ہندی اور انگریزی کے ایسے عامیانہ الفاظ کا استعمال جو غزل کے مزاج میں ڈھل گئے ہیں

نگر، ساجن، آشابندھن، نراشا، گلف، لونڈوں، باسی ملنگ، بن، ملن، جوگن، گیان،

تیاگ، منڈیر، چوپال، راگنی، مایا، بن باس، سیش ناگ، بندی، باس، سیانا، دیوداسی، سنیاسی، جنم، اوٹ، تال، پاتال۔

(و) خودساختہ نئے محاورے

شمس وقمر اگانا، ستوں کا سوچنا، خوابوں سے دل لگانا، پہاڑ چھاننا، لاوا پھوٹنا، دھوپ چھاؤں کھیلنا، زمانے سے چھننا، پاؤں کٹنا، ٹھنڈا پڑنا، آنچل میں نیند باندھنا، ستارے لرزنا، رام کرنا، آندھی کا بونا، روپ دھارنا، چاند کا اترنا، سر پہ کہکشاں لے کر چلنا، گھاس ہونا، کڑا ہونا، ہاں نہیں کرنا، درودیوار کو تکنا، دیدۂ نور کھینچنا، آگ کا جانا، پہاڑ کا اڑنا، جنت کا ہوا ہونا، داغوں کا ٹکا کرنا، غمیں رہنا، ہوا میں پھول کھلانا، آنچل کے تار کا ہنسنا، چھالا توڑنا، انا کا چلنا، لہو نچوڑ کر جینا، مقتل کا نام اونچا ہونا، صبح کا اترنا۔

حسن نعیم کی غزلوں کے مجموعی مطالعے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی غزلیں کسی خاص زمانے اور وقت کے حصار میں ناپی اور تولی نہیں جاسکتیں۔ ان کی غزلیں ذات وکائنات سے اس قدر گہرے روابط پیدا کر چکی ہیں اور اس کے اندر اس قدر تنوع، جستجو اور تجسس ہے کہ ایک دنیائے معنی نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ ان کے شعروں کی الہامی کیفیتوں میں ناقابل تردید حقیقت پوشیدہ ہے جو ان کی طبیعت کی گہرائی وگیرائی سے جلا پاتی ہے۔ اپنے شعروں کو آفاقیت اور لافانیت سے ہم کنار کرنے کے لیے انھوں نے اپنی فکر اور طبیعت کو برسوں کٹھالی میں تپایا ہے اس کے بعد ''اس ناگ میں لہرانے کے فن آئے ہیں۔'' اس میں شک نہیں کہ مجموعۂ کلام 'اشعار' اور 'دبستان' کی غزلیں بڑی دیدہ ریزی اور جگر کاوی کے بعد منتخب کر کے شائع کرائی گئی ہیں۔ اس لیے کم ہیں لیکن ان میں عظمت ہے اور اعتبار ہے اور بقول مخمور جالندھری ''ان کی غزلوں کا ہر لفظ نگینے کی طرح اور ہر مصرع مزین ہے، جس کا یک لفظ بھی نکال دیجیے تو ساری روح شعر فنا ہوجائے گی۔'' [۵] بہرحال قارئین وناقدین کے لیے ابھی بہت مواقع ہیں۔ حسن نعیم کی غزلیں پڑھی جائیں گی۔ نت نئے گوشے منور ہوں گے اور اردو غزل گوئی میں ان کی غزلوں پر انفرادی رایوں سے ایک حتمی فیصلے تک پہنچنا ممکن ہوسکے گا۔

○

حواشی

1. وہاب اشرفی سے راقم الحروف کی ایک ملاقات (قیام گاہ پھلواری شریف، پٹنہ) 17 ستمبر 2000
2. مضامین نو: خلیل الرحمٰن اعظمی، ص 208
3. نئی غزل کا دانشور: حسن نعیم، بانی ہفت روزہ برگ آوارہ، حیدرآباد، 16 جولائی 1977
4. اردو غزل: وزیر آغا، بحوالہ جدیدیت تجزیہ و تفہیم، مرتبہ: مظفر حنفی، ص 402
5. غزل کا امام وقت: شمیم طارق، بحوالہ دبستان: حسن نعیم
6. حسن نعیم: 'جمال فکر' مخمور جالندھری 'آہنگ' گیا، مارچ 1970

حسن نعیم اور آج کا قاری

سنا نہ مجھ کو فسردہ گلاب کا نوحہ
وہ برگ لا جو سراغِ بہار دیتا ہے

اگر اس چمن میں کوئی گلاب مرجھا گیا ہے تو اس کا نوحہ مجھے کیوں سناتے ہو، اس ایک پتے کی جستجو کرو جس کے سہارے فصلِ بہار تک رسائی کا سراغ ملتا ہے۔ ہماری فطرت نوحہ و ماتم پر موقوف نہیں۔ ہمارے لہو میں وہ حرارت ہے جو آفاتِ کائنات سے نبرد آزما ہو کر شوق کی منزل چھو لیتی ہے۔ ہم وہ نہیں جو 'شہرِ بے چراغ' سے 'شبِ فراق' اٹھالائیں اور اپنے گھر کو ماتم کدہ بنالیں۔ وہ اور ہوں گے جن کی ہمت ایسے افتادہ آفات کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہوگی۔ میں تو ظلمت میں بھی تیرگی اور خلوت میں بھی جلوت کی کرن ڈھونڈ لیتا ہوں:

عجز ہے سازِ نظر کا ورنہ شب کے دو بہ دو
دور تک پھیلا ہوا ہے روشنی کا سلسلہ

یہ ایک ایسے جیالے شخص کی آواز ہے جنھیں ظلمت کو نور بنانے کا سلیقہ آتا ہے۔ یہ ایک فطری سچائی ہے کہ زندگی اور غم کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ غالب نے اسی لیے کہا تھا کہ ''موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں'' ایسے میں اگر غموں سے نباہ کرنے کا سلیقہ ہمارے پاس نہیں تو پھر خوشیوں کی جستجو بے معنی ہے۔ اسلامی تاریخ میں 'غارِ حرا' کی زندگی حسن نعیم

کے لفظوں میں اس کے سوا اور کیا تھی؟

جسے سلیقہ ہے ظلمت کو نور کرنے کا
وہ دن کو رات بنا کر گزار دیتا ہے

حسن نعیم کی ذاتی زندگی کا مطالعہ کیجیے تو اندازہ ہوگا کہ بچپن سے لے کر عمر کے آخری ایام تک بہت سے مصائب و آلام کا انھیں سامنا کرنا پڑا۔ ان کی زندگی طوفانوں سے گھری رہی لیکن تمام تکلیفوں کو ہنستے ہوئے گلے لگایا۔ انھوں نے ایک ایسے ماحول میں زندگی گزاری جو بے مقصدیت، بے زاری، تنہائی، برگشتگی، اعصاب شکنی اور لایعنیت سے عبارت تھی لیکن یہ شاعر کی دوراندیشی ہی تھی کہ وہ ان پیچیدگیوں میں اوروں کی طرح خود کو مدغم نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی دانشوری سے مثبت طور پر جینے کی راہ ڈھونڈ نکالی اور یہ پیغام دیا کہ ''ہم سے ہے یہ زمانہ زمانے سے ہم نہیں۔'' ایک باشعور انسان کے اندر یہی وہ خاصیت ہوتی ہے جو ہر غم میں مسکراتے رہنے کا فن اور زندگی سے نبرد آزمائی کا ہنر سکھلاتی ہے:

جس ستارے کی روش سے ہوگئی دنیا اداس
ہم وہیں سے اک تمنا چاندنی سی لائے ہیں

حسن نعیم کی یہ آواز وہ آواز ہے جو اردو شعر و غزل کے باب میں زبان کی سطح پر میر سے اور فکر کی سطح پر بیدل و غالب سے جلا پاکر 1950 کے آس پاس 'نئی غزل' میں اپنا انوکھا تیور لے کر ہمارے سامنے آئی۔ غزل کے اس طرز بیان کے ظاہر ہونے کے بعد کئی ہم عصر ناقدین نے حسن نعیم کو نئی غزل کا پہلا ماڈل شاعر تسلیم کیا۔ ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، خلیق انجم، بانی اور مخمور جالندھری کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ مخمور جالندھری نے لکھا کہ:

''جب حسن نعیم، بیدل اور شاد عظیم آبادی کے وطن سے دلی آیا تو بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ اس کے ساتھ ایک نیا انداز فکر، تغزل کا ایک نیا لب ولہجہ اور اسلوب و بیان کا ایک نیا پیراہن دلی پہنچا ہے اور 'ظرف تنگنائے غزل' کی روایت ٹوٹنے والی ہے...''[1]

میں ہمیشہ اس رائے پر قائم ہوں کہ:

''حسن نعیم کے شعروں میں غم ذات اور غم کائنات کے حسین امتزاج سے

ایک ایسا توانا کردار ابھرتا ہے جس میں غموں سے نباہ کرنے کی بھرپور طاقت
ہے۔ ایک فن کار اپنی زندگی اور ماحول سے کئی صورتوں میں اثر قبول کرتا
ہے۔ کوئی شخص اپنے اندرون کا راگ الاپتا ہے، کوئی زمانے کے غم کو اپنا غم
بنا کر پیش کرتا ہے اور کوئی ایسا ہوتا ہے جس کے دل کی دنیا کے کاروبار اور ماحول
ویسے ہی ہوتے ہیں جس طرح زمانے کے کاروبار اور ماحول میں تگ ودو ہوتی
ہے۔ ان میں مؤخرالذکر وہ عوامل ہیں جو کسی فن کار کے فکری محرکات میں ایک
بڑی توانائی اور کس بل پیدا کردیتے ہیں اور اسی کے زیر اثر اس کے فن میں
آفاقی قوت سما جاتی ہے جس سے فن اور فن کار دونوں کا نقش لافانی ہوجاتا
ہے۔ حسن نعیم کی غزلیں اس مؤخرالذکر فکری وفنی لوازم سے مزین ہیں۔"

حسن نعیم نے ہر غم کے ساتھ اس کے مداوا کی جستجو بھی کی ہے۔ چنانچہ حسن نعیم کو اپنے فن اور اس کی پذیرائی سے بے اعتنائی کے سلسلے میں اپنے ہم عصروں سے جو انھیں شکایت تھی وہ ناسور کی حد تک تکلیف دہ تھی۔ باوجود اس کے انھوں نے خود کو بکھرنے نہیں دیا اور اپنے فن کی پذیرائی کو یہ راہ دکھائی:

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

پہلے مصرعے میں 'بامِ خورشید' سے مراد اربابِ اقتدار، منصف، قاضی اور طبقۂ ناقد ہے، 'صبح کے اترنے' سے مراد عنایات واکرام یعنی فن کی پذیرائی اور مصرعۂ ثانی میں 'خیمۂ شب' سے مراد دل ودماغ ہے۔ دل ودماغ کے لیے شاعر نے 'خیمۂ شب' اس مناسبت سے کہا ہے کہ دل ودماغ بھی جسم کے خیمے میں بند ہے جہاں اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ لیکن اس اندھیرے کے کہرام اور ہلچل میں بڑی طاقت ہے۔ لہٰذا اگرچہ اربابِ اقتدار کی نظرِ کرم ہماری پذیرائی کی جانب متوجہ نہیں تو کیا ہوا، ہمارے دل ودماغ میں ایسا کہرام اور ہلچل پیدا کردینے والی طاقت ہے جسے میں نے اس کے لفظوں میں چھپا رکھا ہے، یہی طاقت اسے ایک نہ ایک دن بے چین کردے گی اور پھر اسے میری اہمیت کا اقرار کرنا پڑے گا۔ یہ ہے 'جواں مردی از جواں مرداں بیا موز' کی مثال۔ لیکن یہاں یہ بھی اقرار کرتا چلوں کہ اس شعر میں اتنی وسعت ہے، اور تذبذب کی فضا اس

قدر قائم ہے کہ کسی ایک معنی تک پہنچ کر ہم ٹھہر نہیں سکتے۔ اس شعر میں انتظار کی جو فضا قائم ہے وہ ہماری نظریں ہمہ جہت رنگوں پر بکھیر دیتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایسی تمام کیفیت میں یہ شعر ایک معنی قائم کرسکتا ہے۔ لفظوں پر غور کیجیے تو کوئی بھی لفظ لغت میں دیے ہوئے حقیقی معنی کا سراغ نہیں لگنے دیتا بلکہ ہر لفظ معنی کے نئے امکانات کی طرف رواں دواں معلوم ہوتا ہے۔

چند اشعار اور ملاحظہ کیجیے:

کیا سمجھ کر مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار
آپ اپنا روز و شب ہوں آپ عالم تاب ہوں

خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی
اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی
دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی

مجھ میں کیا ہے مری چادر میں ہیں کتنے موسم
تو بھی مانند کفِ خاک اٹھے تو دیکھے

دیارِ فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں
تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو

ان اشعار میں کچھ ایسے کلیدی الفاظ ہیں جو معانی و مطالب کی مختلف جہات کی طرف ہمارا ذہن موڑ دیتے ہیں۔ مثلاً 'لیل و نہار' سے مراد ارباب اقتدار، زمانہ، ماحول، 'شب و روز' سے مراد زندگی، آزادی خودمختاری 'خواب' سے مراد آرزو، تمنا، شوق، 'در و بام' سے مراد رکاوٹیں، پریشانیاں، الجھنیں، 'جاگنے' سے مراد ہمہ تن عمل پیرا سرگرداں، 'چادر' سے مراد خواہشات اور 'مانند کفِ خاک' سے مراد حرکت و عمل، جہد مسلسل وغیرہ۔ الفاظ کے انھی اختراعات سے حسن نعیم کے شعروں میں "جدید تر لہجے کی گھن گرج کے مقابلے میں فکر کی سبک خرامی اور اظہار کی آب دار نرم روی"

در آئی ہے۔ حسن نعیم کی انھی فنی مہارتوں اور تخلیقی جہات سے متعلق پروفیسر وہاب اشرفی لکھتے ہیں:

"حسن نعیم کی غزلیں ایک طرف تو کلاسکی سج دھج سے اپنا رشتہ قائم کرتی ہیں تو دوسری طرف عصری رجحانات کو اپنی گرفت میں لیتی ہیں۔ اس لیے ان کی غزلیں ہر دو صنفوں پر اپنا ایک واضح معیار قائم کرتی ہیں۔ حسن نعیم لفظوں کے طلسم سے نہ صرف واقف تھے بلکہ تخلیقی سطح پر انھیں نئے معنوی آفاق تک لے جاتے تھے۔ یہ صورت ان کی غزلوں کے نئے امکانات کا پتا دیتی ہیں۔ لفظوں کو تخلیقی جہات بخشنے میں حسن نعیم اپنے معاصرین میں خاصے نماں معلوم ہوتے ہیں۔"2

حسن نعیم کو لفظوں کے تخلیقی استعمال پر دسترس ہے۔ ان کی شاعری عامیانہ نہیں، ان کی شعری تراکیب اور فکر و تخیل اعلیٰ شاعری کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ انھوں نے اپنے شعروں میں ندرتِ فکر کو کبھی اپنی گرفت سے باہر جانے نہیں دیا۔ یہ شعر دیکھیے:

شب بخیر اس نے کہا تھا کہ ستارے لرزے
ہم نہ بھولیں گے جدائی کا وہ ہنگام کبھی

پہلے، شعر کے ماحول اور مفہوم پر غور کیجیے۔ محبوب سے شامِ جدائی کی گھڑی ہے۔ 'شب بخیر' کہہ کر محبوب رخصت ہوا چاہتا ہے۔ شب بخیر سنتے ہی ستارے لرزنے لگتے ہیں۔ شب کی مناسبت سے 'ستاروں کا لرزنا' محلِ نظر ہے۔ علم نجوم میں ستاروں کی گردش سے شام و سحر کے سعد و نحس کی تفتیش کی جاتی ہے یا پھر دوسرے زاویے سے سوچیے تو اس ہنگام جدائی میں آنکھوں سے اشکوں کا چھلکنا فطری ہے اور ان آنسوؤں کے قطروں کو ستاروں کے لرزنے سے تشبیہ دینا کیسا شاعرانہ حسن پیدا کر رہا ہے، قابل غور ہے۔

حسن نعیم کی تخلیقی ہنرمندی اپنے آپ میں منفرد ہے۔ اردو شاعری کی روایت میں یہ تقلید نہیں، اضافہ ہے۔ ان اشعار میں معنوی تہہ داری کے ساتھ جو فضا قائم ہے وہ قاری پر ایک عجیب تاثر قائم کرتا ہے۔ شاعر کی وضع کردہ امیجری میں قاری بھی محو تماشا ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار بھی دیکھیں:

اسے بڑی تھی خوشی سے لے ملانے کی
کھنکتے جام میں اک پل نہ قہقہہ ٹھہرا

بدل کے بھیس میں آتا رہا ہوں دنیا میں
تمھی بتاؤ کہ تم سے کہاں جدا ٹھہرا

کس کس کو ہم دکھائیں عزائم کے لالہ زار
ہر آشنا کے پاس مصائب کا دشت ہے

آئیں گی جھوم جھوم کے ساون کی دیویاں
سورج کی اک نگاہ میں اتنی اُمس تو ہے

خلیل الرحمٰن اعظمی نے لکھا تھا:

''حسن نعیم کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت میرے نزدیک یہی ہے کہ یہ وقت کی اسیر نہیں ہے۔ وقت کی کارفرمائی اس کے بطون میں ہے اور وہ بھی ایک ناقابل تقسیم وحدت کی صورت میں۔ اس لحاظ سے میں انھیں سچا اور کھرا غزل گو سمجھتا ہوں... آپ جتنی بار اسے پڑھتے ہیں ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالب نے اپنے اشعار کو انھی معنوں میں 'تہہ دار' اور 'پہلودار' کہا تھا اور میر نے اپنے معاصرین کو اپنے مقابلے میں 'ناظمان بے تہہ' سے تعبیر کیا تھا۔''3

حسن نعیم نے رواں اور مترنم بحروں میں اپنی غزلیں تخلیق کی ہیں۔ ان کی غزلیں اردو غزل کی روایت اور مزاج کی امین ہیں۔ ان کی غزلوں کے تمام اشعار اپنے منفرد و جداگانہ معانی و مفاہیم کے باوجود ایک ہی موڈ اور مزاج کی ہیں۔ کلیم الدین احمد نے ایسی غزلوں کا مطالعہ کیا ہوتا تو اردو غزلوں سے متعلق ان کا تاثر کچھ اور ہوتا۔ ایسی غزلوں کا صوری حسن ان کے ذوق کو جمالیاتی تسکین ضرور بخشتا اور پھر اپنے مفروضے ''غزل ایک نیم وحشی صنف ادب ہے''4 پر نظر ثانی کرنی پڑتی۔ حسن نعیم نے اپنی تمام غزلوں کو ایک خاص فضا اور ماحول میں ڈھالا ہے۔ ایک ایسی دنیا آباد کی ہے جہاں پہنچ کر قاری اس ماحول کے مختلف رنگوں کی بصیرت و آگہی حاصل کرتا ہے، یہاں اسے کسی بیگانگی کا احساس نہیں ہوتا۔ غزل کے پہلے شعر

سے آخری شعر کی قرأت تک یکساں سنجیدگی کا ماحول قائم رہتا ہے۔

رمزکاری ان کی غزلوں میں بہ درجۂ اتم پائی جاتی ہے۔ حسن نعیم کی اس خصوصیت کو ڈاکٹر یوسف حسین خاں نے مومن سے اور بانی نے غالب سے مشترک بتاتے ہوئے یہ بھی کہا ہے کہ "رمز اور تہہ داری پر حسن نعیم کی گرفت مزید مضبوط ہوتی چلی گئی ہے۔"

حسن نعیم کی شاعری میں 'میں' کا حاوی رجحان ہر جگہ قائم ہے جو ذاتِ انسانی کے تشخص اور شناخت کا ضامن ہے، جو رنج و راحت سے نبرد آزما ہو کر رجائیت کو جنم دیتا ہے اور کردار کی مٹتی ہوئی اہمیت کو بحال کرنے کی متواتر کوششوں میں لگا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ناصر کاظمی یا ابن انشا کی طرح حسن نعیم کے شعروں کا کردار ہجر زدہ ہو کر حسرت و یاس اور محرومی و ناکامی کا شکار نہیں ہوتا۔ اس کا کردار 'برگ خزاں دیدہ' نہیں، جو 'بوئے آوارہ' کی طرح چمن سے نکل کر دشت و صحرا میں بھٹکنے پر مجبور ہو۔ اس کا کردار صحرا میں بھی پھول کھلانے اور اسے سرسبز و شاداب بنانے کی سکت رکھتا ہے۔ اشعار ملاحظہ کیجیے:

کب تک تلاشِ حسن میں بھٹکو گے دشت دشت
جو ذرہ سامنے ہو اسے لالہ رو کرو

میں بگولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں
ابر آئے یا نہ آئے میں سدا شاداب ہوں

'فلسفۂ وجودیت' کی تفہیم پر اس دور کے فن کاروں نے بڑی تلاش و جستجو کی ہے۔ فن کاروں نے یہ محسوس کیا کہ اگر چہ ہم ترقی کر رہے ہیں اور ہماری مادّی ترقی آسمان چھوتی جا رہی ہے لیکن جس کے لیے یہ ترقی ہو رہی ہے خود اسی کا وجود مبہم بنا ہوا ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ہر فرد اپنی ذات کا عرفان حاصل کرے۔ انسان بذاتِ خود آزاد ہے اور اس کا ایک مستقبل ہے۔ جب تک انسان اپنی انفرادیت پر غور نہیں کرے گا ایک اچھی اجتماعیت کا تصور خیالی دنیا کی چیز ہوگا کیوں کہ فرد سے ہی سماج بنتا ہے اور سماج کے ہی سہارے زندگی کامیاب و کامران ہوتی ہے۔ اس فردِ کامل کی جستجو میں حسن نعیم نے اپنے شعروں میں کیسا کردار پیدا کیا ہے، اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کردار میں کیسی خودداری اور خودشناسی ہے جو ہر غم کو ہنستے ہوئے

گزارنے کی سکت رکھتا ہے اور ہر ظلمت میں زندگی کی ایک کرن ڈھونڈ لیتا ہے۔

موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے تسخیر کائنات میں بڑے بڑے رازوں کا انکشاف کیا ہے۔ آئن اسٹائن کا نظریہ اضافیت، مریخ کی بازیافت اور چاند کی ویرانی سے حسن نعیم نے اپنے شعروں میں نئے نئے معنی کا جادو جگایا ہے۔ حسن نعیم سائنس کے استاد بھی تھے۔ جدید تر سائنس اور ٹیکنالوجی کے ترقی یافتہ ممالک میں اس کا قریب سے مشاہدہ بھی کیا۔ انھوں نے چاند اور ستاروں کی فطرت کو بہت قریب سے پرکھا ہے۔ یہ اشعار دیکھیں:

مری مژہ پر جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

خلا کے ماتھے پہ ایک بندی نہ جانے کب سے چمک رہی تھی
اسے بھی اپنی زمیں کی خاطر ہوا میں اڑ کر اتار لائے

شب کے جنگل میں ہے گم ماہِ تمنا کب سے
ان ستاروں سے پریشان ہے دنیا کب سے

اس شعر کے متن پر غور کیجیے تو اس کی ظاہری تشریح سے الگ بھی ایک گہرا مفہوم قائم ہوتا ہے۔ 'شب کے جنگل' سے مراد آشوب روزگار، 'ماہ تمنا' سے مراد شوق کی منزل اور 'ستاروں' سے مراد آفات، رکاوٹیں — اور ہم یہ مفہوم قائم کر سکتے ہیں کہ آشوب روزگار میں میرے شوق کی منزل کھوئی گئی ہے۔ آخر کب تک ان آفات کا ہمیں سامنا کرنا پڑے گا۔ شاعر کا لہجہ یہاں یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ ہم بہرحال تھکے نہیں ہیں۔ ہم تو یہ جاننا چاہتے ہیں کہ اس کی انتہا کہاں پر ٹھہرتی ہے اور اس انتہا پر پہنچے بنا ہم دم لینے والے نہیں۔

حسن نعیم نے جس طرح شعری فکر میں ندرت پیدا کی ہے اسی طرح ان کی شعری تراکیب بھی دلچسپی سے خالی نہیں۔ اپنی غزلوں میں انھوں نے ہندوستانی مزاج کی علامتوں کو خوب رواج دیا ہے جن کا رشتہ ہماری دھرتی سے جڑا ہوا ہے۔ حسن نعیم نے ہندوستانی رسم و رواج، یہاں کی تہذیب، تیوہار، موسم اور تاریخی و اساطیری استعاروں کا بہت خوب صورت استعمال

اپنی شاعری میں کیا ہے۔ شعر دیکھیے:

مجلسوں کی روشنی ہوں پھر بھی لگتا ہے نعیم
میں کسی گوتم کا دکھ ہوں رام کا بن باس ہوں

پاؤں چھو کے نہ ٹالیو کہ حسن
کوئی صوفی نہ سنیاسی ہے

اتنا دل نعیم کو ویراں نہ کر حجاز
روئے گی موج گنگ جو اس تک خبر گئی

اس کتاب کے پہلے حصے میں یہ وضاحت کی جا چکی ہے کہ حسن نعیم کی شخصیت اگرچہ مذہبی نہ تھی لیکن آنکھیں خانقاہ میں کھلی تھیں۔ اپنے بزرگوں سے تصوف اور دین کی تعلیم حاصل بھی کی تھی۔ ان کے والد سید محمد نعیم اور دادا سید شاہ غلام قاسمؒ درگاہ مخدوم، پیر امام الدین کے سجادہ نشیں تھے۔ ان کا شجرۂ نصب پندرھویں پشت پر شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری اور پینتالیسویں پشت پر حضرت امام حسنؓ سے جاملتا ہے۔ ہندوستان میں ان کے مورث اعلیٰ کا سلسلہ تو 'فردوسیہ' سے تھا لیکن ان کے ایک بزرگ شیخ محمد قاضن سے 'شطاریہ' سلسلے کا آغاز ہوتا ہے اور اسی شطاریہ سلسلے سے حسن نعیم نے تربیت حاصل کی تھی۔ 7 جس کی بنا پر ان کے مزاج میں رندی و سرمستی کے باوجود ہوشیاری، حق گوئی و بے باکی، شاہانہ جاہ و جلال فیاضی و دریادلی اور اپنی خودی کی نگہبانی سب برقرار تھیں اور پھر جیے تو اس شان سے:

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے، ہزار موج غبار لائے

اس شعر کے پس منظر میں حضرت شیخ شرف الدین احمد یحییٰ منیری سے متعلق ایک مشہور روایت کی طرف قاری کا ذہن منتقل کرنا چاہوں گا۔ مشہور روایت ہے کہ حضرت یحییٰ منیری عبادت و ریاضت میں مشغول تھے کہ ایک شیر نے پیچھے سے ان پر حملہ کیا۔ حضرت کو خبر ہوگئی۔ انھوں نے مدافعت میں اس شیر پر ہاتھ اٹھایا، شیر آن کی آن میں وہیں ڈھیر ہوگیا۔ دوسرا واقعہ

یہ ہے کہ حضرت عبادت میں مشغول تھے کہ ایک جادوگر نے پہاڑی سے پتھر کا ایک بڑا ٹیلہ ان پر گرایا۔ حضرت اس وقت نماز میں قعدے کی حالت میں تھے۔ جوں ہی اشہد الا الہ الا اللہ کہتے ہوئے شہادت کی انگلی اٹھائی تو اسی اشارے پر وہ پتھر ہوا میں لٹک گیا اور آج تک لٹکا ہوا ہے۔ لوگ دور دور سے ان کرامات کے نشانات آج بھی دیکھنے کے لیے راہگیر جاتے ہیں۔ راقم الحروف نے بھی دوبار وہاں حاضری دی ہے۔

حسن نعیم کی انانیت کے بہت سے قصے مشہور ہیں۔ خواہ اپنی نوعمری میں گوپی ناتھ امن کے یہاں مشاعرے میں اپنا کلام پہلی ہی دعوت میں نہ پڑھنے کا واقعہ ہو، فراق کے ساتھ شعرفہمی کا معاملہ ہو' زندہ دلان بمبئی' کے پروگرام میں دعوت نہ ملنے کا مسئلہ ہو۔ وزارت خارجہ کی اتنی بڑی ملازمت کو خیرباد کہنے کا سانحہ ہو یا غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر کے عہدے کے ترک کرنے کا المیہ ہو، یہ سب اردو ادب میں ایک شخصی المیہ کے نام سے زندہ رہے گا۔ زندگی کے ہر نشیب و فراز سے انھیں سابقہ پڑا۔ کبھی وقت نے اونچے مسند پر بٹھایا تو کبھی بوریہ نشینی ان کا مقدر بن گئی لیکن اخلاقی معاملوں میں کبھی زیر نہ ہوئے۔ حسن نعیم کے جب دن اچھے تھے تو دوستی کا حلقہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔ ان کے یہاں فیض، فراق، علی سردار جعفری، مجروح، اختر الایمان، باقر مہدی، مخمور سعیدی، یوسف ناظم، منیر نیازی، شہاب جعفری، ندا فاضلی اور من موہن تلخ جیسے شاعروں سے لے کر سیاست دانوں تک کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔

حسن نعیم نے اپنی زندگی میں بہت کم لکھا لیکن جو کچھ لکھا اس پر ان کی شعوری بالیدگی ہمیشہ حاوی رہی۔ ایک ایک شعر پر مہینوں اور برسوں غور کیا کرتے تھے اور پھر متن میں تبدیلی لاتے تھے۔ ہر باشعور فن کار آخر دم تک اپنے فن کو بلندی اور کثیرالجہتی عطا کرنے کے لیے اپنی اکتسابی نظر سے استفادہ کرتا ہے۔ حسن نعیم کی تخلیقات میں تبدیلی متن میں چار امور کا فرما تھے۔ اولاً معنی و مطالب کے کثیر جہات رخ، دوم تغزل کی چاشنی، سوم انداز بیان میں سہل ممتنع کی کارفرمائی اور چہارم شعروں کے اندر ابھرنے والے کردار کی مثبت فکر و عمل۔ یہ مثبت کردار ہمارے لیے بھی مشعل راہ ہے اور آنے والی نسلوں کے لیے بھی۔ اس دنیا میں ابھی لوگ جس طرح جی رہے ہیں۔ ہزاروں کی بھیڑ میں انسان خود کو جس طرح اکیلا محسوس کر رہا ہے۔ ایک دوسرے کو دھکے دے کر اور چھلانگ لگا کر خود کے آگے بڑھ جانے کی جو ہوس ہے، کردار کشی،

استحصال اور خودنمائی کی جو فطرت پروان چڑھ رہی ہے، ایسے میں آدمی کے اندر خوداعتمادی نہ ہوتو زندگی کے اس ہنگامے اور ہجوم میں دو قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا۔ ایسی ہی خوداعتمادی کی نقیب حسن نعیم کی شاعری ہے۔ آج کے اس پرآشوب دور میں ایسے جیالے کردار کی ہم نشینی ہمارے لیے تو اور اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا ان کے اشعار ایسے پرآشوب دور میں بہت دور تک قاری کا ساتھ دیتے ہیں کیوں کہ اس کے فن کار نے اپنی زمینوں کو سبزوں سے خوش لباس بنا کر 'گلابوں' کے لیے رشک کا جواز چھوڑ رکھا ہے۔ بقول شاعر:

اٹھا لو جتنا بھی چاہو کہ دل معطر ہو
بہت ہیں پھول مری آرزو کے دامن میں

O

حواشی:

1. مخمور جالندھری، حسن نعیم: جمالِ فکر' آہنگ' گیا، مارچ 1975
2. راقم الحروف کی پروفیسر وہاب اشرفی سے ایک ملاقات، 17 ستمبر 2000
3. خلیل الرحمٰن اعظمی: مضامین نو، ص 207
4. پروفیسر کلیم الدین احمد 'اردو شاعری پر ایک نظر، ص 71
5. ڈاکٹر یوسف حسین خاں: اردو غزل، ص 207
6. راجندر من چندا بانی ہفت روزہ 'برگ آوارہ' حیدر آباد، 16 جولائی 1977
7. مزید وضاحت کے لیے راقم الحروف کی سابقہ تحریر 'حسن نعیم اور نئی غزل' دیکھیں۔

نمونۂ کلام

دانشوروں کی تازہ روایت ہوں میں نعیم
سب سے الگ ہے نام تغزل کے باب میں

○

وہ علم دے جو سُخن کو وقار دیتا ہے
وہ درد بخش جو فن کو نکھار دیتا ہے

یہ کون دل میں جلاتا ہے آتشِ امید
وبال فکر کو سر سے اتار دیتا ہے

کسی کو جبر سے کرتا ہے وہ تہِ شمشیر
کسی کو اپنے کرم ہی سے مار دیتا ہے

جسے سلیقہ ہے ظلمت کو نور کرنے کا
وہ دن کو رات بنا کر گزار دیتا ہے

ستم نواز زمانے سے پوچھیے تو سہی
وہ کس ظریف کو دامانِ یار دیتا ہے

سنا نہ مجھ کو فسردہ گلاب کا نوحہ
وہ برگ لا جو سراغِ بہار دیتا ہے

میں اُس درخت سے کم تر ہوں مرتبے میں حسن
جو دھوپ سہ کے مسافر کو پیار دیتا ہے

○

آرزو ممکن ہے شرحِ آرزو ممکن نہیں
اُن سے اب تک والہانہ گفتگو ممکن نہیں

ایک اپنی جستجو ہی بن گئی وہ مرحلہ
اب کسی بھی ماسوا کی جستجو ممکن نہیں

ہائے ہائے کر رہے ہیں زر کی خاطر صوفیا
خانقہ کی اس فضا میں ہاؤ ہو ممکن نہیں

چشمِ گریاں کیوں ہوئی ہے چاہِ زم زم کی حریف
کیا نمازِ عشق اپنی بے وضو ممکن نہیں

کیا ضیافت کا سبق تھی شیخ کی دعوت نعیم
کون کہتا تھا وہاں دور سبو ممکن نہیں

○

جان و دل پر بار بن کر ماہ و سال آتے رہے
ہم کسی فردا سے لیکن جی کو بہلاتے رہے

سرخ رو لوٹے چمن سے جن میں تھا جوشِ طلب
وہ تہی داماں اُٹھے، دامن جو پھیلاتے رہے

ایک میں تھا جس نے اپنے سر لیا بارِ جہاں
ورنہ کتنے اہلِ غم آتے رہے، جاتے رہے

تم وہ دانا تھے کہ ہم سے دور تر ہوتے گئے
ہم وہ ناداں تھے کہ تم سے چھٹ کے گھبراتے رہے

انگلیاں اُٹھتی رہیں سارے زمانے کی نعیم
بے نیازانہ ہم اپنے ساز پر گاتے رہے

○

جو غم کے شعلوں سے بجھ گئے تھے، ہم ان کے داغوں کا ہار لائے
کسی کے گھر سے دیا اُٹھایا، کسی کے دامن کا تار لائے

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے، ہزار موجِ غبار لائے

کسے بتائیں کہ غم کے صحرا کو خلدِ دانش بنایا کیسے؟
کہاں سے آبِ رواں کو موڑا، کہاں سے بادِ بہار لائے

ہر ایک راہِ جنوں سے گزرے، ہر ایک منزل سے کچھ اٹھایا
کہیں سے دامن میں غم سمیٹا، کہیں سے جھولی میں پیار لائے

خلا کے ماتھے پہ ایک بندی، نہ جانے کب سے چمک رہی تھی
اسے خلا بھی اپنی زمیں کی خاطر، ہوا میں اُڑ کر اُتار لائے

جو اپنی دنیا بسا چکا ہے، اُسے بھی مشکل کا سامنا ہے
کہاں سے شمس و قمر اُگائے، کہاں سے لیل و نہار لائے

وہی شباہت، وہی ادائیں، مگر وہ لگتا ہے غیر جیسا
نعیم یادوں کی انجمن میں نہ جانے کس کو پکار لائے

---

* یہ غزل 1969 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

جان کر وجہِ وفا کچھ اور رنجیدہ ہوئے
مُلکِ دل کی خاک چھانی تو جہاں دیدہ ہوئے

وہ نظر میں تھا تو کج بیں تھے نگہ کے زاویے
جائزہ اپنا لیا تو اس کے گرویدہ ہوئے

آفتوں کو خس کے ٹالا، غم کو جانا اک مذاق
دل نہ مانا تو کبھی دم بھر کو سنجیدہ ہوئے

ان کا عیبِ خاص جب سے اک ہنر ثابت ہوا
اُن کے جتنے عیب تھے دل کو پسندیدہ ہوئے

سر پہ جو پتھر لگے تھے ان کی قیمت اور تھی
وہ تراشیدہ ہوئے یا ناتراشیدہ ہوئے

دی گئی تعلیم دوری جن کو بچپن سے حسن
کیا سمجھ کر آپ ان کے پاس نم دیدہ ہوئے

تھی کہاں بو باس ان کی برگِ صحرا میں نعیم
سائباں میں جو کھلے تھے وہ گُل چیدہ ہوئے

پیکرِ ناز پہ جب موجِ حیا چلتی تھی
قریۂ جاں میں محبت کی ہوا چلتی تھی

اُن کے کوچے سے گزرتا تھا اُٹھائے ہوئے سر
جذبۂ عشق کے ہمراہ انا چلتی تھی

اک زمانہ بھی چلا ساتھ تو آگے آگے
گرد اُڑاتی ہوئی اک موجِ بلا چلتی تھی

پردۂ فکر پہ ہر آن چمکتے تھے نجوم
فرش تا عرش کوئی ماہ لقا چلتی تھی

دل کو اب بھی ہے یہی وہم کہ مجھ سے چھپ کر
پیچھے پیچھے مرے وہ جانِ وفا چلتی تھی

دل میں جو یاد رہا کرتی ہے غم کی صورت
کل وہی یاد بہ اندازِ ندا چلتی تھی

میں ہی تنہا نہ خرابوں سے گزرتا تھا نعیم
شام تا صبح ستاروں کی ضیا چلتی تھی

○

پتا نہیں کہ وہ چہرے کا رنگ تھا کیا تھا
لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ تھا کیا تھا

نکل پڑی ہے مری روح کیوں برہنہ پا
لباسِ عشق بہت دل پہ تنگ تھا کیا تھا

خبر نہیں کہ انھوں نے کہاں پہ سر پھوڑا
خرد کے طرۂ لعلیں میں سنگ تھا کیا تھا

پڑی ہے خاک پہ اک لاش تو چلو دیکھیں
یہ اپنے دیش کا باسی ملنگ تھا کیا تھا

نعیم کتنے چمن اور کھل اٹھے دل میں
وصالِ یار ہی خوشبو تھا، رنگ تھا کیا تھا

○

دل میں ہو آس تو ہر کام سنبھل سکتا ہے
ہر اندھیرے میں دیا خواب کا جل سکتا ہے

عشق وہ آگ جو برسوں میں سلگتی ہے کبھی
دل وہ پتھر جو کسی آن پگھل سکتا ہے

ہر نراشا ہے لیے ہاتھ میں آشا بندھن
کون جنجال سے دُنیا کے نکل سکتا ہے

جس نے ساجن کے لیے اپنے نگر کو چھوڑا
سر اٹھا کر وہ کسی شہر میں چل سکتا ہے

میرا محبوب ہے وہ شخص جو چاہے تو نعیم
سوکھی ڈالی کو بھی گلشن میں بدل سکتا ہے

○

ہاتھ پھیلایا نہ منعم کا نوالہ توڑا
میں ہوں وہ جس نے خموشی کا پیالہ توڑا

آج آتش کدۂ غم سے ملا اک گل داں
ہم نے لب سے ترے وہ پھول نرالا توڑا

وار کرنے کے لیے لائے تھے کیا کچھ احباب
روک لی دل پہ سناں، فرق سے بھالا توڑا

عمر جب بیت گئی دشت نوازی میں حسن
ان کی پلکوں نے مرے پاؤں کا چھالا توڑا

باغ کو باغ کیا خوشۂ محنت سے نعیم
دستِ گل کھینچا، نہ پیمانۂ لالہ توڑا

○

عدائے مست سے بھرتے ہیں خالی جام کو اب
کسے مجال کہ ٹوکے گدائے شام کو اب

لگا ہوا ہے کئی دن سے وصل کا بازار
کہو یہ ہجر سے آگے بڑھائے کام کو اب

فسردگی بھی قیامت اٹھانے والی ہے
اٹھی ہے خاک کہ چڑھے فرازِ بام کو اب

سنے گا ہند تو اس سے کہوں گا دردِ وفا
مرے جنوں سے غرض کیا عراق و شام کو اب

عجیب پیار سے اس نے حسن کہا تھا نعیم
میں کس طرح سے بھلاؤں گا اپنے نام کو اب

یاد کا پھول سرِ شام کھلا تو ہوگا
جسم مانوس سی خوشبو میں بسا تو ہوگا

قطرۂ مے سے دبا رات نہ طوفانِ طلب
مجھ پہ جو بیت گئی رات سُنا تو ہوگا

کوئی موسم ہو یہی سوچ کے جی لیتے ہیں
اک نہ اک روز شجرِ غم کا ہرا تو ہوگا

یہ بھی تسلیم کہ تو مجھ سے بچھڑ کے خوش ہے
تیرے آنچل کا کوئی تار ہنسا تو ہوگا

وہ نہ مانوس ہوں کچھ خاص علائم سے حسن
ایک قصہ مری آنکھوں نے کہا تو ہوگا

○

"تم کو جانا ہو زمیں تک تو کہو کچھ لب سے"
یوسفِ روز نے فرمایا نگارِ شب سے

تم کہ ہو یاس کی وادی میں جھکائے ہوئے سر
ہم کہ امید کی سرحد پہ کھڑے ہیں کب سے

کتنی یادوں کو کیا قیدِ مکاں سے آزاد
کتنی یادوں کو ہوں جکڑے ہوئے تارِ شب سے

ابرِ باراں کی دعا دشت نے جب سے مانگی
ہے سرابوں کو پریشانیِ خاطر تب سے

دی اذاں اس نے بہت اپنے مناروں سے حُسن
کچھ ہمیں دور رہے حُسن کے تاب و تب سے

○

وہ لوٹ آئے تو اس کی بھی کچھ انا رکھیو
فصیلِ قلب کا دروازہ تم کھلا رکھیو

نظر کی آنچ سے کھلتے ہیں پھول وحشت کے
کھلیں یہ پھول تو دامن کو مت بچا رکھیو

دیارِ فن میں جہاں منزلیں بھی فرضی ہیں
تمام عمر بھٹکنے کا حوصلہ رکھیو

سنا کہ رات تھا محبس میں شور اللہ ہو
ہوا چلے تو دریچے کو دل کے وا رکھیو

وہ اک غزال ہے کب تک پہاڑ چھانے گا
کنارِ آب حسن خیمۂ وفا رکھیو

○

ایک داغِ مستقل ہے قُربِ یاراں کا صلہ
چاند کو اس کے علاوہ آسماں سے کیا ملا

عجز ہے سازِ نظر کا ورنہ شب کے دو بدو
دور تک پھیلا ہوا ہے روشنی کا سلسلہ

غم کی اپنی منطقیں، خوشیوں کے اپنے فلسفے
دل نے رکھا پھر بھی خوابِ نو بہ نو کا حوصلہ

اب تو آجاؤ کہ ہم نے کاٹ لی قیدِ اَنا
انتظارِ روشنی میں اپنا دیدہ بہہ چلا

کس طرح اب باندھیے گا عشق کے مضموں نعیم
یاں وصالِ یار بھی ہے اقتصادی مسئلہ

○

شامِ الم کو یاد رکھ، صبحِ طرب کے بعد بھی
سوزِ جنوں سے کام لے، منزلِ شب کے بعد بھی

دل میں نہ جانے کیا رہا مثلِ شرارِ جستجو
جوشِ طلب کے وقت بھی، ترکِ طلب کے بعد بھی

تجھ کو بتائیں کیا صبا، ہم نے جلایا کیوں چراغ
آمدِ خور کے باوجود رخصتِ شب کے بعد بھی

شکر کرو کہ مل گیا، خواہ سبھوں کے بعد ہی
ملتا ہے ورنہ کس کو جام، حسنِ طلب کے بعد بھی

سر میں اگر جنوں نہ ہو، ملتا نہیں ہے تاجِ فن
فکر و نظر کے باوجود، نام و نسب کے بعد بھی

دیکھیں نہ مجھ کو اہلِ بزم، ایسی نظر سے اے نعیم
آیا ہوں میں تو بارہا، بزم میں سب کے بعد بھی

* یہ غزل 1957 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

بدلیں جو ہوائیں گلشن کی ہر کنج و روش تھی ویراں ویراں
اک آن میں جزوِ خاک ہوئے، وہ گل جو کھلے تھے خنداں خنداں

اے عشق یہی تو رونا ہے، اک دورِ جنوں برباد گیا
کیوں آتشِ گل کی فصل میں ہم، کوچے میں کھڑے تھے ناداں ناداں

ہم کس کو بتائیں کیا کیا ہے، بے تابیٔ جاں کو ان سے گلہ
ہم کس کو دکھائیں جا جا کر، کیوں چشمِ وفا ہے گریاں گریاں

وہ کب کے یہاں سے جا بھی چکے، وہ کب کے غزالِ شہر ہوئے
تم کس کو نعیم اب ڈھونڈ رہے ہو، وادی و صحرا حیراں حیراں

○

جب تک شعورِ عشق ہے، پاسِ جمال ہے
زندانِ آرزو سے نکلنا محال ہے

ہر لمحہ اضطراب ہے، ہر لحظہ انتشار
دل کا وہی ہے حال جو دنیا کا حال ہے

گزرا جو کوئے یار سے، اس نے صدا نہ دی
دل ہے کہ اتنی بات سے ناحق نڈھال ہے

جو بھی صلہ ہو تجھ سے محبت کا اے حیات
ہر شخص اپنے آپ وفا کی مثال ہے

سنتے ہیں اے نعیم سوائے کمالِ فن
دنیا میں ہر عروج پہ اک دن زوال ہے

○

دامن کو اپنے چاک کرو یا رفو کرو
خوابوں سے دل لگاؤ، کوئی آرزو کرو

شاید کہ شکلِ مہر کوئی آئے صبح دم!
شامِ فراق تم بھی جگر کو لہو کرو

آئے گی کس کے کام یہ رعنائی خیال
نغمو! دیارِ فکر میں رہنے کی خو کرو

کب تک تلاشِ حسن میں بھٹکوگے دشت دشت
جو ذرہ سامنے ہو اسے لالہ رو کرو

کنجِ صحن سے آؤ سوئے میکدہ نعیم
احسن ہے کار غم سے کہ شغلِ سبو کرو

○

وحشتِ جاں کو پیام نگہ ناز تو دو
اس فسانے کو ذرا گرمیِ آغاز تو دو

میرے قدموں کے نشاں راہ سے کچھ دور سہی
تم سے میں دور نہیں ہوں، مجھے آواز تو دو

دل میں طوفاں نہیں ہو تو کرے کیا نغمہ
میں سناتا ہوں یہی راگ مجھے ساز تو دو

کوئی بنیاد نہیں قیدِ تعلق کی ابھی
جذبۂ غم کو ذرا فکر کا انداز تو دو

اس نے سینے سے لگایا جو کہا میں نے حسن
دل میں رکھنے کے لیے اپنا کوئی راز تو دو

* یہ غزل 1962 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

جب کبھی میرے قدم سوئے چمن آئے ہیں
اپنا دکھ درد لیے سرو سمن آئے ہیں

پاؤں سے لگ کے کھڑی ہے یہ غریب الوطنی
اس کو سمجھاؤ کہ ہم اپنے وطن آئے ہیں

جھاڑ لو گردِ مسرت کو، بٹھا لو دل میں
بھولے بھٹکے ہوئے کچھ رنج و محن آئے ہیں

جب لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلفِ خیال
یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

کچھ عجب رنگ ہے اس آن طبیعت کا نعیم
کچھ عجب طرز کے اس وقت سخن آئے ہیں

○

(بہ یاد پرویز شاہدی)

یہی وجہ الم ٹھہری، محبت کے فسانے میں
وہ ہشیاروں کی خو ڈھونڈا کیے بانکے دوانے میں

وہ بزمِ فکر و فن ہو، یا ستم رانوں کا محبس ہو
عجب اک شان آنے میں، عجب اک شان جانے میں

فقیہہ شہر کا ڈر تھا، نہ ڈر تھا شہریاروں کا
جو شعلہ دل میں رقصاں[1] تھا، وہی تھا ہر ترانے میں

زہے قسمت عظیم آباد نے جوہر[2] شناسی کی
اڑی ہے خاک جب پرویز کی ویران خانے میں

نگاہیں دیکھ لیتی ہیں جہاں ہیں درد کے چشمے
وہ چہرہ ڈوب جاتا ہے نعیم آنسو بہانے میں

---

1 مجموعۂ کلام 'رقص حیات' دوسرا مجموعہ 'تثلیث حیات'

2 مرے جوہر نے رسوا کر دیا مجھ کو زمانے میں وہ جلوہ ہوں جو ٹکراتا پھرا آئینہ خانے میں (پرویز شاہدی)

○

ان کے لیے مہتاب ہے، جھیلوں کا سکوں ہے
میرے لیے پابندیٔ آدابِ جنوں ہے

مدت ہوئی غزلوں سے گیا شورِ گلستاں
اب حرفِ غزل نوکِ سناں، موجۂ خوں ہے

پھوٹا نہیں لاوے کی طرح دل کا دبستاں
جو شعلۂ افکار تھا، اب سوزِ دروں ہے

کچھ راز مکینوں کے ہیں، کچھ راز مکاں کے
اک چھت کے سوا اور بھی کچھ بارِ ستوں ہے

شل ہے نہ کسی وقت حسن جبر کا بازو
یہ سر بھی نگوں تھا نہ کسی آن نگوں ہے

○

یہی تو غم ہے وہ شاعر، نہ وہ سیانا تھا
جہاں پہ انگلیاں کٹنی تھیں، سر کٹانا تھا

مجھے بھی ابر کسی کوہ پر گنوا دیتا
میں بچ گیا کہ سمندر کا میں خزانہ تھا

تمام لوگ جو وحشی بنے تھے، عاقل تھے
وہ ایک شخص جو خاموش تھا، دوانہ تھا

پتا چلا یہ ہواؤں کو سر پٹکنے پر
میں ریگِ دشت نہ تھا سنگِ صد زمانہ تھا

تمام سبزہ و گل تھے ملازمِ موسم
کلی کا فرض ہی گلشن میں مسکرانا تھا

وہ میرے حال سے مجھ کو پرکھ رہے تھے حسن
مری نگاہ میں گزرا ہوا زمانہ تھا

○

موسم سیلاب آیا، ندی نالا بھر گیا
بے وطن سا اک پرندہ اڑ کے واپس گھر گیا

کیسی کالی رات بیتی، کیسا کالا دن چڑھا
جو بگولوں سے لڑا تھا، وہ صبا سے ڈر گیا

پے بہ پے تلوار چلتی ہے یہاں آفات کی
دست و بازو کی خبر لوں تو کھپے سر گیا

اب شہیدوں میں رکھو یا اس کو شہدوں میں گنو
مرنے والا آگ کے دریا سے لڑ کر مرگیا

اس کو آتا ہے وفا کا ڈھنگ، طرزِ دل بری
جب جدا مجھ سے ہوا وہ تب گلے مل کر گیا

رند ہونے کے علاوہ دوست ہوگا وہ نعیم
جوڑ کر ٹوٹا پیالہ جو سبو کو بھر گیا

○

ایک بھی حرف نہ تھا خوش خبری کا لکھا
نامۂ وقت ملا اور کسی کا لکھا

آبسے کتنے نئے لوگ مکانِ جاں میں
بام و در پہ ہے مگر نام اسی کا لکھا

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

کوئی جدت تو کوئی حسنِ تغزل سمجھا
مرثیہ جب بھی کوئی اپنی صدی کا لکھا

بات شیریں سی لگی فن کے طرف داروں کو
قصہ ہر چند حسن کوہ کنی کا لکھا

○

ہوا میں رقصاں ہیں دل کے پرزے خرد کے طوفاں کا سلسلہ ہے
جنوں کی بستی اُجڑ چکی ہے، وفا کے شہروں میں زلزلہ ہے

تمام صحرا نواز لوٹے، سبھوں نے کنجِ چمن بسایا
مگر جو صرصر سے تھی شکایت، وہی صبا سے انھیں گلہ ہے

میں جس کو وحشت میں ڈھونڈتا تھا، ہر ایک جنگل ہر ایک قریہ
وہ مصلحت کا لبادہ اوڑھے، صفِ عدو کے قریں ملا ہے

وجودِ دامن سے کچھ زیادہ، ورودِ گُل پر ہوا میں حیراں
ہر ایک کانٹے سے پوچھتا تھا، "یہ پھول کس کے لیے کھلا ہے؟"

ہزار سمتوں سے آئے پتھر، مگر جو دل کے مکیں نے پھینکا
اسی کو خلوت میں چومتا ہوں کہ لاکھ سجدوں کا یہ صلہ ہے

جو خوں کو رکھتے تھے گرمِ گردش، میں ان خیالوں کو چھو چکا ہوں
بلا سے آنکھوں سے اشک ٹپکا، بلا سے پاؤں میں آبلہ ہے

نعیم جینے کی آرزو ہے تو آؤ مرنے کا ڈھنگ سیکھیں
یہی دیارِ بتاں کی رسمیں، یہی زمانے کا فیصلہ ہے

○

مال و متاع دشت سرابوں کو دے دیا
جو کچھ زر خیال تھا، خوابوں کو دے دیا

رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا
بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا

سبزوں کو خوش لباس بنا کر زمین نے
کچھ رشک کا جواز گلابوں کو دے دیا

اپنے لہو کی بوند بنا کر دم نشاط
اک سوز لازوال شرابوں کو دے دیا

آئے نہ جب گرفت میں سیف و قلم نعیم
اپنا تمام کرب ربابوں کو دے دیا

○

جبرِ شہی کا صرف بغاوت علاج ہے
اپنا ازل سے ایک حسینی مزاج ہے

آگے تو زہرِ عشق میں سب زہر تھے گھلے
اب شاعری کی جان رگِ احتجاج ہے

عالی نظر کے شعر پہ تیکھے مباحثے
بے نور عالموں کا مرض لاعلاج ہے

ہر آن ہیں دماغ میں افکارِ شب نواز
اس غم کی سلطنت میں بس اک دل سراج ہے

کیا دی ہے لب کشائی کی قیمت اسے بھی دیکھ
اس دفترِ نوا میں سبھی اندراج ہے

ان سوندھی مٹیوں نے دیا رنگ و ذائقہ
ہیروں سے بڑھ کے آب میں ملکی اناج ہے

اقبال کی نوا سے مشرف ہے گو نعیم
اردو کے سر پہ میر کی غزلوں کا تاج ہے

○

یاد کی آنچ سے ہر آن تپاں ہے تو رہے
اب کوئی میرے لیے شعلہ بجاں ہے تو رہے

یادِ امکاں سے ہے سرسبز جنوں کی وادی
کوچۂ عقل میں وحشت کا سماں ہے تو رہے

ہم بھی بے تاب ہیں اب سیر و سیاحت کے لیے
ان کی نظروں میں کوئی تازہ جہاں ہے تو رہے

بس یہی فکر کرو جلتی رہے آتشِ فن
آتشِ رشک سے محفل میں دھواں ہے تو رہے

سر اٹھانے کی کہاں آج مجھے تاب نعیم
وہ کسی چاند کے پیکر میں نہاں ہے تو رہے

○

کوئی وجہِ غم نہیں ہے، کسی بات کا ہے غم بھی
اسی دردِ گم شدہ سے کبھی رو دیے ہیں ہم بھی

وہی طالبِ ضیا ہو، جو اٹھائے نازِ ظلمت
وہی بوسۂ سحر لے جو سنوارے شامِ غم بھی

مرے کھوئے کھوئے رہنے کی ہر ایک سے شکایت
یہی آپ کا تغافل، یہی آپ کا کرم بھی

کریں ضبطِ غم کہاں تک، رہیں دل فگار کب تک
کوئی غم گسار آئے تو لپٹ کے روئیں ہم بھی

اٹھو اے نعیم گائیں شبِ ہجر کا ترانہ
کسی کام آئے آخر یہ فضائے پر الم بھی

○

تو نیازِ دل سے پیہم سرگراں ہوتا رہا
میں سبک سر بن کے بارِ آرزو ڈھوتا رہا

دی اذیت لعنتِ احساس نے گو عمر بھر
کچھ ازالہ نعمتِ افکار سے ہوتا رہا

کتنے اشکوں کے دیے جلتے رہے بجھتے رہے
یوں بظاہر چین سے میں رات بھر سوتا رہا

جو سزا تاریخ دیتی اس سے بچنے کے لیے
دامنِ اجداد کے دھبوں کو میں دھوتا رہا

غم کو غرقِ مے کیا ہوگا کسی نے اے نعیم
میں وہ میکش ہوں جو وقتِ میکشی روتا رہا

○

کیوں برا کہتے ہو اُس کو کچھ جفا کس میں نہیں
قیدِ وعدہ سے رہائی کی ہوا کس میں نہیں

خوش نصیبی سے ہُوا ہوں وارثِ سوزِ حُسینؑ
ورنہ ماتم کے لیے اک کربلا کس میں نہیں

کیا شکایت وہ چھپا پھر دوریوں کی اوٹ میں
دھوپ چھاؤں کھیلنے کی کچھ ادا کس میں نہیں

وہ سراسر مہر ہے اخلاص ہے تہذیب ہے
کچھ اگر اس میں انا ہے تو انا کس میں نہیں

مت سمجھیو دل کی شورش کو وہی تم بھی نعیم
ہر گھڑی کچھ ٹوٹنے کی اک صدا کس میں نہیں

O

عشق سے اپنی نبھی ہو کہ زمانے سے چھنی
تم نے پوچھا نہیں افسوس کہ کیا ہم پہ بنی

ان کے کوچے میں بسا میں کہ پھرا شہر بہ شہر
در بہ در ساتھ پھرا دردِ غریب الوطنی

جذبۂ شوق کا شاہد ترا پیمانِ وفا
جرأتِ فکر کی مظہر تری پیماں شکنی

جب ملی دولتِ نایاب تمھارے غم کی
کشت و صحرا بھی ہوئے نقشِ کفِ پا سے غنی

کوئی تنہا نہیں دنیا میں بجز دردِ وفا
اس کے ہمدم ترے آنسو، نہ مری کوہ کنی

کتنے افکار کا زینہ ہے تری زلفِ دراز
کتنے خوابوں کا چمن ہے تری گل پیرہنی

عندلیبوں کی نوا بخششِ گل ہے تو نعیم
ہم بھی سیکھیں گے لبِ یار سے شیریں سخنی

---

* یہ غزل 1964 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

کچھ اصولوں کا نشہ تھا، کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

کوہ سے نیچے اُتر کر کنکری چنتے ہیں اب
عشق میں جو آب جو تھے جنگ میں سیلاب تھے

ساز و ساماں تھے ظفر کے پر وہ شب میں لٹ گئے
خاک و خوں کے درمیاں کچھ خواب کچھ کم خواب تھے

کیا دمِ رخصت نظر آتے خطوطِ دلبری
نقش تھے اُس چاند کے لیکن بشکلِ آب تھے

میں عدو کی جستجو میں تھا کہ اک پتھر لگا
مُڑ کے جب دیکھا تو سینہ تانے کچھ احباب تھے

کیا فراق و فیض سے لینا تھا مجھ کو اے نعیم
میرے آگے فکر و فن کے کچھ نئے آداب تھے

○

کوئی بہار کا جھونکا تو کیا سنوارے گا
وہ برگ ہوں جسے دستِ خزاں نکھارے گا

یہ بادباں یہ ہوائیں، یہ ناخدا سب ہیچ
افق کے پار کوئی اور ہی اُتارے گا

وہ بے وفا تو یہ دنیا ہے بے نیاز بہت
بچھڑ کے اُن سے کہاں روز و شب گزارے گا

یہ حادثہ جو بھنور بن کے یوں ڈبوتا ہے
گہر بنا کے مجھے ایک دن ابھارے گا

ابھی خیال کی لو ہوں خلا میں رہتا ہوں
کوئی تو دل میں مرا نقشِ جاں اتارے گا

لباسِ شعر میں جب ان کی جستجو ٹھہری
مرا وجود انھیں حشر تک پکارے گا

نعیم فن کا جنوں ہے تو باخبر ہوں میں
زمانہ سینکڑوں آشوب سے گزارے گا

○

(ولی گجراتی کی نذر)

کچھ سخن فہم کچھ سیاسی ہے
اپنا محبوب دلی واسی ہے

عشق کا فن قدیم ہے پھر بھی
اس کا ہر کلیہ قیاسی ہے

خوش نصیبی ہے جانا اس کو
اس میں وہ نورِ غم شناسی ہے

میرے شعروں میں بس گئی آخر
اس کی آنکھوں میں جو اُداسی ہے

مجھ سے مت بھولیو وفا کرنا
روح کب سے وفا کی پیاسی ہے

تجھ سے اپنا دماغ ہے روشن
دھوپ دل میں بھی اچھی خاصی ہے

O

یکساں تھے سب نگاہ میں چھوٹے ہوں یا بڑے
دل نے کہا تو ایک زمانے سے ہم لڑے

زنداں کی ایک رات میں اتنا جلال تھا
کتنے ہی آفتاب بلندی سے گر پڑے

سیرِ فلک سے خون کی گردش بڑھی تو ہے
تھکنے لگے تھے پاؤں زمیں پہ کھڑے کھڑے

ہم کو بھی اے بگولو سوئے دشت لے چلو
ہم خاک ہو چلے ہیں گلی میں پڑے پڑے

اک یاد آنسوؤں کی جھڑی بن گئی نعیم
کچھ پھول بن کے آگ ترے لب سے کیا جھڑے

○

شبیہِ ماہ لیے آسماں سے اُترا ہے
جدھر بھی جاؤں وہی دل نواز چہرا ہے

جو تم ملو تو یہ دنیا ہے آبشار و چمن
ملو نہ تم تو یہ دُنیا سراب و صحرا ہے

غرض کہ ہوگئے روپوش سب کے سب جاں باز
وفا کے نام پہ یہ واقعہ بھی گزرا ہے

نہ گفتگو نہ عنایت نہ کوئی رختِ جہاں
سرائے دل میں عجب شخص آ کے ٹھہرا ہے

تری نگاہ نے پوچھا تو میں بتا نہ سکا
یہ رنگ رنگِ تعلق ہے اور گہرا ہے

گزر ہی جائے گی آفات کی گھٹا بھی حسن
حیات خود ہی گھڑی دو گھڑی کا لہرا ہے

ڈھونڈو تو صرف آنچ ہے، شعلہ کہیں نہیں
جلتا ہے دل کہ غم کا سراپا کہیں نہیں

آنکھوں کی خاک دھول کو شبنم سے دھوئیے
جو تھا نگارِ دشت وہ چشمہ کہیں نہیں

تفصیلِ غم تو درج ہے لوحِ حیات پر
خود زندگی کا کوئی خلاصہ کہیں نہیں

کہتے تھے کچھ رفیق جو آئے ہیں لوٹ کے
وہ تختۂ گلاب وہ خیمہ کہیں نہیں

اس گھر میں سب مرید اسی مہرباں کے ہیں
جس پیکرِ جمال کا جلوہ کہیں نہیں

سامانِ صد چمن تھا اٹھائے ہوئے نسیم
وہ کاروانِ ابر جو اترا کہیں نہیں

○

(نذرِ غالب)

قصیدہ تجھ سے، غزل تجھ سے، مرثیہ تجھ سے
ہر ایک حرف ہوا صاحب نوا تجھ سے

زباں کشائی غم سے کھلی کتابِ خیال
ورق ورق پہ کھلا حسن مدعا تجھ سے

زمیں سے پھوٹ پڑا، چشمۂ جنوں ساماں
گلوں میں سرد پڑی آتشِ قبا تجھ سے

کہاں سے زود فراموشیوں کی خو سیکھی
جو دیکھیے تو نہ تھی برق، آشنا تجھ سے

پہنچ تو جاتا سیرِ خیمۂ وفا آباد
مگر ہے ست قدم عمرِ تیز پا تجھ سے

کیے تھے کام جو دل کے سپرد ان کو بھی
دماغ دہر سے بڑھ کر ہے اب گلہ تجھ سے

ہوا جو کوچۂ تنقید میں حسن رسوا
ملایا غیب نے غالب کا سلسلہ تجھ سے

○

نہ میرے خواب کو پیکر، نہ خد و خال دیا
بہت دیا تو مجھے موقعِ وصال دیا

ملا نہ روح نہ دل کا کوئی حساب مگر
یہ کارِ زیست کسی طور سے سنبھال دیا

تمام عمر کی بے چینیوں سے کچھ نہ ہوا
مرے جنوں کو 'خرد' کہہ کے اُس نے ٹال دیا

کسی نگاہ نے اُمید کو دیا چہرہ
کسی شبیہ نے سب سے حسیں خیال دیا

مرے محبوب کی تصویر اس طرح کھینچی
مرے ہنر کو پسِ پشت اُس نے ڈال دیا

کئی خیال جو آوارہ خو تھے، سرکش تھے
اُنھیں بھی شعر کے سانچے میں ہم نے ڈھال دیا

اُسی نے سر پہ بٹھایا تھا جس نے آج نعیم
سمجھ کے پاؤں کا کانٹا، مجھے نکال دیا

○

جنوں سے قیمتِ حسنِ طلب وصول کرو
مرا سلام، مری بندگی قبول کرو

مرے لہو میں ہیں خوابیدہ ابر و بادِ حیات
مجھے نہ یاس کے طوفانو! یوں ملول کرو

میں در کے پاس کھڑا ہوں نکل چلو اس رات
تم اپنے خواب سے بچنے کی اب نہ بھول کرو

جمالِ یار کو یادوں میں یوں کرو تحلیل
ہنسی کو موجِ صبوحی، لبوں کو پھول کرو

وفا کے سارے قواعد بتا رہے ہو جسے
بیان اس سے محبت کے بھی اصول کرو

کبھی تو سر سے اتارو خمارِ خوش طلبی
دراز دست بنو، خواہشِ فضول کرو

روش روش پہ اٹھاؤ گلوں کے ناز نعیم
میانِ دشت مگر خدمتِ ببول کرو

* یہ غزل 1969 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

دیکھ لوں صورتِ الفاظ تو معنیٰ دیکھوں
آرزو ہے کہ ہر اک درد کا چہرہ دیکھوں

قصبہ و شہر میں ہے آگ کا طوفاں برپا
کون سی شاخ پہ چڑھ کر یہ نظارہ دیکھوں؟

کوچہ ویراں ہے، ستوں سوچ رہا ہے کب سے
کیا دھرا ہے جو مکینوں کا میں رستہ دیکھوں

مثلِ سیاح کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے
دیکھوں میں حلقۂ زنجیر کہ دنیا دیکھو

شورِ زنداں میں یہی باعثِ تسکیں ٹھہرا
آنکھ جھپکاؤں تو ممکن ہے کہ سپنا دیکھوں

مجھ کو ہر رنگ میں وہ شخص بھلا لگتا تھا
اس کو نم دیدہ و خاموش کہ ہنستا دیکھوں

اک ندا کوہ کی چوٹی سے بلند ہے کہ حسن
جھاڑ لوں گردِ سفر، آس کا خیمہ دیکھوں

○

خواب کی راہ میں آئے نہ در و بام کبھی
اس مسافر نے اٹھایا نہیں آرام کبھی

رشکِ مہتاب ہے اک داغ تمنا کب سے
دل کا نظارہ کرو آکے سرِ شام کبھی

شب بخیر، اس نے کہا تھا کہ ستارے لرزے
ہم نہ بھولیں گے جدائی کا وہ ہنگام کبھی

سرکشی اپنی ہوئی کم، نہ امیدیں ٹوٹیں
مجھ سے کچھ خوش نہ گیا موسمِ آلام کبھی

ہم سے آواروں کی صحبت میں ہے وہ لطف کہ بس
دو گھڑی مل تو سہی، گردشِ ایام کبھی

اے صبا میں بھی تھا آشفتہ سروں میں یکتا
پوچھنا دلّی کی گلیوں سے مرا نام کبھی

○

فسانہ غم کا کوئی غم گسار ہو تو کہیں
کہانی دل کی کوئی دل نگار ہو تو کہیں

وہاں یقین کہ خود ہی کہیں گے حرفِ جنوں
یہاں یہ فکر فضا سازگار ہو تو کہیں

جنوں کی کون سی منزل میں مل رہا ہے سکوں
ہماری طرح کوئی بے قرار ہو تو کہیں

کہیں فسانۂ ہجراں بہ ربطِ ذکرِ وفا
کسی کا اب نہ تمھیں انتظار ہو تو کہیں

اسی میں چھیڑا نہ ہم نے فسانۂ شبِ غم
کہ ان کی شام بھی کچھ سوگوار ہو تو کہیں

وہ مسکرائے کہ برہم ہوئے گزارش پر
جو اپنی آنکھوں پہ کچھ اعتبار ہو تو کہیں

کہانی دورِ جنوں کی کہیں تو کس سے نعیم
جہاں میں ہم سا کوئی غم شعار ہو تو کہیں

○

رات گزری کہ شبِ وصل کا پیغام ملا
سوگئے خواب کی بانہوں میں جو آرام ملا

ڈھونڈتے رہے شب و روز امیدوں کے قدم
کوچۂ زیست میں لے دے کے یہی کام ملا

خوبیِ بخت کہ جب بھول چکا تھا سب کچھ
بے وفائی کا لبِ غیر سے الزام ملا

پا پیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی
جھک کے تعظیم سے شہزادۂ ایام ملا

ہم نے بیچی نہیں جس روز متاعِ غیرت
اک پیالہ بھی نہ مے کا ہمیں اس شام ملا

مختصر یہ ہے کہ جب وقتِ وداعِ گل تھا
خواب میں آکے گلے مجھ سے وہ گل فام ملا

ہم جنوں، ہے کہ نہیں راہ میں پوچھیں گے نعیم
دشتِ غربت میں یہ کیا کم ہے کہ ہم نام ملا

○

کوئے رسوائی سے اٹھ کر، دار تک تنہا گیا
مجھ سے جیتے جی نہ دامن خواب کا چھوڑا گیا

کیا بساطِ خار و خس تھی، پھر بھی یوں شب بھر جلے
دوش پر بادِ سحر کے دور تک شعلہ گیا

روح کا لمبا سفر ہے ایک بھی انساں کا قرب
میں چلا برسوں تو ان تک جسم کا سایہ گیا

کس کو بے گردِ مسافت شوق کی منزل ملی
نغمہ گر کی خلوتوں تک بارہا نغمہ گیا

کون مجھ کو ڈھونڈتا تھا، کچھ پتا چلتا نہیں
بزمِ خوباں میں ہزاروں بار میں آیا گیا

ہم وہ شاعر کہ سناتے ہیں سرودِ جاں حسن
ایک بھی شعلہ نفس محفل میں گر دیکھا گیا

مل گئے جب نرما دیشور دشتِ غربت میں نعیم
اک نیا رشتہ عظیم آباد سے جوڑا گیا

---

* یہ غزل 1968 میں شکاگو میں لکھی گئی۔

○

چہرے پہ مہرِ غم ہے، خط و خال کی طرح
ماضی بھی دم کے ساتھ ہے اب حال کی طرح

پتے تھے خاک بوس تو شاخیں تھیں سرنگوں
کنجِ چمن بھی تھا، دلِ پامال کی طرح

تہذیب ہے کہ آئے تو نفس بول کر گئے
چپکے سے جایئے نہ مہ و سال کی طرح

اپنے حروفِ شوق جو شعلہ بجاں تھے کل
ٹھنڈے پڑے ہیں آج وہ اقوال کی طرح

سب کے ستارے دیکھ کے دل نے صلاح دی
گردش میں کیوں پڑوں کسی رمال کی طرح

آنچل میں نیند باندھ کے اے رات آ بھی جا
یہ دن لگا ہے جان کو جنجال کی طرح

رکھیے بچا کے اپنا دفینہ حسن نعیم
غم کو لٹایئے نہ زر و مال کی طرح

○

کوہ کے سینے سے آبِ آتشیں لاتا کوئی
اس نوائے آگہی کو ڈوب کر گاتا کوئی

دیکھنا مستی کا سنگم، لب ہے یا گفتار ہے
جام سے میرے جو اپنا جام ٹکراتا کوئی

بادلوں کی طرح آیا، برق آسا چل دیا
چاند کی مانند شب بھر تو ٹھہر جاتا کوئی

حسن کا دل سے تعلق دائمی ہے، گرم ہے
ورنہ کس کا کس سے ہے رشتہ کوئی، ناتا کوئی

سازِ شعلہ پر سناتا گیت پورب دیس کے
اتنی بے مہری ہے برسوں آگ برساتا کوئی

مانگنے کو مانگ لیں اشعارِ غم سے دلکشی
مل نہیں سکتا ہے ان کو فکر سا داتا کوئی

نازشِ فردا مرا اوجِ تغزل ہے نعیم
رنج ہوتا آج گر کچھ قدر فرماتا کوئی

---

* یہ غزل 1968 میں نیویارک میں لکھی گئی۔

(قحط کے پس منظر میں)

غم کی پونجی سے زر و مال کمانے والے
ہم خزانہ ہیں، اگر تم ہو خزانے والے

گوریاں اپنی منڈیروں پہ کھڑی ہیں کب سے
جانے کس دیس گئے ناز اٹھانے والے

وہ برا وقت پڑا ہے کہ پرندے روئے
شہر سے لوٹے نہیں دھوم مچانے والے

رت جگے لے کے گئے جن کو ابھی تھا جینا
سو چکے خاک تلے عشق جگانے والے

اٹھ کے چوپال سے کس اور نکل جاؤں نعیم
کھیت ویراں ہیں تو خاموش ہنسانے والے

○

خیر سے دل کو تری یاد سے کچھ کام تو ہے
وصل کی شب نہ سہی، ہجر کا ہنگام تو ہے

نورِ افلاک سے روشن ہو شبِ غم کہ نہ ہو
چاند تاروں سے مرا نامہ و پیغام تو ہے

کم نہیں اے دلِ بے تاب متاعِ اُمید
دستِ مے خوار میں خالی ہی سہی، جام تو ہے

بامِ خورشید سے اُترے کہ نہ اُترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

جو بھی الزام مرے عشق پہ آیا ہو نعیم
ان سے وابستہ کسی طور مرا نام تو ہے

---

* یہ غزل 1959 میں جدہ میں لکھی گئی۔

○

صبحِ طرب تو مست و غزل خواں گزر گئی
شامِ الم جو آئی، تو آکر ٹھہر گئی

دیکھا کسی نے اوجِ تصور، نہ اوجِ فن
پنہاں تھا ایک عیب تو سب کی نظر گئی

یادِ خدا سے بابِ حرم تک کھلا نہیں
یادِ بتاں سے دل پہ قیامت گزر گئی

تڑپا قفس میں کون جو اے صبحِ نو بہار
روئے گل و گیاہ، صبا چشمِ تر گئی

اتنا دلِ نعیم کو ویراں نہ کر حجاز
روئے گی موجِ گنگ جو اس تک خبر گئی

---

* یہ غزل 1958 میں مکہ میں لکھی گئی۔

○

بیانِ شوق بنا، حرفِ اضطراب بنا
وہ اک سوال کہ جس کا نہ کچھ جواب بنا

میں ایک باب تھا افسانۂ وفا کا مگر
تمھاری بزم سے اٹھا تو اک کتاب بنا

مجھے سفیر بنا اپنا کو بہ کو اے عشق
کسے ہوس ہے کہ دنیا میں کامیاب بنا

میں جس خیال کو اپنا جنوں سمجھتا تھا
وہی خیال زمانے کا حسنِ خواب بنا

کبھی تو وجہِ کرم بن گئی خود داری
کبھی نیازِ طلب باعثِ عتاب بنا

سرائے دل میں جگہ دے تو کاٹ لوں اک رات
نہیں یہ شرط کہ مجھ کو شریکِ خواب بنا

امیرِ چرخ کا احساں نہیں ہے مجھ پہ نعیم
مجھے ہے ناز کہ ذرّہ سے آفتاب بنا

* یہ غزل 1963 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

جیسا کہ وہ حسیں مرے حسنِ بیاں میں تھا
اپنے لباسِ خاص نہ جسم عیاں میں تھا

وحشت سرائے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی
دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

اڑتے رہے پرند کئی بحر و بر کے بیچ
لیکن کہاں وہ لطف جو اک آشیاں میں تھا

مجھ سے ہوا وہ دور تو کوچہ نورد ہوں
وہ تھا مرے قریب تو میں سائباں میں تھا

شہنائیوں کی گونج نے روکا قدم کو جب
پگڈنڈیوں سے دور رہِ کہکشاں میں تھا

جھیلوں کے آس پاس تھے خیمے سکوت کے
ہنگامۂ حیات تو آبِ رواں میں تھا

مجھ جیسے زود رنج نہ کرپائے خودکشی
کچھ تو وفا کا ڈھنگ بھی جورِ جہاں میں تھا

بس وہ تھا جس کی بات بھلی یا بری لگی
یہ وصف یہ کمال اسی مہرباں میں تھا

ان انگلیوں نے بڑھ کے اٹھایا قلم نعیم
ہیروں کا ورنہ کان بھی دستِ گماں میں تھا

○

مری مژہ پہ جو قطرہ دکھائی دیتا ہے
تری پلک پہ ستارہ دکھائی دیتا ہے

اگر اڑان ہو اونچی تو بحرِ اعظم بھی
ہرا بھرا سا جزیرہ دکھائی دیتا ہے

جو ڈوبنا ہو مقدر تو عین ساحل پر
بھنور کی اُور کنارا دکھائی دیتا ہے

بجھی یہ آگ نہ دریا نہ ابرِ باراں سے
ازل سے بحر پیاسا دکھائی دیتا ہے

اسے سراب بھی حیراں نہ کرسکا جس کو
دلِ گلاب میں صحرا دکھائی دیتا ہے

یہ شخص جس کو لطیفے ہیں سینکڑوں ازبر
ہنسے تو اور فسردہ دکھائی دیتا ہے

میں اس کی تان سے یوں جذب کا سراپا ہوں
وہ ہر خیال کا نغمہ دکھائی دیتا ہے

وہ میرے شعر کی مانند کج کلاہ سہی
نظر ملاؤ تو اپنا دکھائی دیتا ہے

میں اپنی روح میں اس کو بسا چکا اتنا
اب اس کا حسن بھی پردہ دکھائی دیتا ہے

اسی پہ ختم ہیں یاروں کی محفلیں بھی نعیم
جو دیکھنے میں اکیلا دکھائی دیتا ہے

○

میں غزل کا حرفِ امکاں، مثنوی کا خواب ہوں
اپنی سب روداد لکھنے کے لیے بے تاب ہوں

میں ببولوں کی طرح پھولا پھلا ہوں دشت میں
ابر آئے یا نہ آئے، میں سدا شاداب ہوں

موجِ صہبا ہوں اگر ہے ظرفِ یاراں آئینہ
کچھ غبار آئے نظر تو سربسر گرداب ہوں

میں ہوں اک ویراں ستارا گر ہے کوئی ناشناس
کوئی ہے روشن نظر تو چشمۂ مہتاب ہوں

کیا سمجھ کر مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار
آپ اپنا روز و شب ہوں، آپ عالم تاب ہوں

○

لطفِ آغاز ملا، لذتِ انجام کے بعد
حوصلہ دل کا بڑھا، کوششِ ناکام کے بعد

اب خدا جانے تجھے بھی ہے تعلق کہ نہیں
لوگ لیتے ہیں مرا نام، ترے نام کے بعد

میکدہ تھا تو وہیں روز چلا جاتا تھا
اب کہاں کوئی ٹھکانہ ہے مرا شام کے بعد

کوئی آیا ہی نہیں کوئے وفا تک ورنہ
کچھ بھی مشکل نہیں یہ راہ دو اک گام کے بعد

وقت کتنا رہا کتنی رہیں راہیں لیکن
ہم نے دیکھا تمھیں مُڑ مُڑ کے ہر اک گام کے بعد

کچھ تو ساقی سے گلہ ہوگا حسن کو ورنہ
کون میخانے سے اٹھتا ہے دو اک جام کے بعد

---

* یہ غزل 1956 میں نئی دہلی میں لکھی گئی۔

○

حسن کے سحر و کرامات سے جی ڈرتا ہے
عشق کی زندہ روایات سے جی ڈرتا ہے

میں نے مانا کہ مجھے ان سے محبت نہ رہی
ہم نشیں! پھر بھی ملاقات سے جی ڈرتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ ابھی دل کو سکوں ہے لیکن
اپنے آوارہ خیالات سے جی ڈرتا ہے

اتنا رویا ہوں غمِ دوست ذرا سا ہنس کر
مسکراتے ہوئے لمحات سے جی ڈرتا ہے

کس گھڑی کون سی وحشت میں کرے مجھ کو شریک
عشق کی ایک اسی بات سے جی ڈرتا ہے

جو بھی کہنا ہے کہو صاف شکایت ہی سہی
ان اشارات و کنایات سے جی ڈرتا ہے

ہجر کا درد نئی بات نہیں ہے لیکن
دن وہ گزرا ہے کہ اب رات سے جی ڈرتا ہے

کون بھولا ہے نعیم ان کی محبت کا فریب
پھر بھی ان تازہ عنایات سے جی ڈرتا ہے

* یہ غزل 1950 میں پٹنہ میں لکھی گئی۔

○

میں جنم جنم کا انیس ہوں، کسی طور دل میں بسا مجھے
کوئی رنج ہے تو غمیں نہ ہو، کوئی درد ہے تو دکھا مجھے

یہ تمام سبزہ و آب جو، یہ تمام خیمۂ رنگ و بو
ترے جس خیال کا عکس ہوں وہ خیال کردے عطا مجھے

جنھیں حرفِ جاں کی خبر نہیں، وہ پڑھانے آئے کتابِ جاں
جنھیں کوئی علمِ وفا نہ تھا، وہ سکھانے آئے وفا مجھے

میں نیازمندِ جنوں سہی، مجھے عقل سے بھی ہے واسطہ
کسی خواب کی نہ جھلک دکھا، ترے پاس کیا ہے دکھا مجھے

تری گفتگو سے گماں ہوا، کوئی بات میری بھلی لگی
میں نعیم ہوں کہ حسن ہوں اب، یہی بات پہلے بتا مجھے

آرزو کی راکھ سے چنگاریاں لے کر چلے
دور سے آئے تھے ملنے، دوریاں لے کر چلے

ہر سفر ایسا کہ آنکھوں سے بہے چشمے کئی
ہر نگر ایسا جلے کچھ، اور دھواں لے کر چلے

کچھ نہ تھا اپنی گرہ میں اُن کی خوشبو کے سوا
صحرا صحرا ہم گلوں کی بستیاں لے کر چلے

جب سنا وہ چاند پھر اُترا ہے اپنے شہر میں
ہم بھی ساری رات سر پہ کہکشاں لے کر چلے

حُسن کا دربار بھی بازارِ دنیا ہے نعیم
اپنے خوابوں کا خزانہ تم کہاں لے کر چلے

○

جادوئے خواب میں کچھ ایسے گرفتار ہوئے
بارشِ سنگ ہوئی بھی تو نہ بیدار ہوئے

جب تھے خوش حال، بھلے لگتے تھے رشتے غم کے
اب وہی رشتے مری جان کا آزار ہوئے

جب تلک پاؤں میں وحشت تھی، جنوں میں طاقت
نہ کسی سایے میں بیٹھے، نہ کبھی خوار ہوئے

ق

میں نے جب گلف میں کچھ دولت و عزت پائی
عالمِ فن بھی مرے حق میں رضاکار ہوئے

جب کھلے نقد کے اوصاف بہ فیضِ 'نقدی'
کچھ رسالوں کے 'اڈیٹر' بھی طرفدار ہوئے

وصل سے جن کے ہے مغرب میں قیامت سی بپا
ان ہی لونڈوں کے لیے میر جی بیمار ہوئے

گولیاں چلنے کو تیار تھیں پہلے سے نعیم
ہم تو بس جھنڈا اُٹھانے کے گنہ گار ہوئے

○

دریچے قصرِ تمنا کے پھر کھلے تو سہی
ملے وہ آخر شب میں مگر ملے تو سہی

ادھر عدم کا یہ اصرار بس چلے آؤ
ادھر وجود کو ضد، خاک میں ملے تو سہی

جلیں گے رشک سے وہ بھی جو میرے دوست نہیں
چراغِ لالہ میرے دشت میں جلے تو سہی

گئی کہاں ہے ابھی چشم و دل کی ویرانی
ترے قدم سے بس خوابِ گل کھلے تو سہی

چھڑا کے قید سے پریوں کو کیسے لاؤں نعیم
اُڑیں پہاڑ تو ہر سو، زمیں ہلے تو سہی

○

سچ ہے اب عشق وہ منصب اعلا بھی نہیں
شاہِ شمشاد قداں، افسرِ بالا بھی نہیں

اُس کی رنگت سے مشابہ نہیں آئینۂ گُل
اُس کی صورت کا بدل صورتِ لالہ بھی نہیں

اک طلب عام سی ہے اس کے بدن کی سب کو
میں نہ چاہوں تو کوئی چاہنے والا بھی نہیں

ایسا ویراں ہوا یہ شہر کہ مے کیا ملتی
دستِ مجبور میں مٹی کا پیالا بھی نہیں

تونے چھوڑا تو وہی دل ہے اب ایسا مندر
عود کی بو بھی نہیں، نور کا ہالا بھی نہیں

○

شب کے جنگل میں ہے گُم ماہِ تمنا کب سے
اِن ستاروں سے پریشان ہے دنیا کب سے

آمرے پاس، مرے جذب کا مرکز بن جا
میں بھی اک غم سے ہوں آزردہ و تنہا کب سے

اب تو اس مہدیٔ موعود کو ظاہر کردے
منتظر جن کی قیادت کا ہے بندہ کب سے

روز اک منصف و صادق کو سزا ملتی ہے
روز ہوتا ہے یہی کھیل تماشا کب سے

نہر کی سیر کراؤ، اسے اپنا کرلو
مست و آوارہ پھرا کرتا ہے دریا کب سے

آج تک اپنے علائق سے ہوں عاجز ورنہ
ظلم سے جنگ کا ہے میرا ارادہ کب سے [1]

---

1 یہ شعر 'دبستان' میں نہیں ہے لیکن 'شعر و حکمت' از: شہریار و مغنی تبسم، کتاب دو، دورِ سوم، مارچ 2001 کے انتخابِ غزلیات میں حسن نعیم کی متعلقہ غزل بحوالہ (28 جون 1988 بشکریہ: باقر مہدی) کے ساتھ چھپی ہے جس میں یہ شعر موجود ہے۔

○

بچھڑیں تو شہر بھر میں کسی کو پتا نہ ہو
تم کو بھی کچھ ملال، ہمیں بھی گلہ نہ ہو

مجلس کہ خواب گاہ، جہاں بھی نظر ملی
ان کو یہی تھا خوف کوئی دیکھتا نہ ہو

میری غزل میں جیسا ترنم ہے، سوز ہے
اکثر ہوا گماں کہ اُسی کی صدا نہ ہو

جن حادثوں کی آگ سے ایوانِ دل جلا
ممکن نہیں چراغِ سخن بھی جلا نہ ہو

اُن سے الگ ہوا تو یہی فکر ہے نعیم
اُن کا تپاک و مہر کہیں واقعہ نہ ہو

○

اب انیسِ جاں کسی غیبی مدد کی آس ہے
جو یقیں میرا عصا تھا وحشیوں کے پاس ہے

جل گئے ہیں بام و در کے ساتھ کتنے سلسلے
بچ گئی ہے جاں تو ہم سائے کا لطفِ خاص ہے

ایک وردی پوش نے آنگن کو یوں مقتل کیا
شہر کی آب و ہوا میں اب لہو کی باس ہے

مل گئی یوں خاک میں اَجداد کی محنت کہ اب
ہر نئی کونپل کی پیشانی پہ گردِ یاس ہے

انقلابِ نو سے ہیں اُمید کے رشتے کئی
بس یہی اک مہرِ امکاں آدمی کے پاس ہے

○

خیال و خواب میں کب تک یہ گفتگو ہوگی
اٹھاؤ جام کہ اب بات روبرو ہوگی

ابھی ہوں پاس تو وہ اجنبی سے بیٹھے ہیں
میں اٹھ گیا تو بہت میری جستجو ہوگی

مجھے بتاؤ تو کچھ کام آسکوں شاید
تمھارے دل میں بھی اک فصلِ آرزو ہوگی

تجھی کو ڈھونڈتا پھرتا تھا دربدر پھر بھی
مجھے یقین تھا رسوائی کو بہ کو ہوگی

بدل گیا بھی اگر وہ تو دیکھنے میں نعیم
وہی لباس وہی شکل ہوبہو ہوگی

○

رشک اپنوں کو بھی ہے ہم نے جو چاہا ملا
بس ہمیں واقف ہیں کیا مانگا خدا سے کیا ملا

جس زمیں پہ میرا گھر تھا کیا محل اٹھا وہاں
میں جو لوٹا ہوں تو خاکِ در، نہ ہم سایہ ملا

دیکھیے کب تک ملے انسان کو راہِ نجات
لاکھ برسوں میں تو ویراں چاند کا رستہ ملا

ہر سفر اک آرزو ہے ورنہ سیرِ دشت میں
کس کو شہزادی ملی ہے کس کو شہزادہ ملا

سب پرانے داغ دل ہی میں رہے آخر نعیم
ہر نئے دُکھ میں نہ پچھلے دُکھ سے چھٹکارا ملا

○

کیا بتاؤں کتنا رویا سچ کو سچ کہتے ہوئے
جان نکلی تن سے گویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

ایک طوفاں زیرِپا تو اک قیامت سر پہ ہے
ہم نے کس آندھی کو بویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

چھٹ گئے احباب سارے، اُن کا دامن بھی چھٹا
ہم نے سب کچھ جن سے کھویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

رائگاں تھا دیدۂ بینا بھی، نورِ عقل بھی
کیل کی چادر پہ سویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

ان کے نیزوں کے علاوہ برسے پتھر جب نعیم
خون سے کمبل بھگویا سچ کو سچ کہتے ہوئے

○

سُن اِس طرح کہ شور بھی نغمہ سنائی دے
اتنی نہ آنکھ کھول کہ دنیا دکھائی دے

انصاف کے اصول میں کوئی لچک نہ رکھ
جھک جا بروں کے بیچ نہ اپنی صفائی دے

کہرے میں آفتاب کہ مایوسیوں میں آس
جینے کی ہو سبیل تو سب کچھ دکھائی دے

دیکھا نہیں ہو جس نے ترے دل کا آئینہ
کیا قیمت نگاہ شب رونمائی دے

لپٹی ہے سب کے پاؤں سے زنجیرِ غم نعیم
کس میں ہے اتنا زور کہ غم سے رہائی دے

○

اپنی صفوں میں علم ہے، جرأت ہے وقت ہے
ایسا نہیں کہ سچ کا مقدر شکست ہے

کس کس کو ہم دکھائیں عزائم کے لالہ زار
ہر آشنا کے پاس مصائب کا دشت ہے

تنکے تمام چمن کے ہیائیں اڑی چلیں
ان جھاڑیوں کے بعد سہانا درخت ہے

اپنے جنوں کے دوست ہیں سورج بھی چاند بھی
مانا حسن نعیم ابھی دھوپ سخت ہے

کسے یقیں تھا جنوں کی بہار دیکھوں گا
دیارِ جاں میں کوئی لالہ زار دیکھوں گا

گماں نہ تھا کہ یہ شب چاندنی میں بدلے گی
میں دوپہر میں شجر کا سنگھار دیکھوں گا

کسے خبر تھی مسرت کے دن بھی آئیں گے
غموں کی رات کو میں اشک بار دیکھوں گا

پتا نہ تھا کہ وہ اُترے گا پیکرِ گُل میں
اُسی کو پاس دمِ انتظار دیکھوں گا

یہی یقیں ہے کہ مہتابِ آسماں کو نعیم
جھکا جھکا سا سرِ بزمِ یار دیکھوں گا

○

کس کو کیا دیتا، یہاں حصہ مرا ہی کیا تھا
آسمانوں سے تہِ سنگ گرا ہی کیا تھا

غم نہیں مسکنِ احساس جو ٹھہرا ہے دماغ
دل کے ساغر میں سوا خوں کے بھرا ہی کیا تھا

میں ہوں نایاب نہ اخلاص و وفا ہیں نایاب
یاد کیوں رکھیے مجھے، مجھ میں دھرا ہی کیا تھا

کیا ٹھہرتا کوئی صحرائے تمنا میں حسن
برگِ ماضی کے سوا اس میں دھرا ہی کیا تھا

○

کیوں روشنی میں لاؤں گا مایا کا اصل روپ
بدبخت ہوں جو دیکھوں تمنا کا اصل روپ

ان کشتیوں میں چین سے سوتے ہیں کم نگاہ
آنکھیں کھلیں گی دیکھ کے دریا کا اصل روپ

جاگیر اپنی بانٹ کے درویش بن گیا
بس شوق تھا کہ دیکھ لوں دنیا کا اصل روپ

سمجھے گا کس طرح وہ اداکاریوں کا فن
دیکھا نہیں ہے جس نے 'تماشا' کا اصل روپ

دیکھا نگاہِ ابر سے جس سمت بھی نعیم
سرسبز و گل نواز تھا صحرا کا اصل روپ

○

یوں نہ غمگیں ہو کہ آخر میں بھی تیری آس ہوں
جب سے لوٹا ہوں سفر سے دیکھ تیرے پاس ہوں

سوچتا رہتا ہوں تجھ کو یوں غزل کے روپ میں
جیسے تو نغمہ ہو میرا، میں ترا احساس ہوں

ناامیدی سے پریشاں ہو کے مٹ جاتے ہیں لوگ
میں کہ اب تک جی رہا ہوں آرزو کی یاس ہوں

میں نہ طوفاں سے جھکا ہوں اور نہ آندھی سے دبا
ان درختوں سے تو اونچا ہوں بلا سے گھاس ہوں

مجلسوں کی روشنی ہوں پھر بھی لگتا ہے نعیم
میں کسی گوتم کا دکھ ہوں رام کا بن باس ہوں

○

کبھی دل کی شمع بجھاؤں گا، کبھی جاں کی شمع جلاؤں گا
تو وہ راگ ہے جسے عمر بھر ترے انتظار میں گاؤں گا

تو ہزار مجھ سے الگ رہے، میں ہزار تجھ سے جدا رہوں
کبھی نیند بن کے سلاؤں گا، کبھی درد بن کے جگاؤں گا

یہی ایک جی میں ہے وہم سا، یہی ایک سر میں جنوں سا ہے
تجھے اِس جنم میں نہ پاسکا، تو کسی جنم میں نہ پاؤں گا

ابھی اپنی خاک میں قید ہوں، ابھی تو بھی دامِ بلا میں ہے
تو گلاب بن کے کھلے گا جب، میں صبا کے روپ میں آؤں گا

تو جہاں چلے گا چلوں گا میں، تو جہاں رُکے گا رکوں گا میں
تری رہ گزر کا غبار ہوں، کبھی تجھ سے دور نہ جاؤں گا

مرے آفتاب نے کیا دیا، مجھے قربتوں کا صلہ نعیم
ابھی داغ چاند کے دیکھ لو، کبھی داغ اپنے دکھاؤں گا

○

ملا نہ کام کوئی عمر بھر جنوں کے سوا
تمام عیش میسر رہے، سکوں کے سوا

لگی وہ آگ کہ دیوار و در بھی چل نکلے
کوئی مقیم نہیں گھر میں اب ستوں کے سوا

میں اس کے جسم کی بیکل پکار سن بھی چکا
اب اس کی آنکھ میں رکھا ہے کیا فسوں کے سوا

پڑی وہ دھوپ کہ سب رنگ پڑ گئے پیلے
بچا نہیں ہے کوئی سرخ میرے خوں کے سوا

تمام فن کی بنا مدّ و جزرِ دل ہے نعیم
کہ شعر ۔ نغمہ ہیں کیا موجِ اندروں کے سوا

مکتبِ غم نے پڑھایا کیا کیا
پھر بھی خوش ہو کے لٹایا کیا کیا

اک الگ سوچ کا بانی کہہ کے
مجھ کو دنیا نے ستایا کیا کیا

پُرزے سڑکوں سے، گلی سے پتھر
اُن سے بچھڑے تو اٹھایا کیا کیا

مجھ کو خط لکھنا تو یہ بھی لکھنا
تم نے کھوکر مجھے پایا کیا کیا

سب نے جاں بیچ کے دیکھیں تو حسن
مال و اسباب کمایا کیا کیا

○

ایسی رُت ہے کچھ تمنا ہی نہیں
پھول کھلنے کا زمانہ ہی نہیں

اُن کے رستے میں ہے خوابوں کا جہاں
میں جہاں ہوں اُن کا رستہ ہی نہیں

سب سے وہ اچھا کہ ہنس کر جی گیا
جس نے دل کا روگ پالا ہی نہیں

اگلے وقتوں میں جہاں رہتے تھے لوگ
اب کہیں شاید وہ دنیا ہی نہیں

عشق سے روشن ہے اتنا دل نعیم
یہ دیا اب بجھنے والا ہی نہیں

○

وہ جو درد تھا ترے عشق کا، وہی حرف حرف سخن میں ہے
وہی قطرہ قطرہ لہو بنا، وہی ریزہ ریزہ بدن میں ہے

وہ نسیم جانے کہاں گئی، وہ گلاب جانے کدھر کھلے
کوئی آگ پچھلی بہار کی مرے قلب میں نہ چمن میں ہے

یہی وقت سیلِ رواں لیے مری کشتیوں کو ڈبو گیا
کوئی لہر آبِ حیات کی، ابھی گنگ میں نہ جمن میں ہے

دمِ صبح آج ہے دوپہر، نہ وہ چہچہے نہ وہ زمزمے
وہ پرندے اڑ کے کہاں گئے، کوئی شور گاؤں نہ بن میں ہے

جو ستارا قبلۂ راہ تھا، وہ شرار بن کے بجھا نعیم
یہ زمین چادرِ خاک ہے مرا چاند جب سے گہن میں ہے

○

فصل کاٹیں گے بقا کی، جو یہاں کچھ بوگئے
ورنہ سب ہی کاٹ کر اپنی سزائیں سوگئے

رہبروں کی چھڑگئی آپس میں جنگِ سرد کیا
روزنامے سب کی چادر کوچہ کوچہ دھوگئے

میرے کام آئی دعائے شب، نہ جوشِ بندگی
حادثے جتنے بھی ہونے تھے وہ آخر ہوگئے

رات بھر دیکھا ستاروں کو ابھرتے ڈوبتے
پھر در و دیوار کو تکتے ہوئے ہم سوگئے

وہ تمھیں ڈھونڈا کیا بازار، دلّی میں نعیم
تم نہ جانے کون سے جنگل میں جاکے کھوگئے

سیپ کے قلب میں طوفاں نے گہر رہنے دیا
یوں درختوں کو گرایا کہ ثمر رہنے دیا

سر پہ رکھ دیتا وہ اک تاج تو مارے جاتے
کم نہیں اس کا کرم خاک بہ سر رہنے دیا

کس نے اک عمر جلایا مجھے اے دشتِ طلب
دست و پا توڑ کے سامانِ سفر رہنے دیا

ایسا دشمن تھا کہ ہر خواب کو پامال کیا
نور سب کھینچ لیا، دیدۂ تر رہنے دیا

بس نمونے کی طرح تھوڑی سی پوشاک رہی
اس نے گیسو کو کمر تا بہ کمر رہنے دیا

○

وہ چھت اُڑی تو کھُلا آسماں کا جوہر بھی
زمیں ستارۂ ویراں تھی گھر سے باہر بھی

برس گیا کسی زنداں پہ ابر کا ٹکڑا
صدف کی قید میں تڑپا وہ شاہ گوہر بھی

بہارِ باغ تمنّا ہے آرزومندی
وگرنہ چشمۂ ویراں ہے دیدۂ تر بھی

نفس کی آمد و شُد کا یہ سلسلہ کب تک
کئی ہیں کام یہاں کارِ جاں سے بہتر بھی

حسینؓ پھر ہیں رواں کربلا کی سمت حسن
خوشا کہ اب کے نہیں کم حسینی لشکر بھی

○

انقلابِ آسماں پر میں یقیں کرنے لگا
یہ زمانہ جب مجھے گوشہ نشیں کرنے لگا

کیا بتاؤں کیسے کیسے پارسا قیدی بنے
حُسن کی وادی کو جب زیرِ نگیں کرنے لگا

جب مرے آنگن میں اُترا مہرِ غم تو شک ہوا
کیا کوئی میرے حوالے کُل زمیں کرنے لگا

صاف گوئی کی بنا پر جو انیسِ شام تھا
وقت کیا بدلا کہ وہ بھی ہاں، نہیں کرنے لگا

آنکھ سے دیکھے مناظر کو نہ جانا سچ نعیم
جو سنا اوروں سے اس پر بس یقیں کرنے لگا

○

آنکھیں کھلیں گی ان کی شبِ انقلاب میں
جو لوگ جی رہے ہیں کسی اور خواب میں

دائم ہے وہ سرور جو اپنی انا میں ہے
دو پل کا بس سرور ہے ظرفِ شراب میں

میری تھی ایسی عقل کہ بس ان کا ہوگیا
کتنے تھے ورنہ درس جنوں کی کتاب میں

مجھ کو بھی ہے یاد، ہمیشہ غمیں رہا
ہر آشنا کا درد تھا میرے حساب میں

دانشوروں کی تازہ روایت ہوں میں نعیم
سب سے الگ ہے نام تغزل کے باب میں

○

نہ پست قد ہے، نہ کوئی بلند قامت ہے
نگاہِ شعر میں ہر لفظ اک علامت ہے

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

تو جان لے کے بھی اپنا وجود کھوئے گا
میں جان دے کے بھی پاؤں گا سر سلامت ہے

وہ اور آپ ہی بیتاب ہوں وفا کے لیے
کچھ اپنا کشف ہے یا وقت کی کرامت ہے

میں آفتاب کی زد پر ہوں صبح و شام حسن
مری تلاش میں ہر مہرۂ قیامت ہے

○

دن کی فطرت میں عنایت نہ مسیحائی ہے
رات آئے تو سمجھیے کہ بُری آئی ہے

ہجر ہے یاد کی خوشبو میں بکھرتے رہنا
وصل اک تازہ گلستاں سے شناسائی ہے

اُن کی آنکھوں سے منور ہے جہانِ امکاں
اُن کی زلفوں سے معطر میری تنہائی ہے

اپنے داغوں کو تکا کرتے ہیں تارے شب بھر
چاند بھی اپنے ہی صحرا کا تماشائی ہے

حسن کیوں ایک ہی خلوت میں گرفتار رہے
عشق جب اپنی روایات میں ہرجائی ہے

نقش ایسے ہیں کہ شرمائے صنم خانۂ چیں
میری غزلوں میں حسنِ ہند کی رعنائی ہے

○

اس سے پہلے کہ دفن ہوجاؤ
وادیٔ فن میں کچھ تو بوجاؤ

وصل کی شب ضرور آئے گی
تم کسی طور آج سوجاؤ

اپنی ظالم انا سے بچنے کو
مجمعِ عاشقاں میں کھوجاؤ

کچھ تو اوپر اٹھوگے اپنے سے
حاسدو، جل کے راکھ ہوجاؤ

آنسوؤ تم سے کیا بچے دامن
ہاں یہ دھبے تو غم کے دھوجا

میر و بیدل کی پیروی سے نعیم
کچھ تو دنیا میں تم بھی بو جا

○

وہ ایک شعر جو فریادیوں کے لب پہ تھا
وہ میرے فکر کی دولت، جنوں کا جوہر تھا

سبھی عزیز مری کھوج میں گئے ہوں گے
میں جب گیا ہوں تو کتنا ہرا بھرا گھر تھا

ہمیں نے آئینہ دل کا کچھ اس طرح رکھا
کبھی وہ مہر، کبھی بے رُخی کا منظر تھا

کسی کے بخت میں گوہر بھی، عیشِ ساحل بھی
مرے نصیب میں لاکھوں بھنور کا چکر تھا

رئیسِ نقد کہاں مجھ کو ڈھونڈتا کہ نعیم
کوئی دوکان تھی میری نہ کوئی دفتر تھا

○

(ارشاد نعیم کے لیے)

زمانہ تیری ذہانت کا جب عدو ہوگا
مری نگاہ میں اس دم تو سرخ رو ہوگا

یہ دکھ ہے کون بسائے گا درگہِ مخدومؒ
نہ میں چراغِ وراثت رہا، نہ تو ہوگا

اِسی اُمید میں اِس کربلا کی خدمت کی
کبھی تو اپنا لہو غنچۂ نمو ہوگا

کوئی تو علم کو دے گا عمل کی شہ زوری
کوئی تو لائقِ تکریم و گفتگو ہوگا

وہ انقلاب جو بختِ جہاں بدلتا ہے
وہ انقلاب کسی لمحہ کو بہ کو ہوگا

کسی جنوں میں کسی جستجو میں جی لینا
قلم بھی ورنہ یہاں سیف در گلو ہوگا

ہوئی قبول دعائے سحرگہی تو نعیم
امامِ وقت کسی آن روبرو ہوگا

○

جہانِ شعر میں ہر چند جابجا ٹھہرا
غزل کے در پہ خیالوں کا قافلہ ٹھہرا

اُسے پڑی تھی خوشی سے لے ملانے کی
کھنکتے جام میں اک پل نہ قہقہہ ٹھہرا

بدل کے بھیس میں آتا رہا ہوں دنیا میں [1]
تمھی بتاؤ کہ تم سے کہاں جدا ٹھہرا

لڑا تو لشکرِ سلطاں سے جم کے میداں میں
بلا سے مجلسِ خوباں میں بے وفا ٹھہرا

خلا کی سرد سلوکی مری زمیں میں نہیں
رہی نہ روح تو میں خاکِ خوشنما ٹھہرا

لکھو گے کیسے حَسن خود کو صرف تم زیدی
تمھارا سارے شہیدوں سے سلسلہ ٹھہرا

---

[1] حسن نعیم کے چھوٹے صاحب زادے اشعر نعیم نے اپنے بیٹے کا نام بھی حسن نعیم رکھا ہے۔

○

دل وہ کشت آرزو تھا جس کی پیمائش نہ کی
سیر دنیا کے سوا ہم نے کوئی خواہش نہ کی

موتیوں سے چشم و جاں کو آئینہ خانہ کیا
سیپ کے ٹکڑوں سے بام و در کی آرائش نہ کی

کس کو فرصت تھی کہ سنتا اس سفر کا ماجرا
جب اسی منزل نشیں کے ہونٹ نے جنبش نہ کی

اس نے جو بھی روپ دھارا اس نے جو بھی دکھ دیا
آدمی بننے کی ہم نے اس سے فرمائش نہ کی

کچھ قلم بندی سے مجھ کو عار تھا ورنہ نعیم
کب مرے ابر نگہ نے فکر کی بارش نہ کی

○

میں کس ورق کو چھپاؤں، دکھاؤں کون سا باب
کسی حبیب نے مانگی ہے زندگی کی کتاب

اُنھی سے شب میں اجالا، انھی سے نورِ خیال
مرے لیے تو بہت کچھ ہیں دیدۂ بے خواب

ہمیں نہ بھولنا آلامِ صد زماں کہ یہاں
ہمیں ہیں مسکنِ حرماں ہمیں ہیں بیتِ عذاب

گیا تھا دشت سے اٹھ کر سمندروں کی طرف
وہاں بھی تشنہ نصیبی، وہاں بھی مرگِ سراب

پکڑ کے دامنِ دل، یا جھکا کے سر اپنا
دیا ہے خوابِ شکستہ کا ہر کسی کو حساب

وہ آنکھیں پیار کے لہجے میں کہہ رہی تھیں حسن
ہمیں سے مانگ پیالہ ہمیں سے مانگ شراب

ہوا بہار کے موسم میں یوں چلی کہ نعیم
نہ سرخ رو تھا گلستاں نہ سرخ رو تھے گلاب

○

جاگے تمام عمر کہ ہر سو نگاہ تھی
دنیا مرے حبیب کی آرام گاہ تھی

یاروں کو ہر طرح کا تحفظ عزیز تھا
ہم نے چنی وہ راہ جو مردوں کی راہ تھی

گہرائیوں میں روح کی وہ ڈھونڈتا تھا کیا
اک گونج اس کی تان میں کیا بے پناہ تھی

جی چاہتا تھا اُس کا زمانے میں نام ہو
وہ تھا مرا انیس تو شہرت کی چاہ تھی

اٹھ کر سرائے خواب سے آیا ہوں اب نعیم
آشفتگی تو ورنہ اسی در کی راہ تھی

○

(در مدح قرۃ العین حیدر)

مدحِ دانش ہو جو اوصافِ حمیدہ لکھوں
کوئی تو ایسا ملا جس کا قصیدہ لکھوں

جلوہ فرما ہے جو اوراق کے آئینوں میں
اس کی توصیف میں کیوں حرفِ شنیدہ لکھوں

جس نے ہر لفظ کو موتی سے گراں سمجھا ہو
اس کو کیا شاہ صدف، گوہر دیدہ لکھوں

ایسی گرمی ہے نگارش میں، نوا کی لے میں
جی یہ چاہے ہے اسے شعلہ گزیدہ لکھوں

اس کی تحریر میں خوشبوئے جنوں ہے اتنی
دل معطر ہو اگر میں گل چیدہ لکھوں

جس نے سو ناز اٹھائے ہوں الم کے، اس کو
کیوں نہ اپنی ہی طرح درد کشیدہ لکھوں

مختصر گوئی بھی اک حُسن ثنا خوانی ہے
کیا ضروری ہے حُسن ایک جریدہ لکھوں

○

قلب و جاں میں حُسن کی گہرائیاں رہ جائیں گی
تو وہ سورج ہے تری پرچھائیاں رہ جائیں گی

اہل دل کو یاد صدیوں آئے گا میرا جنوں
شہرتیں ہوں گی فنا رسوائیاں رہ جائیں گی

گفتگو تجھ سے کریں گی میری غزلیں صبح و شام
تیری خلوت میں مری تنہائیاں رہ جائیں گی

میں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزمِ یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی

دور تک کوئی نہ ہوگا نغمہ سنجوں میں نسیم
بس چمن میں یاد کی پروائیاں رہ جائیں گی

نوٹ: جن غزلوں کا سنہ تخلیق اور جائے تخلیق حواشی کے طور پر رقم کی گئی ہے وہ 'آہنگ' گیا، شمارہ ۱، مارچ 1970 بعنوان 'حسن نسیم: ایک شاعر ایک مطالعہ' سے ماخوذ ہے۔

تاثرات

خلیل الرحمٰن اعظمی

''حسن نعیم کی شاعری کی سب سے اہم خصوصیت میرے نزدیک یہی ہے کہ وہ 'وقت' کی اسیر نہیں ہے۔ وقت کی کارفرمائی اس کے بطون میں ہے اور وہ بھی ایک ناقابلِ تقسیم وحدت کی صورت میں۔ اس لحاظ سے میں انھیں سچا اور کھرا غزل گو سمجھتا ہوں۔ غزل کہنے کو تو سبھی کہتے ہیں اور دو ایک صاف شعر نکال لینا کوئی مشکل کام نہیں، لیکن یہ صنف ہے بڑی بے ڈھب، سب کو راس نہیں آتی۔ اکھرے مزاج والوں سے تو اسے خدا واسطے کا بیر ہے۔ بڑے سے بڑا استاد اکھرا مزاج لے کر اس کوچے میں آیا ہے تو 'غزل قصیدہ طور' یا 'نظم نما غزل' یا 'غزل نما نظم' سے آگے نہ جاسکا۔ یا پھر کسی نے لفظیات کو تہس نہس کر کے اسے تجربے کا نام دیا اور کچھ دنوں کے لیے اشتہاری نقادوں کی مرغوب غذا فراہم کرنے کا کام کرتا رہا... مگر غزل کی تنقید ایسی غزلوں سے اپنے اصول نہیں وضع کرسکتی۔ غزل کا ایک مزاج اور اس کی کچھ دیرپا اور مستقل قدریں ہیں۔ ان کے بنانے میں ایرانی اور ہندوستانی تہذیب نے صدیوں کا سفر کیا اور زوائد کو چھانٹ کر ایسا 'جوہر' نکالا ہے جو دراصل اس کی روح ہے۔ اس 'جوہر' کے بغیر غزل میں جان نہیں آتی نہ اس پر دھار چڑھتی ہے۔

... آپ جتنی بار اسے (حسن نعیم کی غزل) پڑھتے ہیں ایک نئی کیفیت سے دوچار ہوتے ہیں۔ غالب نے اپنے اشعار کو انھی معنوں میں 'تہ دار' اور 'پہلودار' کہا تھا اور میر نے اپنے

معاصرین کو اپنے مقابلے میں 'ناظمان بے تہہ' سے تعبیر کیا تھا۔ غزل کی یہی واحد کسوٹی ہے۔ باقی سب 'اصطلاحات اسیران تغافل' ہیں۔

حسن نعیم گزشتہ چوتھائی صدی سے غزل کے فن پر ریاض کر رہے ہیں۔ میں اس زمانے سے انھیں جانتا ہوں جب بقول شخصے 'مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوار دبستاں پر۔' ان کی شخصیت میں جو نفاست جو رچاؤ جو توازن اور جو 'ٹھہراؤ' ہے وہ انھی سے مخصوص ہے۔ اس کا اندازہ محض سرسری ملاقات سے نہیں ہو سکتا۔ ان کی شاعری بھی سرسری مطالعے کی چیز نہیں ہے۔ یہ اپنے پڑھنے والے سے بار بار توجہ کا تقاضا کرتی ہے تب اس کی تہیں کھلتی ہیں۔ وہ اپنی چھوٹی چھوٹی غزلوں میں کوئی نہ کوئی بچھو چھپا کر رکھ دیتے ہیں جو ہم جیسے حساس قاری کو ڈنک مارے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بہ ظاہر سادہ شعر میں بہت گہری بات کہہ جاتے ہیں۔

...ان کی کیفیت سدا بہار ہے۔ غزل کا یہ وہ آرٹ ہے جسے کوئی نئی ادبی تحریک یا نیا ادبی تجربہ مسترد نہیں کر سکتا۔ ان کے اشعار میں ایک 'محسوس فکر' ہے اور غزل کو یہی چیز راس بھی آتی ہے۔" (مضامین نو، ص 10-207)

کالی داس گپتا رضا

"اب غزل مختصر کہی جانے لگی ہے یعنی پہلے کی طرح بیس تیس شعر کی غزل اب تقریباً ناپید ہے۔ الفاظ کے الٹ پھیر سے اور محض محاورہ روز مرہ کے بل پر اب کام نہیں چلتا۔ فکر و فن، جذبے کی سحر کاری اور جوہر شاعری سے اگر شعر مزین نہیں تو آج اسے شعر تسلیم نہیں کیا جاتا۔

حسن نعیم مرحوم کی غزل میں یہ مؤخر الذکر تمام صفات موجود تھیں۔ حسن نعیم، جو ابھی کل تک ہم میں اپنی تمام تر رعنائیوں اور انا کے ساتھ موجود تھے کوئی معمولی غزل گو نہ تھے۔ وہ جب کبھی مجھے کسی محفل میں ملتے تو شعر پڑھنے سے پہلے ضرور کہتے کہ "اچھا ہوا آپ تشریف لائے ورنہ میں شعر کس کو سناتا۔" ہو سکتا ہے وہ یہ بات ہر شامل محفل رکن سے کہتے ہوں تاہم اس سے ایک بات ضرور ظاہر ہوتی ہے، وہ یہ کہ انھیں یہ زبردست احساس تھا کہ انھیں ان کے فن کی داد دینے والے بہت کم ہیں۔ یہ بات کسی حد تک صحیح بھی ہے۔ وہ جس ٹھسے، طنطنے اور تمکنت سے غزل کہتے تھے، آج کی بیشتر پود اس کی داد دینے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔

حسن نعیم نے غزل کی روایت سے انحراف کیے بغیر اپنا اسلوب پیدا کیا جو زلف و رخسار سے دامن چھڑا کر فلسفہ، حکمت، سیاست اور انسانی رابطوں تک کو سیٹتا نظر آتا ہے اور یہ اسلوب ان کا اپنا ہے جس کی تقلید شاید اب ممکن نہیں۔'' (بحوالہ مجموعہ کلام 'دبستان' حسن نعیم)

پروفیسر محمد حسن

''دور جدید کی ہندوستانی غزل میں میرے نزدیک دو آوازیں خصوصیت سے توجہ طلب ہیں۔ایک حسن نعیم اور دوسرے شجاع خاور،حسن نعیم کی غزل میں ایک انوکھا کس بل ہے۔''
(غزل کا تخلیقی سفر، بحوالہ معاصر اردو غزل، مرتبہ: پروفیسر قمر رئیس، ص 21)

پروفیسر وہاب اشرفی

''قواعد اردو سے متعلق بچوں کی کتابوں میں لفظ اور حرف کی تعریف کچھ اس طرح ملے گی جو محمود ہاشمی نے لکھی ہے۔لیکن انھیں یہ بھی اب تک جان لینا چاہیے تھا کہ کتنے ہی ممتاز و منفرد شعرا 'حروف' کو لفظ اور سخن کے معنی میں استعمال کرتے رہے ہیں۔ دیکھیے حسن نعیم کے انداز میں کس طرح میر، سودا، غالب، اقبال اور کئی دوسرے شعرا نے اپنی شاعری میں 'حرف' کو منتخب کیا ہے... دانا کی تعریف کرتے ہوئے بیدل نے بھی لفظ کی جگہ حرف استعمال کیا ہے:

دانا نہ ہمیں حرف و صدا می گوید اکثر بہ اشارات و ادا ی گوید

محمود ہاشمی صاحب کا خیال ہے کہ حسن نعیم نے الفاظ کی قلت کے باعث کچھ بنیادی 'حروف' منتخب کیے ہیں اور انھیں 'کثیر المقاصد' بنایا ہے۔اس بنیاد پر ان کا محاکمہ ہے کہ حسن نعیم یہ نہیں جانتے کہ شاعری کے متعلق ایک نظریہ یہ بھی ہے کہ شاعری کی تاریخ دراصل زبان کے ارتقا کی تاریخ ہوتی ہے یعنی بیشتر الفاظ نئے معنوی ڈائرکشن، نئے استعارات اور علامات شعری تخلیقات کے وسیلے سے ہی زبان میں شامل ہوتی ہیں۔حسن نعیم کو شاعری کے ایسے تخلیقی رویوں سے سخت نفرت ہے...'' چنانچہ محمود ہاشمی صاحب کی 'حرف گیری' ہے کہ حسن نعیم نے 'دانش' اور 'دشت' کو تواتر سے استعمال کیا ہے۔کسی شعر میں 'دشت' تو کسی میں 'دشت نوردی' کہیں 'ریگ دشت' تو کہیں 'میان دشت' جیسے حروف استعمال کیے ہیں۔اسی طرح 'مدح دانش' پائے دانش، اور خلد دانش جیسے حروف استعمال کیے ہیں۔

ہاشمی صاحب کے اعتراضات سے مندرجہ ذیل نکات واضح ہوتے ہیں:

1. کسی خاص لفظ کا استعمال اسے کثیر المقاصد بنانے کے باوجود عیب ہے۔
2. شاعری میں کسی خاص لفظ کا بار بار استعمال عیب ہے۔
3. جو شاعر کسی خاص لفظ کا استعمال بار بار کرتا ہے، اس حال میں بھی کہ وہ لفظ کو مختلف معنوں میں استعمال کرتا رہا ہے، شاعری کے تخلیقی رویے سے اپنی نفرت کا ثبوت فراہم کرتا ہے۔

ہاشمی صاحب کے اعتراضات بے معنی ہیں۔ ان کا ثبوت یہ ہے کہ ٹی ایس ایلیٹ کے یہاں جو الفاظ بار بار آتے ہیں ان کی تفصیل یہ ہے۔ گلاب، مہینوں اور موسموں کے نام، پانی، دھواں اور کہا سا، شاہ راہیں، اعضائے انسانی، بال زینہ، موسیقی، بو۔ صرف پروفراک گروپ میں 'زینہ' کا لفظ پانچ بار استعمال ہوا ہے (ملاحظہ ہو لیونارڈ انگر کی کتاب امیجری آف اوپڑنس) میرے خیال میں محمود ہاشمی بھی اس بات کو ماننے کے لیے تیار نہ ہوں گے کہ ایلیٹ کے یہاں 'الفاظ کی میراث' قلیل رہی ہوگی۔ تو ثابت یہ ہوا کہ شاعری میں کسی لفظ کا بار بار استعمال عیب نہیں ہے۔"

(کہتی ہے خلق خدا، شب خون اکتوبر 1972، جلد 7، شمارہ 77)

مخمور جالندھری

"جب حسن نعیم، بیدل اور شاد عظیم آبادی کے وطن سے دلّی آیا تو بہت کم لوگ یہ جانتے تھے کہ اس کے ساتھ ایک نیا اندازِ فکر، تغزل کا ایک نیا لب و لہجہ اور اسلوب و بیان کا ایک نیا پیرہن دلی پہنچا ہے اور 'ظرف تنگنائے غزل' کی روایت ٹوٹنے والی ہے...

نعیم کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک بات قاری کو چونکا دیتی ہے کہ اس کی ابتدا میں بھی حیرت ناک دل نشینی اور پختگی رہی ہے۔ وہ فکر و احساس اور دانش و آگہی کا شاعر ہے۔ اس کا لب و لہجہ ایک ایسا ہلکا سرور ہے جو اپنے دامن میں عرفان نغمہ سمیٹے رہتا ہے۔ اس کے ابتدائی شعروں اور موجودہ اشعار کا مطالعہ کیجیے، اس کے اشعار میں روشن ضمیری کی وہی تنویر ملے گی۔ آپ ایک مسلسل جلا اور صیقل کے عمل سے دوچار ہوں گے، اس لیے کہ ایک بڑے شاعر کی ابتدا اور انتہا میں امتیاز اگر ممکن نہیں تو دشوار ضرور ہوتا ہے۔ وہ پہلے ہی بہت سے فرسودہ اقدار کی قطع و برید کے بعد اپنی آواز بلند کرتا ہے جو مسائل حیات و ذات اسے اپنی طرف متوجہ

کرتے ہیں وہ ان کی گہرائی میں اتر جاتا ہے۔ غزل میں اس کے تجربے بنیادی حقائق کو مختلف پہلوؤں سے اجاگر کرتے ہیں۔ وہ اپنے گرد و پیش کا مطالعہ بھی کرتا ہے تو زاویۂ نگاہ کی کارفرمائی ہر تخلیق میں نمایاں رہے۔ اس کی منزل اس کی نگاہ میں پہلے ہی عیاں ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آغاز ہی سے اس کی آواز اپنی آواز ہوتی ہے اور اس کی انفرادیت میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ ایسے شاعر کی تقلید پر منہ کی کھانی پڑتی ہے کیوں کہ وہ گل بانگ عصر تو ہوتا ہی ہے مگر نوائے فردا بھی ہوتا ہے۔ حسن نعیم نوائے فردا ہے۔" (حسن نعیم، جمال فکر 'آہنگ' گیا، مارچ 1975)

باقر مہدی

یادِ رفتگاں

(مشہور شاعر اور دوست حسن نعیم کی یاد میں)

(1)

اور بھی مہرباں مرے تھے مگر/ یاد تیری ستا رہی ہے مجھے
میں نے تیرا 'عروج' دیکھا تھا/ نامور شاعروں کی محفل تھی
فیض، سردار تیرے گھر آئے/ میں بھی گوشے میں چپ سا بیٹھا تھا
شاعری اور شراب کی گردش/ جیسے تاروں کی جگمگاہٹ تھی
اور تو/ (کوہِ نور کی مانند)/ اپنی غزلیں انھیں سناتا تھا
آج تک یاد ہے مجھے وہ رات!

(2)

اور پھر—تو کہاں کہاں نہ گیا/ کتنا خوش حال وہ زمانہ تھا
جب بھی بھولے سے بمبئی آتا/ سارے 'احباب' جمع ہوتے تھے
ترے 'اشعار' سنتے رہتے تھے

(3)

میں ہی وہ تنہا شخص تھا لیکن/ جس نے تیرا زوال دیکھا تھا
کتنا خاموش اور بے کس تھا/ بس انا (EGO) کا ہی اک سہارا تھا

وہ بھی کیا کام آسکی تیرے؟/ کاش اتنا سمجھ گیا ہوتا
سارے ہنگامے اک ڈراما ہیں/ انتہا جس کی اک تباہی ہے
زندگانی تیری ادھوری تھی/ تو الیہ جسے بنا نہ سکا
میں تیرا شعر پڑھتا رہتا ہوں:
"میں چلا جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن
بزم یاراں میں قیاس[1] آرائیاں رہ جائیں گی"

(ماہنامہ 'شاعر' بمبئی، اکتوبر 2000)

پروفیسر وحید اختر

"آپ (حسن نعیم) غزل کے منفرد شاعر تھے۔ اس زمانے کے دو تین شاعروں میں آپ کا مقام آتا ہے۔ ان کو اس بات کی بجا شکایت تھی کہ انھیں قدر کی نظر سے نہیں دیکھا گیا... اپنی غزلوں میں آپ نے سائنسی تصورات بھی پیش کیے۔ آپ کی شاعری میں تفکر و تعمق پایا جاتا ہے۔"

(حسن نعیم کے سانحۂ ارتحال پر، انجمن اردوئے معلیٰ، شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 3 مارچ 1991)

پروفیسر قمر رئیس

"حسن نعیم کے شعروں میں لفظوں کی سجاوٹ سے پیدا ہونے والے فطری حسن کی ایک خاص اہمیت ہے۔ لہٰذا ان کے ہر شعر میں کچھ لفظ اور لفظوں کے مجموعے معنی کے نئے عکس قائم کرنے میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔ انجام کار ان کا علامتی عمل سیدھے طور پر پرت در پرت گزرتا ہوا معنی کے نئے زاویے سے قاری کو روشناس کراتا ہے۔ ان کے شعروں میں لفظوں، یہاں تک کہ ردیف اور قافیے کا استعمال بھی یک رخی، بندھا ٹکا اور مشینی نہیں ہوتا وہ کثیر رخی اور حرکی ہوتا ہے اور یہ وہ خاصیت ہے جو نئی غزل میں ان کی انفرادی شناخت قائم کرتی ہے۔"

(ترجمہ: ہندی ایڈیشن 'غزل نامہ' ص 78)

---

[1] اصل شعر اس طرح ہے:
میں نکل جاؤں گا اپنی جستجو میں ایک دن — بزم یاراں میں خیال آرائیاں رہ جائیں گی
(دیکھیے دبستان، ص 92)

ڈاکٹر خلیق انجم

''حسن نعیم کے اشعار کی تہوں تک پہنچنے کے لیے گہرے علم اور خاصی فرصت کی ضرورت ہے۔ حسن نعیم کی مقبولیت روز افزوں ہے اور اب شاید وہ وقت دور نہیں جب صاحب نظر ان کے کلام کا باضابطہ اور گہری نظر سے مطالعہ شروع کریں گے... ان کا اسلوب اپنے تمام معاصرین کے اسالیب سے زیادہ تہہ دار، دل کش اور بامعنی ہے۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرتے ہوئے ذہین قاری کو ان الفاظ کی تلاش کرنی ہوتی ہے جن کی کلیدی حیثیت ہے، کیوں کہ ان الفاظ ہی کے تخلیقی استعمال سے ان کا طرز بیان پراسرار بنتا ہے اور اپنے دائرۂ فکر میں بہت سے کوائف کو سمیٹ لیتا ہے... جن شاعروں نے غزل کے کینوس کو بہت زیادہ وسعت دی ہے اور اس میں تنوع پیدا کیا ہے ان میں حسن نعیم کا نام بہت نمایاں ہے۔ تنوع کی کیفیت یہ ہے کہ وہ کبھی خود کو دہراتے نہیں ہیں۔ کوئی خیال، تجربہ، ترکیب یا نفسیاتی کیفیت ایسی نہیں ہے جسے حسن نعیم نے کسی دوسرے شعر میں دہرایا ہو۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ابھی ان کے پاس کہنے کو بہت کچھ ہے۔ مستقل تازہ خیالی اور تازہ گوئی وہ نعمت ہے جس سے بڑے بڑے شاعر اکثر محروم رہ جاتے ہیں۔'' (تعبیر و تفہیم، ص153، 154، 155)

پروفیسر مظفر حنفی

''حسن نعیم کے ساتھ نئی تنقید نے انصاف نہیں کیا۔ اس کا ایک سبب غالباً یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ان کی غزل اوپر سے نہیں اندر سے نئی ہے۔ یعنی بادی النظر میں ان کا لہجہ اپنی لفظیات اور خارجی بناوٹ کے لحاظ سے جانا پہچانا پرانا سا لگتا ہے لیکن ان کے شعر کا موضوع اتنا نیا ہوتا ہے، اس میں علامتوں کا استعمال ایسی ایسی پرتیں ڈالتا ہے، پیکر تراشی کے ایسے نادر نمونے ان کے یہاں پائے جاتے ہیں کہ اس سے زیادہ نیا شعر کہنا ناممکن سا نظر آتا ہے۔ آواز کی نرمی، فکر کی گہرائی، والہانہ پن، کلاسیکی رچاؤ اور لفظیاتی غنائیت، حسن نعیم کو نہ صرف نئی غزل کا پیش رو قرار دیتے ہیں بلکہ انھیں اس دور کے نمائندہ غزل گویوں میں امتیازی مقام عطا کرتے ہیں۔ ان کا مجموعۂ اشعار بہت پہلے منظر عام پر آیا تھا۔ اب دوسرا مجموعۂ کلام (دبستان) زیر طبع ہے۔ توقع ہے کہ اس کی اشاعت کے بعد ان کے سلسلے میں اردو تنقید اپنے جمود کو توڑ دے گی۔'' (جدیدیت: تجزیہ و تفہیم، ص442-441)

پروفیسر سید محمد عقیل

''ان (حسن نعیم) کے مجموعہ 'اشعار' میں ایسی کیفیت ملتی ہے جس میں ان کی دنیا کھوئی ہوئی معلوم پڑتی ہے... ہر شاعر یا ادیب قدر کا بھوکا ہوتا ہے۔ حسن نعیم کو وہ قدر و منزلت نصیب نہ ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔''

(حسن نعیم کے سانحہ ارتحال پر، انجمن اردوئے معلا شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، 3 مارچ 1991)

بانی (راجندر من چندا)

''شدید ترقی پسندی کے دور میں جس طرح اختر الایمان کی نظم کو نظر انداز کیا گیا عین اسی طرح ترقی پسندی کی زاہلیت کے زمانے میں حسن نعیم کی غزل سے چشم پوشی کی گئی۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی غزل کا پیش آہنگ تلاش کرنا مقصود ہو تو حسن نعیم کی آواز ہر طرف بکھری ملے گی۔ عصر آشنائی کے تفکر کو نئے آہنگ میں ڈھالنے کا رجحان نعیم کی غزل سے شروع ہوتا ہے۔

... نعیم کے ذہنی رویہ کی امتیازی پہچان یہ ہے کہ انھوں نے ہر سیاہی میں خط روشن ڈھونڈنے کی سعی کی ہے۔ فرد کے ہر جذبے کو خوش نصیبی کے سیاق و سباق میں دیکھنے کا حوصلہ کیا ہے...

... غزل گو شاعر کی تخلیق شناسی کا امتحان لفظ لفظ ہوتا ہے۔ حسن نعیم کا شعری کردار آہنگ تفکر میں سرشار نظر آتا ہے۔ وہ کبھی جذباتی نہیں ہوتا اور اپنی بات کہنے کا ایک خاص اسلوب وضع کرتا ہے جو اپنا سلسلہ اعلیٰ شاعری کی روایات سے استوار کرتا ہے۔ نعیم کی غزل ارتقا پذیر رہی ہے۔ پچھلے چند برسوں سے غزل کے نام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اور جس قسم کی جدید شاعری کو بعض نقاد فروغ دینے میں بساط بھر کوشاں نظر آتے ہیں اسے حسن نعیم کی سنجیدہ مزاجی کبھی متاثر نہ ہو سکی۔''

(نئی غزل کا دانشور، حسن نعیم ہفت روزہ 'برگ آوارہ' حیدر آباد، 16 جولائی 1977)

مخمور سعیدی

''حسن نعیم غزل کے اچھے شاعر تھے۔ ان کے یہاں فکر بھی ہے اور جذبہ بھی۔ اسی لیے ان کا لہجہ پروقار ہونے کے ساتھ غنائیت سے بھی مملو ہے۔ یہ دو خوبیاں کسی شاعر کے یہاں

مشکل سے ہی یکجا ہوتی ہیں۔ ان کا بنیادی موضوع معاملات حسن و عشق ہی ہے لیکن دیگر مسائل حیات کا بھی وہ ادراک رکھتے ہیں اور یہ ادراک ان کے شاعرانہ شعور کا حصہ ہے۔ وہ اپنی داخلی کیفیات کے اظہار کے لیے خارجی حوالوں کا جس خوبی سے استعمال کرتے ہیں وہ ان کا خصوصی وصف ہے۔ مثلاً 'دل کا وہی حال جو دنیا کا حال ہے۔' استعارہ سازی اور پیکر تراشی کا ہنر بھی انھیں خوب آتا ہے اور ان کی غزلوں میں بڑے پرمعنی استعارے اور خوبصورت تخیلاتی پیکر ہمیں اپنی طرف متوجہ کرتے ہیں۔" (جانے والوں کی یاد آتی ہے، 'ایوان اردو' اپریل 1991)

احمد یوسف

"حسن نعیم کو الفاظ کی نشست و برخاست، خوبصورت ترکیبوں کی ایجاد اور رعایتوں کو صحیح طور پر نباہنے کا سلیقہ معلوم ہے۔ یہ چیزیں خاصی دیدہ ریزی اور جگر کاوی سے پیدا ہوتی ہیں... ان کے یہاں آپ کو بیشتر غزلیں ایک ہی موڈ کی ملیں گی۔ دوسرے یہ کہ نامحسوس طریقے پر سبھی اشعار ایک نہ دکھائی دینے والے دھاگے میں پروئے رہتے ہیں۔ ان کی غزلوں کی کامیابی کا ایک راز یہ بھی ہے۔" (پاپیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی، خاک، ماہنامہ 'آہنگ' گیا، مارچ 1970)

ندا فاضلی

"حسن نعیم محفل میں اپنی نئی غزل سنا رہے ہیں۔ غزل کا ہر مصرع ہونٹوں سے باہر آنے سے پہلے اعلان کرتا ہے، پہلا خدائے غزل میر تقی میر، دوسرا بابائے غزل مرزا غالب، تیسرا دانائے غزل حسن نعیم۔ (دیواروں کے بیچ، حصہ اوّل، ص 87) • حسن نعیم زندگی سے کھیلنے کے عادی ہو چکے تھے اور زندگی ان کے ساتھ ساتھ چلنے پر مجبور تھی۔ زندگی کے اس سکون نے ان کے حوصلے ہی بلند نہیں کیے ان کی انا کو بھی نئے بال و پر عطا کیے۔ ان کی غزلوں کے مرکزی کردار میں یہ تیور ان کے ہم عصروں سے ہی انھیں الگ نہیں کرتے، نئی غزل میں ایک نئے احساس اور رنگ کے آمد کی اطلاع بھی دیتے ہیں۔ ناصر کاظمی اور ابن انشا کے تھکے ماندے اور ہجر زدہ عاشق کے مقابلے میں یہ کردار زیادہ توانا اور مردانہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کی تہذیبی دنیا بھی زیادہ وسیع اور تہہ دار ہے۔ اس کا خمیر ہم عصر زندگی کے تضادات سے ابھرا ہے جو غم کو جی کا روگ بنانے کے بجائے اسے شعور کی تابندگی میں ڈھالتا ہے۔" (حسن نعیم - ایک ادبی المیہ، ماہنامہ شعر 1991، جلد 62)

پروفیسر صادق

''آپا دھاپی کے اس دور میں ایسے اصول پسند شاعر بھی تھے جنھوں نے ہوا کے رخ پر چلنے کی بجائے صحیح سمت و رفتار میں اپنا سفر جاری رکھا۔ انھوں نے نہ تو زبان کے معاملے میں پینترے بازی سے کام لیا اور نہ ہی علم عروض سے انحراف کے نعرے لگائے، نہ تو شاعری کے کلاسیکی اصولوں اور پیمانوں کو توڑنے پھوڑنے کی کوشش کی اور نہ لفظوں اور علامتوں کو فرسودہ الفاظ ٹھہرا کر انھیں ترک کرنے کی بات کی کیونکہ ان کا یقین ہے کہ شاعری لفظوں میں نہیں ان کے معنوں میں ہوتی ہے۔ حسن نعیم کا شمار ایسے ہی شاعروں میں کیا جاتا ہے۔ انھیں اردو شاعری خصوصاً غزل کی خوش گوار روایت کا گہرا علم ہے۔ وہ ان کی عظمت کو بھی سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری کے ڈانڈے فیض و یگانہ سے اقبال و غالب اور مصحفی و میر سے ملتے ہیں۔ لیکن وہ ان میں سے کسی کے مقلد نہیں کہے جاسکتے۔'' (ترجمہ: ہندی ایڈیشن،'غزل نامہ' ص 86)

اصغر علی انجینئر

''نعیم صاحب پر چند لفظوں میں بھلا کوئی کیا لکھے۔ سوا اس کے کہ وہ جدید غزل کی آبرو ہیں۔ غزل کی دنیا میں ایک باوقار نام ہیں۔ یوں تو اردو میں غزل گو شعرا کی کیا کمی ہے۔ ہر شاعر غزل ہی کہنا چاہتا ہے لیکن اس دور میں حسن نعیم جیسا غزل گو کہاں ملے گا... فنی مہارت تو ان کے یہاں بھرپور ہے ہی، تجربے کی صداقت، روح کی پاکیزگی، حق گوئی، حق شناسی بھی ان کی غزلوں میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے اور کوئی بات وہ گھسے پٹے انداز میں نہیں کہتے۔ اپنی ایسی انفرادی راہ نکالتے ہیں کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا ہے۔

...اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ان کئی لوگوں سے جو غزل کے تناور درخت بنے پھرتے ہیں اونچا مقام رکھتے ہیں۔ لیکن وہ گھاس بن کر جیتے رہے۔ اس لیے کہ سچ کو سچ کہتے رہے اور اسی لیے ان کی زندگی طوفان بنی رہی اور سر پر قیامت مچی رہی۔ یہ جستجو ہم بھی کریں گے اور آنے والی نسلیں بھی۔ یہی ان کی بقا کا راز ہے۔ ان کا جسمانی وجود مختصر سہی ان کے فن کا وجود ان کے کئی ہم عصروں سے بہت طویل ہوگا...'' (حسن نعیم۔غزل کی آبرو' بحوالہ'دبستان)

زبیر رضوی

''حسن نعیم غزل کے ایک ایسے شاعر ہیں جو اپنی غزل کے ساتھ ویسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا کوئی شخص اپنی محبوبہ کے ساتھ کرتا ہے۔ وہ اس کا رنگ و روپ ہی نہیں سنوارتے بلکہ اسے آئینے کی طرح پاردرشی بناتے ہیں۔ ان کی غزل لہجے کی آن بان کے ساتھ شعریت کے مختلف گوشے سمیٹے رہتی ہے... کبھی ان کی غزل ہوا کے خوشگوار جھونکوں کی طرح قاری کو مست و مگن کر دیتی ہے اور کبھی محض ان کے شاعرانہ رجحان سے اٹکھیلیاں کر کے گزر جاتی ہے۔'' (ترجمہ: ہندی ایڈیشن 'غزل نامہ' ص 89)

محمود خاور

''ان (حسن نعیم) کے اشعار میں ایسی Hunting کیفیت ہے اور ان کے افکار میں ایسی دل نوازی ہے جن کے اسباب مدتوں ڈھونڈے جائیں گے۔ یہ میری کوئی رائے نہیں، بلکہ میرا تجربہ ہے۔ ان کے اشعار قاری کو اپنی گرفت میں لے کر دیر تک سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ یہ صورت حال ان کے نت نئے استعاروں یا ان کی اچھوتی تراکیب کی بنا پر ہے کہ اسی میں ان کے ترشے ہوئے ڈکشن کا ہاتھ ہے یا بیک وقت ان سبھوں کا۔'' (چند سطریں۔ بحوالہ مجموعہ 'کلام اشعار')

شمیم طارق

''حسن نعیم کے لیے شاعری وہ منکوحہ رہی ہے جو مہر میں بدن کا لہو مانگ لینے کے بعد جہیز میں تاثیر لاتی ہے... حسن نعیم اگرچہ اپنے ہم عصروں میں نسبتاً کم مشہور ہوئے مگر وہ اس عہد کے نمائندہ شاعر ہیں۔ انھیں trend setter کی حیثیت حاصل ہے۔

حسن نعیم تو عصری دانش گاہوں میں پڑھے اور نیویارک میں برسوں رہے تھے۔ یورپ و امریکا کے شعری ادبی رجحان سے بھی واقف تھے۔ جہاں نہ صرف سائنس نے ترقی کی ناقابل یقین منزلیں طے کر لی تھیں بلکہ جہاں سائنس کو عام موضوعات کی سطح پر لکھنے کا رجحان بھی بہت عام ہو چکا تھا۔ حسن نعیم نے اس رجحان سے استفادہ کیا اور خالص سائنسی موضوعات کو غزل کی زبان اور روح سے ہم آہنگ کیا۔

کلاسیکی غزل میں معنی و موسیقی کے نقطۂ توازن سے پھوٹنے والی لے کے تو وہ امام وقت ہیں۔ یہ لے انھیں لہو نچوڑ کے جینے کا ڈھنگ اختیار کرنے کے بعد حاصل ہوئی... آنے والے وقتوں میں یہ لے بہتوں کو 'صاحب دل' بنائے گی۔ غزل گوئی میں ان سے غائبانہ بیعت کرنے والوں کا حلقہ بھی وسیع ہوگا۔" (غزل کا امام وقت۔ بحوالہ مجموعۂ کلام 'دبستان')

جمال اویسی

"ایک شاعر کے تمام مسئلے صرف نقاد حل نہیں کرتا ہے۔ نقاد محض وسیلہ بنتا ہے۔ لیکن حسن نعیم کے حصے میں یہ وساطت نہیں آئی۔ وہ بھی ادبی سیاست کا شکار ہوئے۔ ان کے لاابالی پن نے بھی ان کی شاعری کا حق ادا کرنے میں رکاوٹ پیدا کی لیکن یہ بھی محض عذر لنگ ہے اور حقیقت بس یہی ہے کہ وہ تعصب اور گروپ بازی کا شکار ہوئے۔

... حسن نعیم کے اشعار سوچنے اور محسوس کرنے کے لیے ہیں۔ ان کی شاعری تڑپا کر دل تو نہیں ہلا دیتی مگر ذہن و شعور کو بیدار کر کے ایک طرزِ نظر دنیا پر ڈال لینے کی ترغیب ضرور دیتی ہے۔ یہ ہماری فکر کو انگیز کرتی ہے اور خوابیدہ خیالات کو کمک پہنچاتی ہے۔ دانشوری کے ساتھ زندہ رہنے کے لیے انسپائر کرتی ہے۔ حسن نعیم کی غزلوں میں ان کے دل کے خون سے زیادہ ان کے دماغ کا لہو دوڑتا ہے۔ غزل کا شاعر ہر دو قدم پر اپنے دل کو پکڑ کر بھینچ کر بیٹھ جاتا ہے۔ اس کے قلبی واردات اور جذبات و احساسات غزل کے ہر شعر میں مکڑی کے جال کی طرح پھیل جاتے ہیں۔ یہ اردو غزل کی خاص پہچان ہے۔" (ایک غیر مطبوعہ مضمون سے 'حسن نعیم اور مظہر امام۔ جدیدیت کے دو اہم شاعر')

سید سراج اجملی

"حسن نعیم ان شعرا میں شامل ہیں جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ بھی رہے اور اس کی مخالفت بھی کی۔ انحراف تو حسن نعیم کی گھٹی میں پڑا تھا۔ شروع سے ہی وہ دقیانوسی خیالات و نظریات سے منحرف رہے اور یک گونہ آزادی کی فضا کے متلاشی... ایک اہم بات جو ان کے انحراف میں مضمر ہے وہ یہ کہ حسن نعیم سچے تخلیق کار تھے۔ ہر سچا تخلیق کار اپنی راہ الگ نکالتا ہے۔"

(ترقی پسند تحریک اور اردو غزل، ص 169)

تبصرے

(اس کتاب کی پہلی اشاعت پر کیے گئے تبصرے)

مظہر امام

چھٹی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے جن شاعروں نے اپنی شناخت قائم کرلی تھی ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، باقر مہدی، شہاب جعفری، وحید اختر، شاذ تمکنت اور حسن نعیم کے نام آتے ہیں۔ شہریار اور محمد علوی ابھی سامنے نہیں آئے تھے اور بحیثیت غزل گو بانی کے طلوع ہونے میں دیر تھی۔ بلراج کومل کے ماسوا اوروں کا تعلق نظم و غزل دونوں سے تھا۔ حسن نعیم خالص غزل گو تھے اور اس صنف کی آبیاری کے لیے وہ آخری دم تک اپنے دل و جگر کو لہو کرتے رہے۔ ان کی اَناپسندی بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی مگر حسینۂ غزل کے سامنے وہ دو زانو ہوکر بیٹھتے تھے۔ انھوں نے اپنی آرائش و آسائش کی زندگی، اپنا منصب اور مرتبہ، اپنی شخصیت کے ساتھ وابستہ گلیمر، سب کو اپنی غزل کے لیے قربان کردیا۔ غزل نگاری ان کے لیے اصولِ حیات اور مقدس خواب کا درجہ رکھتی تھی۔ اسی لیے میں انھیں 'شہیدِ غزل' کہتا ہوں!

حسن نعیم کے یہاں خیالات اور افکار کا وفور ہے اور ان کے اظہار کے لیے مناسب اور موزوں الفاظ کا وافر ذخیرہ۔ ان کی غزل کا مطالعہ کرتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ وہ کچھ نیا کہنا چاہتے ہیں اور کچھ نئے انداز میں کہنا چاہتے ہیں۔ روح اور جسم کی آویزش اور تشکیک و اعتقاد

کی کشمکش کو حسن نعیم نے غزل کی زبان دی ہے۔ انھوں نے اپنی غزل میں کچھ ایسے تیور پیدا کر لیے ہیں جو انھیں ایک انفرادی شان عطا کرتے ہیں۔ حسن نعیم کی غزل کو صرف دورِ حاضر کی غزل کے تناظر میں دیکھنے کی بجائے پوری اردو غزل کو سامنے رکھ کر دیکھنا چاہیے، تب ہی اس کے اصلی جوہر کھل سکتے ہیں۔

احمد کفیل ایک نوجوان لکھنے والے ہیں۔ انھوں نے اس مقالے میں حسن نعیم کی زندگی کے احوال و آثار کا حوالہ دیتے ہوئے ان کی شاعری کے محرکات اور ان کے فنی عوامل کا جائزہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ لیا ہے اور ان کی غزل کی انفرادی دلآویزی کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ احمد کفیل نے شعرفہمی بلکہ غزل شناسی کے مراحل خوش اسلوبی سے طے کیے ہیں۔ وہ تجزیہ، تنقید، تبصرہ سبھی کے آداب سے واقف ہیں۔

یہ حسن نعیم پر پہلا کام ہے۔ خدا کرے یہ ان کی فن شناسی اور تعین قدر کے سلسلے میں اور بہت سے محاکموں کا پیش خیمہ ثابت ہو! (پہلے ایڈیشن کے بیک ٹائٹل کی تحریر، 26 اگست 2002)

جاوید رحمانی

حسن نعیم اردو کے ان شعرا میں سے ایک ہیں جنھوں نے جدید اردو غزل کو نئی سمت و رفتار سے آشنا کیا اور وہ نہ ہوتے تو ایک واضح جہت کی کمی صاف طور پر محسوس کی جاتی۔ وہ عملی طور پر بھی شاعر تھے یعنی بالکل شاعرانہ زندگی بسر کی۔ ہر چند کہ بلندیاں ان کی منتظر رہیں لیکن انھوں نے اپنی حسرتوں اور ناکامیوں کی کسک کو سنبھال کے رکھا جن کے چراغ ان کے اشعار میں بھی جھلملاتے نظر آتے ہیں:

موجۂ اشک سے بھیگی نہ کبھی نوکِ قلم
وہ انا تھی کہ کبھی درد نہ جی کا لکھا

اور اسی لیے وہ اس دعوے کے مستحق تھے کہ:

کچھ اصولوں کا نشہ تھا کچھ مقدس خواب تھے
ہر زمانے میں شہادت کے یہی اسباب تھے

اور اس کا جیتا جاگتا نمونہ خود ان کی زندگی بھی تھی۔ جتنی توانا اور دل نشیں آواز ان کی تھی

یعنی جلال و جمال کا آمیزہ، وہ ان کے معاصرین میں کسی کو میسر نہ ہوئی۔ یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ 1950 کے بعد ابھرنے والے شعرا میں حسن نعیم امتیازی حیثیت کے مالک تھے لیکن افسوس کی بات ہے کہ ان پر باضابطہ کوئی کام تو کیا ہوتا کہ جدید غزل پر جو کام ہوا ہے ان میں بھی بالواسطہ طور پر ان کا ذکر کم کم ہی دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس کا سہرا ایک تو حسن نعیم کی بے نیازی اور دوسرے ہماری تنقید کی کور چشمی کے سر ہے۔ ہم نے تنقید و تحقیق کے نام پر پچھلے پچاس سالوں میں زیادہ سے زیادہ کام ایسا کیا ہے کہ اس کو کام کہنا لفظ کام کی توہین ہے اور چوں کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس حمام میں ننگے ہیں اس لیے یہ بے لباسی ہی آئین صاحب نظراں ٹھہری ہے۔

اس سناٹے میں ایک آواز برادرم احمد کفیل کی ابھری ہے جن کا بیک وقت حسن نعیم پر پہلا کام بھی ہے اور ہمارے ناقدین پر طنز بلیغ بھی۔ احمد کفیل صاحب حسن نعیم کا کلیات بھی مرتب کر رہے ہیں۔ اس مقالے میں انھوں نے بڑی محنت اور جاں فشانی کے ساتھ حسن نعیم کی شاعری کا جائزہ لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ کوئی پہلو چھوٹنے نہ پائے، اس لیے ارتکاز کی کچھ کمی تو محسوس ہوتی ہے لیکن یہ بھی ہے کہ یہ ان کا پہلا کام ہے اور حسن نعیم پر بھی پہلا کام اور ان دونوں باتوں سے کافی امید بندھتی ہے۔ انھوں نے جدید غزل کے تناظر میں حسن نعیم کی غزل گوئی کا جائزہ لیا ہے اور بڑی محنت سے حسن نعیم کے حالاتِ زندگی کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے اور میری نظر میں یہ سوانحی گوشہ ہی حاصلِ تحقیق ہے اور اسی سے اس کام کی اصل اہمیت ہے۔ انھوں نے جس محنت اور لگن سے اسے ترتیب دیا ہے آئندہ حسن نعیم پر کوئی کام اس کے حوالے کے بغیر نہیں کیا جا سکے گا۔ اسی کے ساتھ انھوں نے اس کتاب میں حسن نعیم کی کچھ نمائندہ غزلوں کا انتخاب بھی پیش کیا ہے اور ان کے معاصرین کی آرا کا انتخاب بھی اور یہ بھی اچھی کوشش ہے اور مجھے امید ہے کہ بقول مظہر امام ''یہ ان کی فن شناسی اور تعین قدر کے سلسلے میں اور بہت سے محاکموں کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔''

(ہماری زبان، یکم تا 7 دسمبر 2002)

توقیر عالم توقیر

زیر نظر کتاب بنیادی طور پر پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے باب میں حسن نعیم کی شخصیت اور ذہنی تشکیل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ دوسرا باب 'نئی غزل، سمت و رفتار' کا ہے۔ جس کے تحت حسن نعیم

کے دور کی غزل گوئی، اس کا پس منظر اور پیش منظر پر مصنف نے خامہ فرسائی کی ہے۔ تیسرے باب میں حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات اور فنی عوامل کا پتا لگایا ہے۔ اس کے بعد نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت کو پیش کیا گیا ہے اور پانچویں باب کے طور پر حسن نعیم کی غزلوں کا انتخاب ہے۔ علاوہ ازیں حسن نعیم سے متعلق ادیبوں اور شاعروں کے تاثرات ہیں، جن میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے لے کر سید سراج اجملی تک کے تاثرات شامل ہیں اور آخر میں کتابیات ہے۔

احمد کفیل ایک ذہین اور صاحب نظر ریسرچ اسکالر ہیں۔ حسن نعیم پر ان کی تحریر کردہ زیر نظر کتاب ان کی بھر پور محنت و لگن کا نتیجہ ہے، جس میں انھوں نے حسن نعیم کی کتاب حیات کے بکھرے ایک ایک ورق کو چن چن کر یکجا کیا ہے اور ان کی شاعری کا مختلف جہات سے تجزیہ و تنقید کی ہے اور نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ حسن نعیم اپنے ہم عصر شعرا میں کیوں کر عظیم المرتبت اور منفرد ہیں اس سلسلے میں انھوں نے مدلل گفتگو کی ہے۔ یہ سچ ہے کہ حسن نعیم ایک پختہ فنکار ہیں اور اس میں کسی بھی غیر جانب دار نقاد کو کلام نہیں ہوسکتا۔ لیکن حسن نعیم ایک انا پسند انسان تھے اور ان کی انا نے کبھی انھیں زمانے کا احسان اٹھانے کی اجازت نہیں دی۔ بقول حسن نعیم:

گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

لیکن ان کی انانیت انھیں حالات کا مقابلہ کرنے کی قوت نہیں دیتی البتہ حالات کے تھپیڑے کھانے اور اس کی شدت کو برداشت کرنے کا حوصلہ ضرور دیتی ہے۔ حسن نعیم کے اندر جو انا تھی وہ انا انسان کو اپنی ذات میں سمیٹ کر رکھتی ہے اور پیش آمدہ دشواریوں اور الجھنوں کو سلجھانے اور خود کو سرخرو و سربلند کرنے کے بجائے گوشہ نشینی اور علاحدگی اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ حسن نعیم کی انا میں غالب کا تیور اور میر کی خودداری تھی اور اگر چہ حسن نعیم یہ کہتے ہیں کہ ''وہ انا تھی کہ کبھی در د نہ جی کا لکھا''، لیکن حسن نعیم نے اپنی شاعری میں اپنی ذات کو سمو دیا ہے۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ وہ کھل کر کبھی سامنے نہیں آتے بلکہ اشاروں اور کنایوں میں حال دل کہہ جاتے ہیں۔ جیسے میر نے کہا تھا:

اے شور قیامت ہم سوتے ہی نہ رہ جائیں
اس راہ سے گزرے تو ہم کو بھی جگا جانا

حسن نعیم کچھ اسی انداز سے اپنے دل کی کیفیات بیان کرتے ہیں۔ ویسے بھی شاعری کا فن وضاحت وصراحت کا متحمل نہیں ہوتا جب کہ حسن نعیم غالباً دانستہ طور پر اپنے 'غم' کو چھپانا چاہتے تھے کیونکہ یہ شے ان کی نظر میں گہر تھی اور اس گہر پر دنیا کی نظر پڑے یہ بات شاید انھیں پسند نہیں:

رکھنے کا جو گہر تھا اسے دل میں رکھ لیا
بکنے کا تھا جو مال، کتابوں کو دے دیا

بہر کیف حسن نعیم کو ان کی انانیت کی وجہ سے لوگوں نے قابل اعتنا نہیں سمجھا اور ان کے فکر وفن پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی گئی۔ اس طرح حسن نعیم اپنی تمام تر شاعرانہ خوبیوں کے باوجود تقریباً فراموش کر دیے گئے۔ احمد کفیل نے اسی آفتاب کو جو گمنامی کے صحراؤں میں کھو رہا تھا نہ صرف یہ کہ نصف النہار پر پہنچایا ہے بلکہ اس کی تابندگی کے لیے ایک آسمان دیا ہے۔ اس کی شخصیت وشاعری کو سمجھنے اور اس تک رسائی کے لیے ایک باب کھولا ہے اور امید ہے کہ آنے والے دنوں میں اس باب سے ہو کر بہت سے لوگ حسن نعیم تک پہنچنے میں کامیاب ہوں گے اور ان کے فکر وفن کے مزید گوشے اجاگر ہوں گے۔

احمد کفیل کی نثر نگاری سہل، سادہ اور متین ہے۔ ان کی تحریروں کو پڑھ کر ان کی نثری پختگی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ حالاں کہ یہ ان کی پہلی کوشش ہے لیکن ابتدا ہی میں انھوں نے زبردست زور بیان کا ثبوت دیا ہے۔ وہ اپنی بات توضیح وتصریح اور دلائل کے ساتھ کہتے ہیں اور براہ راست اور سلجھے ہوئے انداز میں کہتے ہیں۔ 'حسن نعیم اور نئی غزل' کے دیکھنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ احمد کفیل نے اس کتاب کی تصنیف میں کاوشِ مزاد کی ہے۔ انھوں نے حسن نعیم کی شاعری سے ان تمام ترکیبوں، علامتوں اور محاوروں کو جو حسن نعیم کی قوت اختراع سے وجود میں آئے ہیں، ایک ایک کر کے الگ کر لیے ہیں اور فارسی اضافت والی ترکیبوں، اردو اضافتوں کے ذریعے وضع کی گئیں ترکیبوں، حرف عطف سے تشکیل شدہ ترکیبوں اور حسن نعیم کے خود ساختہ محاوروں کا علاحدہ علاحدہ خوشہ تیار کیا ہے۔ ظاہر ہے یہ عمل یوں ہی تکمیل کو نہیں

پہنچا ہوگا۔ اس کے لیے جگر کاوی کی گئی ہوگی، ایک ایک شعر کو بغور دیکھنا پڑا ہوگا ساتھ ہی اس بات پر بھی نظر رکھنی پڑی ہوگی کہ ان ترکیبوں اور محاوروں کا استعمال کہیں پہلے کسی نے تو نہیں کیا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ احمد کفیل نے متذکرہ کتاب میں فن تنقید کے وقار کو برقرار رکھا ہے۔

آخر میں یہ بھی بتا تا چلوں کہ حسن نعیم پر احمد کفیل کی یہ کتاب اپنے باطنی محاسن کے ساتھ ساتھ نہایت ہی خوشنما اور دیدہ زیب ہے۔ البتہ کمپیوٹر کی چند خامیاں در آئی ہیں جو ممکن ہے اگلے ایڈیشن میں نہ رہیں۔ احمد کفیل نے اس کتاب میں اپنی محنت شاقہ اور نہ تھکنے والی لگن کا ثبوت دیا ہے۔ توقع ہے کہ یہ کتاب ادب کے قاری کو بے حد پسند آئے گی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی کی جائے گی۔

(قومی تنظیم، 12 اگست 2003)

درخشاں زریں

نئی غزل کے فروغ اور استحکام میں حسن نعیم نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔ کم و بیش اردو کے تمام مشاہیر ادب نے اس بات کو تسلیم بھی کیا ہے لیکن حسن نعیم کا نام صرف رسائل اور کچھ تذکروں تک ہی محدود رہا۔ اس انا پسند شخصیت پر کسی نے قلم اٹھانے کی پہل نہیں کی لیکن یہ کام احمد کفیل نے کر دکھایا ہے۔ انھوں نے 'حسن نعیم اور نئی غزل' جیسی کتاب لکھ کر حسن نعیم پر کام کرنے والوں کے لیے امکانات کے نئے دروازے کھول دیے ہیں۔

'حسن نعیم اور نئی غزل' میں حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری کے تمام پہلوؤں پر تنقیدی و تجزیاتی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ شروع کے صفحات میں ڈاکٹر خواجہ اکرام اور ڈاکٹر کوثر مظہری نے اس کتاب اور مصنف سے متعلق اپنی رایوں کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد مصنف کا چھ صفحات پر مبنی 'حرف آغاز' ہے۔

'حسن نعیم کی شخصیت اور ذہنی تشکیل' کے عنوان سے مصنف نے حسن نعیم کے حالات زندگی، ان کی ملازمت اور ان کے آخری ایام کے تمام گوشوں کو قاری کے سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے حسن نعیم کی انا پسند طبیعت کے علاوہ اس کے پیچھے چھپی ان کی نرم مزاجی اور اخلاص

پسندی کا بھی احساس ہوتا ہے جو ان کے اسلاف کی دین تھی۔ دوسرا باب 'نئی غزل: سمت و رفتار' کے نام سے ہے۔ اسے مصنف نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پس منظر اور پیش منظر۔ ان میں نئی غزل سے قبل اور ہم عصر رجحانات کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ مصنف نے 1950 کے بعد ابھرنے والی غزل کی اہم خصوصیات کی نشاندہی کی ہے اور اس پس منظر میں حسن نعیم کو نئی غزل کا پہلا ماڈل شاعر قرار دیا ہے۔

'حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات اور فنی عوامل' میں حسن نعیم کی شاعری کا جائزہ فنی اور فکری پس منظر میں لیا گیا ہے۔ مصنف کی زبان میں ''حسن نعیم کے یہاں جدید تر لہجے کے ساتھ ساتھ فکر کی سبک خرامی اور اظہار کی آب دار نرم روی ملتی ہے۔'' چوتھا باب 'نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت' ہے، اس میں حسن نعیم کا مقام ان کے ہم عصر شعرا میں متعین کیا گیا ہے۔ مصنف نے حسن نعیم اور ان کے ہم عصر شعرا کے متعدد اشعار کے حوالے سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حسن نعیم اپنے ہم عصروں میں ایک ممتاز مقام رکھتے ہیں۔ ان کے اشعار میں نغمگی اور موسیقی کا وفور ہے اور ان کی غزلوں میں استعمال ہونے والی مختلف تراکیب بھی ان کی جدت طرازی کا آئینہ ہیں۔

کتاب میں حسن نعیم کی غزلوں کے دو مجموعوں 'اشعار' اور 'دبستاں' کا انتخاب بھی موجو ہے اور آخر میں حسن نعیم سے متعلق مشاہیر ادب کی آرا بھی شامل کتاب ہیں۔ کتاب کا گیٹ اَپ بھی قابل دید ہے۔

(اردو دنیا، اپریل 2003)

شاذیہ عمیر

تاریخ کا مطالعہ کیا جائے تو ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کسی نابغہ کو اس کی زندگی میں ہی وہ شرف پذیرائی عطا کر دی گئی ہو جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ جس عہد جس ماحول اور جن لوگوں کے درمیان رہتا ہے وہ اسے اپنی روش عام پر چلانے کے متمنی ہوتے ہیں جب کہ Genius کبھی سیدھی سڑک پر سفر کرنا پسند نہیں کرتا بلکہ وہ تو مختلف پگڈنڈیوں اور پیچ وخم سے گزرتے ہوئے اپنا راستہ خود تلاش کرتا ہے۔ نتیجہ یہ کہ اس کے دوست و احباب نہ صرف

اس کی ذات کو ہدف تنقید بناتے ہیں بلکہ اس کی تمام ادبی وعلمی کاوشوں کو بھی بیک جنبش قلم مسترد کردیتے ہیں۔

حسن نعیم نے بھی اپنی پگڈنڈی خود وضع کی اور ادب کے بنے بنائے قاعدوں کلیوں سے انحراف کرتے ہوئے نئے راستوں کی تلاش میں ہمیشہ سرگرداں رہے:

کیا سمجھ کر مجھ سے الجھے ہیں حسن لیل و نہار
آپ اپنا روز و شب ہوں آپ عالم تاب ہوں

نتیجہ یہ کہ ان کے ساتھ بھی وہی کچھ ہوا جو ہر نابغۂ روزگار ہستی کا نوشتۂ تقدیر ہے۔ ان کے بیشتر ہم عصر ناقدین ان سے باغی ہوگئے اور ان کے شعری محاسن ذاتی اختلافات کی نذر چڑھ گئے۔ لیکن گردش ماہ و سال نے جب تعصب کی دھند کا خاتما کیا تو فن شناسوں نے حسن نعیم کی غزلوں کا نہ صرف کھلے دل سے اعتراف کیا بلکہ اس کا پرزور استقبال بھی کیا اور گاہے بہ گاہے مختلف رسائل میں ان پر مضامین بھی شائع ہوتے رہے لیکن اس تعریف وتوصیف کے باوجود ان پر باضابطہ کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ چنانچہ یہی تشنگی 'حسن نعیم اور نئی غزل' کو وجود میں لانے کی محرک ثابت ہوئی۔ مصنف نے خود اس بات کا اعتراف کیا ہے:

''حسن نعیم کی غزلوں میں روایت سے وابستہ حال واستقبال کے بہت سے روشن امکانات ہونے کے باوجود ان کی غزلیں بے توجہی کی اسیر رہی ہیں۔ بے توجہی کو مثبت فکر سے جوڑنے کے لیے کچھ مقالے رسائل میں ضرور شائع ہوتے رہے۔ لیکن کتابی شکل میں یہ میری پہلی کوشش ہے۔''

لیکن کتاب کے مطالعے سے یہ بات آئینہ ہوجاتی ہے کہ مصنف نے اپنی اس پہلی کاوش میں ہی حسن نعیم کی شخصیت اور ذہنی تشکیل، حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات وفنی عوامل اور نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت وغیرہ عناوین کے تحت ان کے عہد، شخصیت اور شاعری پر ایسی شرح وبسط کے ساتھ گفتگو کی ہے کہ ان کی شخصیت وشاعری کے تمام ابعاد کھل کر سامنے آگئے ہیں اور حسن نعیم کی شاعری کے وہ تمام نقوش جو مختلف رسالوں میں بکھرے ہونے کی وجہ سے انتہائی مدھم تھے شوخ سے شوخ تر ہوتے چلے گئے ہیں۔ لہٰذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ احمد کفیل نے حسن نعیم کی ادھوری تصویر کو مکمل کرنے کا جو فریضہ انجام دیا ہے وہ انتہائی قابل قدر ہے۔ اس

لیے امید ہے کہ ادب نواز دستوں میں یہ کتاب وقعت کی نگاہ سے دیکھی جائے گی اور بحث و مباحث کے نئے در وا کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔

(غیر مطبوعہ)

شبنم آرا

زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے 'نئی غزل' کو 1950 سے قبل کی غزل گوئی کا ردعمل قرار دیا ہے یعنی بیسویں صدی کے نصف آغاز میں اردو غزل گوئی نئی تبدیلیوں سے ہمکنار ہوئی، غزل کے پرانے اور روایتی رجحانات و میلانات کے ڈھانچے کو 'نئی غزل' کے شعرا نے سرے سے ڈھادیا اور اپنی مسلسل جدوجہد و تخلیقی تجربات کے سہارے غزل کی ایک تازہ روایت کی بنیاد ڈالی اسے ہی 'نئی غزل' کے نام سے جانا گیا۔ مصنف کے مطابق:

"جو غزل کل تک محض خانقاہوں، درباروں اور بازاروں کی رونق سمجھی جاتی تھی 'نئی غزل' کے شعرا نے اسے زندہ دل، سوشل، حاضر دماغ اور گھریلو بنا کر حقیقی زندگی کے سماج اور معاشرے میں بٹھا دیا اور سچائی، بے باکی، شوخی تیکھا پن جیسی انسانی فطرتیں اپنے اصل رنگ و روپ میں دکھائی دینے لگیں۔"

مصنف نے 'نئی غزل' کی اسی بھیڑ سے ایک ایسے البیلے شاعر کا انتخاب کیا ہے جنھوں نے اپنے منفرد طرز بیان، اسٹائل اور لب و لہجے کی بنا پر اردو غزل کو معیار و اعتبار بخشا۔ ان کے اشعار کا مطالعہ یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کا مشاہدہ، تجربہ، اور اس سے بھی بڑھ کر ان کی تخلیقی قوت، آواز کی نرمی، فکر کی گہرائی، کلاسیکی رچاؤ اور لفظیاتی غنائیت انھیں 'نئی غزل' کا پیش رو قرار دیتے ہیں۔

یہ کتاب چار ابواب پر مشتمل ہے اور ہر باب حسن نعیم کی پہلو دار شخصیت کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے۔ مثلاً باب اوّل 'حسن نعیم کی شخصیت اور ذہنی تشکیل' میں پیدائش سے لے کر آبا و اجداد، شجرۂ نسب، تربیت و تعلیم، شادی، اولاد، ملازمت، مزاج کی تلخی و تندی، وفات یعنی وہ جن جن حالات سے نبرد آزما ہوئے اس کی پوری تفصیل بیان کی گئی ہے۔

دوسرے باب 'نئی غزل سمت و رفتار' کو دو چھوٹے چھوٹے عناوین پیش منظر اور پس منظر

میں بانٹا گیا ہے اور اس خیال کے پیش نظر 'نئی غزل' سے قبل کے رجحانات و میلانات کے ساتھ حسن نعیم کے عہد کے سیاسی، سماجی، و معاشی صورت حال کا بھی جائزہ لیا گیا ہے جس نے اردو غزل کے اس نئے موڑ کو جنم دیا۔

تیسرے باب 'حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات وفنی عوامل' میں حسن نعیم کی غزل گوئی کا فکری وفنی تجزیہ کرتے ہوئے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ ان کی غزلیں ذات و کائنات سے اس قدر گہرے روابط پیدا کر چکی ہیں اور اس کے اندر اتنا تنوع، جستجو اور تجسس ہے کہ ایک دنیائے معنی نظروں میں گھوم جاتی ہے۔ اس باب میں حسن نعیم کی زبان و بیان، نغمگی، تغزل اور شعری تراکیب سے بھی بحث کی گئی ہے۔

چوتھا باب 'نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت' میں مصنف نے حسن نعیم کو 'نئی غزل' کی بھیڑ میں اعلیٰ و ارفع تسلیم کرنے کے لیے جابجا معاصرین کے اشعار کا بھی حوالہ دیا ہے، یعنی حسن نعیم کی غزلوں میں جو روانی یا شیرینی کا بے ساختہ احساس ہوتا ہے اس کی مثالیں ہم عصروں میں عنقا ہیں۔ الفاظ کی نازکی، تراش وخراش، پیکر تراشی، علامت نگاری، شعری صنعتوں، تراکیب، محاورے اور روزمرہ الفاظ جیسے حسن نعیم کے نادر کارناموں کے انکشاف سے یہ باب عبارت ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں حسن نعیم کی بہترین غزلیں بھی شامل کی گئی ہیں جو قاری کے لیے دلچسپ مطالعہ کا باعث بنتی ہیں۔ آخر میں ناقدین و معاصرین کی آرا بھی شامل کتاب ہیں جن سے حسن نعیم کی شخصیت وشاعری کے کچھ پوشیدہ گوشے بھی سامنے آجاتے ہیں۔

احمد کفیل مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ایک ایسے توانا اور بلند کردار شاعر کو اپنی تحقیق کے لیے چنا جن پر اب تک چند مضامین ہی شائع ہوئے تھے۔ ایسے میں یہ کتاب حسن نعیم پر بحث کے دروازے وا کرتی ہے۔ کتاب کا گیٹ اَپ نہایت ہی خوبصورت ہے، جس پر حسن نعیم کی تصویر چسپاں ہے، مجھے پوری توقع ہے کہ اس کتاب کو ادبی حلقوں میں شرف قبولیت حاصل ہوگی۔

(غیر مطبوعہ)

الف ناظم

'حسن نعیم اور نئی غزل' ایک تنقیدی اور تجزیاتی کتاب ہے۔ اس کتاب میں ایک ایسے

شاعر کے فکر وفن کا جائزہ لیا گیا ہے جس کی ساری زندگی علم وادب کی خدمت گزاری میں بسر ہوئی۔ جس نے نہ صرف شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنا رکھا تھا بلکہ شاعری کی خاطر اپنی ساری دولت بھی لٹا دی۔ حسن نعیم کے ہم عصر شاعر مظہر امام، زیر تبصرہ کتاب کے بیک ٹائٹل پر لکھتے ہیں:

> ''چھٹی دہائی کے ختم ہونے سے پہلے جن شاعروں نے اپنی شناخت قائم کرلی تھی ان میں خلیل الرحمٰن اعظمی، بلراج کومل، باقر مہدی، شہاب جعفری، وحید اختر، شاذ تمکنت اور حسن نعیم کے نام آتے ہیں۔ شہریار اور محمد علوی ابھی سامنے نہیں آئے تھے اور بحیثیت غزل گو بانی کے طلوع ہونے میں دیر تھی۔ بلراج کومل کے ماسوا اوروں کا تعلق نظم وغزل دونوں سے تھا۔ حسن نعیم خالص غزل گو تھے اور اس صنف کی آبیاری کے لیے وہ آخری دم تک اپنے دل وجگر کو لہو کرتے رہے۔ ان کی انا پسندی بڑے بڑوں کو خاطر میں نہ لاتی تھی مگر حسینۂ غزل کے سامنے وہ دو زانو ہو کر بیٹھتے تھے۔''

پھر بھی کیا وجہ تھی کہ اپنے ہمعصروں میں حسن نعیم کو نظر انداز کیا گیا؟ اس کا جواب بھی اہل ادب سے پوشیدہ نہیں اور وہ یہ کہ حسن نعیم نے اپنے زمانے کی مصلحت پسند تنقید کی جھوٹی شان وشوکت سے کبھی مصالحت نہ کی اور شہرت کی پرواہ کیے بغیر ادب کی دیرپا قدروں کی جستجو میں مسلسل لگے رہے۔ بقول حسن نعیم:

گرد شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

حسن نعیم ایک ذی حس اور زمانہ شناس شاعر تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں ہمارے عہد کا آئینہ بھی نظر آتا ہے اور مستقبل کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔ اگرچہ ان کا رشتہ ترقی پسند تحریک سے بھی استوار رہا اس کے باوجود ان کی شاعری کا سرمایہ جدید رنگ وآہنگ سے متصل ہے۔

موجودہ ادبی صورتِ حال جو بھی ہو، حسن نعیم کی غزل ان کے لب ولہجے اور مضمون کے اعتبار سے جدید ہے جس میں ان کی ذات اور کائنات کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ بقول احمد کفیل:

> ''حسن نعیم کی غزل گوئی ان کی اپنی ذاتی اور کائناتی زندگی کا نچوڑ ہے۔ ان کی

شاعری میں ایک ایسا کردار ابھر کر آیا ہے جس میں غموں سے نباہ کرنے کی
بھرپور طاقت ہے۔"

ایک عرصۂ دراز تک حسن نعیم کو نظر انداز کیا جاتا رہا۔ ان کے کلام کو قابل اعتنا نہ سمجھا گیا۔ کیوں کہ وہ اپنے دور کی غزل کے مروجہ آداب کو توڑ کر کافی آگے بڑھ گئے تھے، جس کی بازگشت ان کے ہم عصروں اور بعد کے شعرا کے یہاں سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے غزل کو ایک نئی سمت کی طرف مائل کیا۔ اسی لیے انھیں 'نئی غزل کا ماڈل شاعر' تصور کیا گیا ہے:

دانشوروں کی تازہ روایت ہوں میں نعیم
سب سے الگ ہے نام تغزل کے باب میں

احمد کفیل صاحب نے حسن نعیم کی شخصیت اور شاعری پر بڑی سنجیدگی سے اظہار خیال کیا ہے۔ انھوں نے صرف خوبیوں ہی سے سروکار نہیں رکھا ہے بلکہ شاعری کی خشک مزاجی اور شخصیت کے بعض منفی پہلوؤں کو بڑی احتیاط سے بے نقاب بھی کیا ہے اور موازنے و تحقیق کے مطابق جو بات صداقت پر مبنی معلوم نہ ہوئی اسے ردّ کردیا ہے کیوں کہ حسن نعیم کی زندگی کے صفحات کئی جگہ بھیگے ہوئے معلوم پڑتے ہیں جن کو پڑھ پانا مشکل تھا۔ ایسے میں احمد کفیل صاحب نے باریک بینی اور غیر جانب داری سے کام لیا ہے۔ چاہے وہ حسن نعیم کی نجی زندگی ہو یا علمی سرگرمیاں۔

زیر تبصرہ کتاب میں حسن نعیم کی چنندہ غزلوں کا انتخاب بھی پیش کیا گیا ہے اور آخر میں حسن نعیم کے فکر وفن سے متعلق ممتاز ادبا و ناقدین کی آرا بھی شامل کی گئی ہیں۔ مختصر یہ کہ احمد کفیل صاحب کی یہ کوشش جدید شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے ایک تحفہ ہے۔ (غیر مطبوعہ)

ظفر انصاری ظفر

احمد کفیل رفتہ رفتہ ادبی دنیا میں متعارف ہو رہے ہیں۔ ان کا شمار نئی نسل کے باشعور ادب شناسوں میں ہونے لگا ہے۔ 'حسن نعیم اور نئی غزل' انھی کی کاوش گراں مایہ ہے۔ اس موضوع پر ان کے کام کرنے کا مقصد یہ بھی ہے کہ حسن نعیم جو کہ جدید غزل کا ایک اہم نام ہے اور انھوں

نے اس کی سمت و رفتار کے قیام و تعین میں جو نا قابل فراموش خدمات انجام دی ہیں، ان کی طرف اہل نظر کو متوجہ کیا جائے۔ حسن نعیم نے جدید غزل کے طرز و اسلوب اور رنگ و آہنگ میں جو جدت پیدا کی اس کا اندازہ ان کے کلام کا عمیق اور غائر مطالعہ کرنے کے بعد بخوبی ہو جاتا ہے۔ حسن نعیم وہ جدت پسند شاعر تھے جنھوں نے روایت کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے غزل کو نئی جہت سے آشنا کرایا۔ ان کی شاعری میں قدم قدم پر جدت کا احساس ہوتا ہے اور بقول احمد کفیل: ''جن قارئین و ناقدین نے حسن نعیم کی غزلوں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا ہے وہ اس بات پر متفق ہیں کہ حسن نعیم نئی غزل کے ایک پیش رو اور آئیڈیل شاعر ہیں۔''

حسن نعیم کی شاعری میں مسرت سے لے کر بصیرت تک کی ہر چیز پائی جاتی ہے یعنی کہ ان کی شاعری ہمارے جمالیاتی احساس کو صیقل بھی کرتی ہے اور ہمارے اندر شعور و ادراک کا جذبہ بھی پیدا کرتی ہے۔ یہ بات معیاری شاعری کے میزان و اقدار سے تعلق رکھنے والی ہے۔ اس کے باوجود حسن نعیم اور ان کی شاعری کو حاشیہ کی چیز سمجھا گیا اور اس کی طرف سے ہمارے ناقدین نے آنکھیں پھیر لیں۔ لیکن اس رویے کے پیچھے کون سی بات تھی؟ اس کا جواب احمد کفیل کی تحریروں میں مل جاتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ فرماتے ہیں:

> ''حسن نعیم کو جس قدر اپنی شاعری سے عشق تھا اور جیسے جیسے اونچے مناصب پر فائز رہے یہ ذرائع ان کی شاعری اور شہرت میں چار چاند لگا سکتے تھے لیکن حسن نعیم اس ذریعۂ شہرت کے مخالف رہے۔ وہ ہمیشہ یہی چاہتے رہے کہ پہلے فنکار کے فن پر بحث کی جائے ان کے معائب و محاسن اجاگر کیے جائیں اور پھر حق و انصاف کے ساتھ جس کا جو معیار ہو قائم کیا جائے۔ لیکن حسن نعیم کے کلام کا لوگوں نے خاطر خواہ مطالعہ نہیں کیا اور اس وجہ سے نظر انداز کر دیا کہ وہ ایک انا پرست انسان تھے۔ وہ سر محفل کسی کی بھی گرفت کر بیٹھتے تھے۔''

بہر حال احمد کفیل تنقید و تحقیق کی شریعت سے اچھی طرح واقف ہیں اور ان میں ایک مجتہد کی سی بے باکی پائی جاتی ہے۔ وہ حق بیانی سے باز نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ وہ یہ کہتے ہوئے بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے کہ کسی فنکار کے فن کا صحیح معیار متعین کرنے میں فنکار سے

اپنے ذاتی تعلقات کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ فنکار اور نقاد کے آپسی تعلقات کا فن کے معیار متعین کرنے میں حائل ہونا سم قاتل سے کم نہیں۔ احمد کفیل کی اس جرأت رندانہ پر انھیں مبارک باد ہے۔

حسن نعیم کے حوالے سے احمد کفیل کا یہ کام اہمیت کا حامل ہے۔ یہ کتاب حسن نعیم کی حیات وخدمات پر خاطر خواہ روشنی ڈالتی ہے۔ احمد کفیل کی زبان میں شستگی و رفتگی پائی جاتی ہے۔ ان کے جملے سلجھے ہوئے اور سلیس ہیں۔ وہ کوئی بھی بات گول مول طریقے سے نہیں کہتے۔ جو کچھ بھی کہتے ہیں دوٹوک انداز میں کہتے ہیں۔ ان کے اظہار و بیان میں ہکلاہٹ نہیں پائی جاتی۔ رائے زنی میں وہ کسی طرح کی مصلحت کے شکار نہیں ہوتے۔ یہ بات ان کے مستقبل کے اچھے آثار کی غماز ہے۔

یہ کام احمد کفیل کا بھی اور حسن نعیم پر بھی پہلا کام ہے اس لیے اسے حرف آخر کا درجہ نہیں دیا جاسکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی تحریر حرف آخر نہیں ہوتی۔ اس تحریر میں بھی بہت سی کمیاں موجود ہیں۔ لیکن ان کمیوں کے باوجود اس کی اہمیت اس لیے ہے کہ یہ حسن نعیم پر کام کرنے والوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیابی سے ہمکنار ہوسکتی ہے۔ مظہر امام کے اس جملے پر اپنا قلم روک رہا ہوں:

> ''یہ حسن نعیم پر پہلا کام ہے خدا کرے یہ ان کی فن شناسی اور تعین قدر کے سلسلے میں اور بہت سے محاکموں کا پیش خیمہ ثابت ہو''

(ہفت روزہ 'نئی دنیا' 16 تا 22 مارچ 2003)

شفیع جاوید

تشکر — ایک مضطرب روح اور شاعر حسن نعیم کی شاعری پر مبنی میرے تاثرات اور ان کی پچاس غزلوں کا انتخاب پیش خدمت ہے... مزید برآں خدا بخش لائبریری پٹنہ کے ڈاکٹر عتیق الرحمٰن اور سید مسعود حسن کا شکر گزار ہوں کہ احمد کفیل کی کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' کا ایک نسخہ نیز حسن نعیم کا مجموعہ کلام اور دیگر مواد و مضامین مہیا فرمادیا جن کی وجہ سے اس پروجیکٹ کو کم سے کم وقت میں مکمل کرنا ممکن ہوسکا۔ حسن نعیم کی زندگی کے بیشتر حالات جنھیں 'تعارف' کے عنوان سے رقم کیا گیا ہے، احمد کفیل کی کتاب سے ماخوذ ہے۔ ہم ان کے بھی شکر گزار ہیں۔

('حسن نعیم' بہار اردو اکادمی پٹنہ، اشاعت 2006)

حسن نعیم اور نئی غزل — ایک محاکمہ

امتیاز وحید

غزل ممتاز صنف سخن ہے، اردو غزل گوئی کے طویل سفر میں اس صنف ادب نے ردو قبول کی کئی بہاریں دیکھی ہیں تاہم بعض دیگر صنف شاعری کی طرح اس کا قافیہ کبھی تنگ نہ ہوسکا۔ اس نے ماضی کے پامال حسن و عشق اور گل و بلبل کو خیر باد کہا اور کبھی تصوف، ترقی پسندی، وجودیت اور جدیدیت کے منطقہ سے خود کو ہم آہنگ کیا، اس طرح 'تبدیلی' اور زمانہ شناسی اس کی فطرت کا حصہ بنتی چلی گئیں۔ 1950 کے دہے میں 'نئی غزل' کے نام سے اس نے پھر کروٹ لی اور خود کو ماضی کی سکہ بند روایت، اپنے عہد کے غالب رجحانات (ترقی پسندی اور جدیدیت) سے الگ ایک خود مکتفی اساس فراہم کیا۔ نئی غزل، کی یہ نیو بنیادی اعتبار سے نئے خیالات، لہجے اور اسلوب کی نیو تھی جس کا سہرا بڑی حد تک سید شاہ حسن نعیم کے سر جاتا ہے۔

زیر نظر کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' احمد کفیل کی تحقیقی و تنقیدی کاوش ہے جس میں 'نئی غزل' کے ایک بنیاد گزار حسن نعیم کی غزلوں کے سیاق میں اس پورے ادبی رجحان کے مالہ و ماعلیہ سے بحث کی گئی ہے، اس سائنٹفک مطالعے کا پہلا باب حسن نعیم کی ذاتیات، شخصیت، خانگی، تعلیمی اور دیگر جزئیات و متعلقات کے احاطے پر مشتمل ہے۔

چونکہ حسن نعیم کی غزل گوئی کا سارا نظام نئی غزل پر استوار ہے، لہٰذا نفس موضوع سے قبل 'نئی غزل، سمت و رفتار، پس منظر' کے تحت اس رجحان کے ابعاد پر جامع گفتگو کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ 'نئی غزل' کس طرح صنف غزل کے لیے نئی زندگی کی نوید ہے۔ یہ محض ماضی سے کلیتًا اعلانِ برأت نہیں بلکہ لہجے اور اسلوب میں نمایاں تبدیلی کے ساتھ ماضی کی غزلیہ روایت سے کسب فیض کا عمل بھی ہے، البتہ نئی غزل میں روایتی غزل کے 'عشق' کی مرکزیت کا خاتمہ ضرور ہوا ہے، عہد جدید کی زندگی کی ترجمان 'نئی غزل' میں چوں کہ مسائل حیات کا خود انبار ہے لہٰذا یہاں روایتی عشق کی خودمختاری کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔

نئی غزل کے امتیازات پر کچھ اس انداز میں بحث کی گئی ہے کہ نئی غزل کی زبان، لفظیات، موضوعات، عہد اور اس کی پیچیدگیاں، زندگی کی تیز رفتاری اور پھر ان سب کا ساتھ

نبھانے کے لیے درکار نئے علائم اور اشاروں کی ناگزیریت کا ازخود خلاصہ ہوتا چلا جاتا ہے اور بتایا گیا ہے کہ عصری ماحول کی کثافت کے ضمن میں نئی غزل روایتی غزل کے اشارے پردہ، چلمن، محفل جاناں، نازوادا، رقیب اور جھروکا، وغیرہ کا کیوں کر متحمل ہو سکتی ہے اس کے بالمقابل ''سائنسی زندگی اور ماحول کے تحت 'نئی غزل' میں پتھر، پیڑ، جنگل، برف، سورج، دھوپ، آندھی، زمین، دھواں، منڈیر، چھت، جھروکا، تنہائی، برگ، سایہ، سمندر'' جیسی نئی تر علامتی بساط بچھائی گئی ہے۔ ان معنوں میں بھی 'نئی غزل' کی اصطلاح قابل غور ہے۔ احمد کفیل کا عندیہ، ان الفاظ کے سیاق میں یہ ہے کہ یہ الفاظ روزمرہ کی زندگی میں مستعمل ہیں لہٰذا نئی غزل نے آج کی حقیقی زندگی سے قرب کا لفظی اور علامتی پیمانہ اپنایا۔ صرف یہی نہیں بلکہ تقریب فہم یا میر کی طرح بول چال کی عام زبان کو نئی غزل کی شناخت بتایا، بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ مصنف نے خوبی سے نئی غزل کے ایک اور انحراف کی نشاندہی کرتے ہوئے ٹی ایس ایلیٹ کے اس خیال کی تائید کی ہے کہ ''شاعری میں نئے انداز اور نئی ہیئت کی ایجاد کو کسی قوم کا سب سے اہم کارنامہ سمجھنا چاہیے'' گویا 'نئی غزل' کی عمارت ماضی کی روایتی غزلوں کے مدمقابل ایک خود مکتفی اساس رکھتی ہے جس میں فکر کو آزادی حاصل ہے۔ وہ کسی ازم اور ریڈی میڈ ایجنڈا کا شکار نہیں اور اس طرح فکر اور فن دونوں سطح پر نئی غزل خود کار بنیادیں رکھتی ہیں جو بڑی حد تک اس عہد کے دو حاوی رجحانات اور ان کی شدت پسند فکری محدودیت کا ردعمل کہی جا سکتی ہے جس میں عصری زندگی کے مسائل، خیالات اور مقامیت کو آفاقیت کی سرحدوں تک وسعت کی گئی ہے، مسلکی حصار ٹوٹتا ہے اور غزل گوئی اخلاقی، فلسفہ، رومانی اور انقلابی خانوں سے باہر نکلنے میں کامیاب ہوئی ہے۔

'نئی غزل' کے معیار و اقدار، اساس کی روشنی میں کتاب اپنی اصل بحث کا رخ کرتی ہے۔ اس باب کا مدعا حسن نعیم کی غزل گوئی کے فکری محرکات کا پتا لگانا اور یہ جاننا ہے کہ کس طرح ماحول، تعلیم اور ذاتی مشاہدے سے حسن نعیم کے فکر و احساس کی تعمیر ہوئی ہے اور کس حد تک فنکار کا ذاتی مشاہدہ حسن نعیم کو 'نئی غزل' کا نقاش اول' پہلا ماڈل شاعر بنانے میں ممد معاون رہا ہے۔

حسن نعیم نے ایام طفولیت ہی سے اپنے گردوپیش کی زندگی کو پیچیدگیوں سے گھرا پایا ہے۔ قربت میں ایک نوع کا کٹاؤ، اجتماعیت میں سمٹی انفرادیت، بے مقصدیت اور بے زاری،

یاس اور بے گانگی کا احساس کیا ہے۔ بحیثیت شاعر اسے بیان بھی کرتا ہے مگر عجب بات ہے کہ یہ محرومیاں اس کے اعصاب کو کمزور نہیں کرتیں اور وہ اس قدر توانا اور سخت جان نظر آتا ہے کہ اس کی توانائی اسے انا پرست بنا دیتی ہے:

میں نہ طوفاں سے جھکا ہوں اور نہ آندھی سے دبا
ان درختوں سے تو اونچا ہوں بلا سے گھاس ہوں

گردِ شہرت کو بھی دامن سے لپٹنے نہ دیا
کوئی احسان زمانے کا اٹھایا ہی نہیں

انا خود آگاہی اور عبقریت کی راہ سے جنم لیتی ہے، اس ضمن میں مصنف نے مومن، میر، یگانہ اور درد کی انانیت کے سیاق میں محرومی اور خود انحصاریت پر مبنی حسن نعیم کی انا پسندی کے کئی واقعے کا حوالہ بھی دیا ہے، انا بنیادی طور پر اعتراف کا تقاضا کرتی ہے اور جب نیرنگِ زمانہ سے صرف ٹھوکر ملے تو اس کی طلب اور بڑھ جاتی ہے، احمد کفیل نے تفصیل سے حسن نعیم کی اس ذہنیت کا خلاصہ کیا ہے کہ کس طرح وہ زمانے سے اپنا حق وصول کرنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ محفل میں غزل کی جگہ اپنی غزلوں کے فنی امتیازات پر روشنی ڈالتا ہے اور اپنی غزلوں کا خود ہی محاکمہ کرنے بیٹھ جاتا ہے۔ یہ ذاتی تسکین کا باعث تو ہوتی ہے مگر کس طرح یہ بہت سے معاصر احباب کو اس سے دور کر دیتی ہے، اور پھر ان حالات کی کوکھ سے مصلحت نااندیشی اور غیر مصالحانہ رویہ پنپتا ہے۔ حسن نعیم ناعاقبت اندیشی کی حد تک غیر مصلحت کوش واقع ہوئے تھے۔

حسن نعیم کی زندگی 'انا مع العسر یسرا' کی عملی تعبیر تھی۔ محرومی، ناکامی اور کلفتوں کے بعد ایک زمانے تک عیش وطرب نے ان کا ساتھ نبھایا۔ جاہ ومنصب اور دربدری ان کا مقدر ہوئی، لیکن حالات کے زیر وبم انھیں اخلاقی طور پر زوال آمادہ نہیں کر سکے۔ وسیع المشربی ان کا وطیرہ تھی، وطن سے گہرا لگاؤ تھا، سیاسی شعور بالیدہ اور سماجی مسائل پر پوری نگاہ تھی۔ ظاہر ہے اس وسعتِ نظر کا حامل فنکار فنی طور پر لازماً پختہ کار ہوگا۔ ندا فاضلی کے الفاظ میں "حسن نعیم کی غزلوں کے مرکزی کردار کا تیور بڑا توانا ہے۔ یہ تیور نہ صرف ان کو اپنے ہم عصروں میں منفرد

کرتے ہیں بلکہ نئی غزل میں ایک نئے احساس اور رنگ کے آمد کی خبر بھی دیتے ہیں"۔

حسن نعیم کے یہاں ماضی کی طرف فکر انگریز مراجعت کا احساس ہوتا ہے۔ یہ انا کی بنیادوں کو پختہ تر کرنے کا وسیلہ ہے اور ماضی کی ان پاک طینت علامتوں کو خراج تحسین بھی، جو اب صرف یادوں میں محفوظ ہیں:

یہ کوہساروں کی تربیت ہے کہ اپنا خیمہ جما ہوا ہے
ہزار طوفاں سناں چلائے ہزار موج غبار لائے

احمد کفیل کا تنقیدی جوہر وہاں کھلتا ہے جہاں وہ حسن نعیم کی شعری روایات سے آگاہی اور استفادے کی بات کرتے ہیں۔ چند جملے دیکھیے:

"... تجربات میں کسی کی نقالی کو کبھی گوارا نہ کیا۔ اپنے فن میں ان کا تیور غالب کی طرح باغیانہ رہا۔ الفاظ کی سطح پر بھی اور مضمون آفرینی کی سطح پر بھی وہ اپنے فن پر مہینوں اور برسوں غور وخوض کیا کرتے تھے، انجام کار اپنی شعوری سنجیدگی کے ذریعے لفظوں کو تخلیقی جہات بخشنے میں اپنے معاصرین پر انھیں سبقت حاصل ہوگئی، جس سے شعروں میں تہہ داری، دانائی اور توانائی ابھری۔ آپ جتنی بار پڑھیں گے ایک نئی فضا کا احساس ہوگا:

بامِ خورشید سے اترے کہ نہ اترے کوئی صبح
خیمۂ شب میں بہت دیر سے کہرام تو ہے

وحشت سرائے ذہن میں وہ بھی تھا اجنبی
دل میں رہا مقیم تو اپنے مکاں میں تھا

ترسیلِ مدعا کے مقصد کے تحت 'نئی غزل' میں اسلوب میر کی سہل نگاری کو اپنایا گیا تھا لہٰذا سادگی اور پرکاری کا جوہر حسن نعیم کے کلام کا ایک خاص وصف ہے۔ احمد کفیل نے مندرجہ ذیل اشعار کی روشنی میں سادگیِ میر اور حسن نعیم کی تشکیلیت کی بات کی ہے:

چلا تھا میر کے پیچھے سخن کی وادی میں
اسی کی خاک نوازی مری امامت ہے

دشت پیمائی ہے اپنی، عہدِ حاضر کا جنوں
بن چکے ہیں مجھ سے پہلے، میرے قدموں کے نشاں

محمود ہاشمی کے اس اعتراض "یہ شعری اسلوب نہیں نثری منطق ہے" کے سیاق میں احمد کفیل نے اسے 'ذاتی پرخاش' پر محمول کرتے ہوئے اپنی تائید میں پروفیسر وہاب اشرفی اور عشرت ظہیر کے استدلالی جواب کا حوالہ فراہم کیا ہے۔

'نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت' کتاب کا قابلِ مطالعہ حصہ ہے۔ اس بحث سے یہ سمجھنا زیادہ دشوار نہیں کہ 1950 کے عہد میں خلیل الرحمٰن اعظمی، ابن انشا اور ناصر کاظمی کی بالترتیب 'کاغذی پیرہن'، 'چاند نگر' اور 'برگِ نے' کی آمد سے سبک خرامی کے ساتھ نئی غزل کی دھمک محسوس کی گئی، جب کہ حسن نعیم کے یہاں اس آواز (نئی غزل) کی پرچھائی 1946 - 1945 سے ہی ابھرنی شروع ہوگئی تھی اگرچہ ان کا کلام 'اشعار' 1971 میں شائع ہوا۔ اس طرح نئی غزل کی اولیت کا سہرا حسن نعیم کے سر جاتا ہے۔ اس باب کا امتیازی وصف یہ ہے کہ حسن نعیم کی غزلوں کے بیچ ان کی فنکارانہ پختگی، شعور، فکری بالیدگی اور معاصر شعرا سے مقابلتاً ان کی امتیازی حیثیت پر گفتگو کی گئی ہے:

ہے وہی شاعر جو سازِ زندگانی پر نعیم
فکر کا نغمہ سنائے دل کا افسانہ کہے

جب لہو روئے ہیں برسوں تو کھلی زلفِ خیال
یوں نہ اس ناگ کو لہرانے کے فن آئے ہیں

حسن نعیم اپنے اشعار کے فکر انگیز خیالات میں کہیں دانشور، توانا لب ولہجہ کا شاعر، نئی غزل کے پیش رو، تو کہیں نئی غزل کا امامِ وقت نظر آتے ہیں۔ کثیف، بوجھل اور الجھاؤ سے ان کی غزلوں کا دامن پاک ہے۔ حسن نعیم نے خالص افکار کی ترسیل کو غزل نہیں سمجھا اس لیے وہ فکر اور جذبہ کی خوشگوار ترکیب سے اشعار ڈھالتے ہیں۔ احمد کفیل نے اس باب کو مربوط علمی اور ادبی آنچ پر کندن کیا ہے۔ زیادہ تفصیل گلاب کے پھول کو پنکھڑیوں سے جدا کرنے کے مترادف ہوگا۔ یہ حصہ صرف مطالعہ چاہتا ہے۔

اس بحث کا اطلاقی (Practical) جز وہ ہے جہاں احمد کفیل نے کلام حسن نعیم سے

(الف) فارسی اضافتوں (علامت کسرہ) کی مدد سے تشکیل شدہ ترکیبیں

(ب) اردو اضافتوں (کا، کی، کے) کی مدد سے تشکیل شدہ ترکیبیں

(ج) حرف عطف (و) سے تشکیل شدہ ترکیبیں

(د) علامت کی شکل اختیار کر لینے والے الفاظ

(ہ) اردو، ہندی اور انگریزی کے ایسے عامیانہ الفاظ کا استعمال جو غزل کے مزاج میں ڈھل گئے ہیں

(و) خود ساختہ نئے محاورات

کی نشاندہی کی ہے۔ان الفاظ وتراکیب کی معنویت پر مخمور جالندھری کی یہ عبارت بھی خوب ہے:

"ان کی غزلوں کا ہر لفظ نگینے کی طرح اور ہر مصرع مزین ہے، جس کا ایک
لفظ بھی نکال دیجیے تو ساری روحِ شعر فنا ہو جائے گی۔"

غزلیات حسن نعیم سے ایک انتخاب بھی شامل کتاب ہے جو 'حسن نعیم اور نئی غزل' پر جملہ تحقیقی وتنقیدی گفتگو کا مشق ومصدر کہی جا سکتی ہے۔انتخاب میں شامل غزلیں بلاشبہ وہ اساس ہیں جن پر اس کتاب کی عمارت کھڑی ہے۔حسن نعیم کے تعلق سے حقائق کی توثیق میں براہ راست ان کا کلام دیکھا جا سکتا ہے۔

کتابیات سے پہلے شعرا اور ادبا کے وہ تاثرات یا آرا بھی یکجا کر دی گئیں ہیں جو حسن نعیم کو بحیثیت فرد، اور تخلیق کار سمجھنے میں معاون ہیں۔

حسن نعیم پر خال خال مضامین لکھے جاتے رہے ہیں تاہم یہ پہلا علمی کام ہے جو پوری معروضیت کے ساتھ حسن نعیم کے فکر وفن کا احاطہ کرتا ہے۔کسی علمی کام کو اس کی حرمت کے ساتھ پایۂ تکمیل تک پہچانے میں جو علمی مذاق درکار ہے اس میں احمد کفیل بالکل آئینہ ہو رہے ہیں۔توقع ہے کہ 'نئی غزل' کے ایک رجحان ساز شاعر حسن نعیم کو احمد کفیل نے جس رخ پر پیش کرنے کی سعی کی ہے وہ پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا اور بعض وہ پہلو جو اس تحقیقی کاوش میں تشنہ رہ گئے ہیں یا وہ ذاتی گوشے جو ہنوز پردۂ اخفا میں ہیں آئندہ روشن ہو سکیں گے۔

(غیر مطبوعہ)

O

موصولہ خطوط

(مصنف کے نام)

وہاب اشرفی

17 نومبر 2000

عزیز من! دعائیں

آپ کا خط ملا، 'شب خون' میں شائع شدہ میری تحریر کی زیراکس کاپی بھی، بہت بہت شکریہ!
آپ اپنے پراجیکٹ پر ضرور کامیاب ہوں گے، آپ کی محنت کا مجھے اندازہ ہوا۔
آپ کا مقالہ مرتب ہو کر چھپا تو خواص کے علاوہ عوام بھی پذیرائی کریں گے۔

آپ کا — وہاب اشرفی

(پٹنہ)

باقر مہدی

24 فروری 2003

کفیل صاحب! آداب

کتاب تو ملی نہیں مگر آپ کا کارڈ مل گیا۔ جی ہاں میرے پاس تقریباً بارہ خط حسن نعیم مرحوم کے ہیں۔ ان میں دو تین غزلیں ہیں وہ شائع ہو چکی ہیں۔ میں ان دنوں شدید بیمار ہوں

عمر 77 برس ہے۔ Dibetees anghue BP میں مبتلا ہوں پھر بھی جیسے کچھ موقعہ ملا حسن نعیم کا خاکہ لکھوں گا۔ میری یہ کتاب 'نیم رخ' جولائی 2003 میں شائع ہوگی۔ مارچ میں ایک کتاب شائع ہو رہی ہے جس سے آپ کو دلچسپی نہیں ہوگی۔ 'تین رخی نظریاتی ادبی تنقیدی کشمکش' یہ ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے بارے میں ہے۔ میں نے 1967 میں پہلا مضمون 'ترقی پسندی اور جدیدیت کی کشمکش' لکھا تھا اب یہ سلسلہ مکمل ہو گیا ہے۔ نیز مکتبہ جامعہ بمبئی میں حسن نعیم پر آپ کی کتاب ہے۔ اگر جلد صحت غنیمت ہوگی تو جا کر لے آؤں گا۔

میں اپنے خاکے میں ایسے واقعات لکھ رہا ہوں جو آج تک لوگوں کو علم نہیں ہے۔ اپنی یادداشت کے سہارے یہ کام کروں گا اور 'نیم رخ' آپ کو بھیجوں گا۔ امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔

مخلص — باقر مہدی

(ممبئی)

---

8 مارچ 2003

عزیزی! تسلیم و نیاز

ابھی ابھی آپ کی کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' ملی، شکریہ!

میں ایک طویل خاکہ حسن نعیم کے بارے میں لکھوں گا اس میں آپ کی کتاب کا خاص کر ذکر کروں گا۔ — اور صحت؟

میرے خاکوں کی کتاب جولائی/اگست 2003 میں شائع ہوگی۔ امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خیر اندیش — باقر مہدی

(ممبئی)

تاریخ ندارد

کفیل صاحب! آداب

آپ کا کارڈ ملا۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنی شدید بیماری کی وجہ سے میں آپ کی مدد نہیں کر سکتا ہوں۔ میں تو حسن نعیم صاحب کی سوانح عمری لکھنے والا تھا مگر بیمار پڑ گیا اور نہ لکھ سکا مگر حضرت مشفق خواجہ کا خیال ہے کہ حسن نعیم جناب جمیل مظہری کے بعد ایک نامور شاعر ہیں۔

ندا فاضلی کا خیال ہے کہ وہ ناصر کاظمی سے بہتر ہیں۔ میں ان کی شاعری کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا اس لیے کہ شاعری کے بارے میں رائے دینا دشوار ہوتا ہے۔ کئی کئی بار کلام کا مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر بھی کوئی آخری رائے نہیں دی جاسکتی۔

خیر امید ہے کہ آپ اپنے کام میں کامیاب ہوں گے۔ مخلص — باقر مہدی

(ممبئی)

احمد یوسف

8 جون 2000

عزیز من، دعائیں لیجیے۔

حسن نعیم کی غزل گوئی پر کئی طلبا نے پٹنہ یونیورسٹی اور مگدھ یونیورسٹی میں کام شروع کیا تھا، لیکن صرف ایک طالب علم نے پچھلے سال پٹنہ یونیورسٹی سے حسن نعیم پر پی ایچ ڈی کیا ہے۔ نام ان کا نوشاد عالم ہے اور انھوں نے ڈاکٹر اعجاز علی ارشد کی نگرانی میں یہ کام کیا تھا۔

حسن نعیم کی ایک ساتھ پچیس غزلیں فنون، نقوش، تخلیقی ادب، اور آہنگ میں شائع ہوئی تھیں۔ جن ناقدین نے ان کے فن پر لکھا ہے ان میں قابل ذکر ہیں پروفیسر محمد حسن، شمس الرحمٰن فاروقی، مخمور جالندھری، وہاب اشرفی، ظہیر صدیقی، خواجہ بدیع الزماں، ڈاکٹر قیصر ضحیٰ عالم، مظفر حنفی اور کچھ دوسرے لوگ۔ ان کے ہندی کے مجموعے 'غزل نامہ' میں ہر غزل پر ایک مختصر سا تجزیہ بھی اس غزل کا ملتا ہے۔ ایک طویل انٹرویو مظفر حنفی صاحب نے ان کا لیا تھا جو بیسویں صدی کے دو شماروں میں شائع ہوا تھا اور اب ان کی حالیہ تصنیف میں بھی شامل ہے۔

ایک طویل خاکہ انور ظہیر نے ان پر لکھا تھا جو ان کے خاکوں کے مجموعے 'پھرتا ہے فلک برسوں' میں شامل ہے۔ آہنگ کے پہلے شمارے میں میرا خاکہ شائع ہوا تھا 'پاپیادہ تھا مگر راہ میں وہ دھوم مچی'۔ ان کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں پہلا 'اشعار' دوسرا 'دبستان' تیسرا 'غزل نامہ'۔ ہاں گجراتی میں بھی ایک کتابچہ ان کی غزلوں کا شائع ہوا تھا، جسے ندا فاضلی نے ترتیب دیا تھا۔

دعا گو — احمد یوسف

(پٹنہ)

5 نومبر 2000

احمد کفیل صاحب!

میری فائل میں 'شاعر' کا ایک ہی شمارہ ملا، یعنی شمارہ نمبر 4 (1991) جلد 62، اس میں حسن نعیم پر ندا فاضلی کا ایک مضمون 'حسن نعیم - ایک ادبی المیہ' اور شمیم طارق کا مضمون 'حسن نعیم کی شعری شناخت' شامل ہے۔ ان مضامین کے علاوہ ان کی پانچ غزلیں بھی ہیں۔ چوتھی غزل کو 'دبستان' سے check کر لیجیے گا۔ یہ مصرعہ مجھے مشکوک نظر آرہا ہے 'آسمانوں سے تیشۂ سنگ گرا ہی کیا تھا'۔ ان کی بڑی لڑکی میمونہ نعیم کا پتا یوں ہے:

Maimoona AlamC/o Dr. Naiyer Alam
159, Zakir Bagh, New Delhi 110025, Phone : 6839301

دوسری لڑکی شہیرہ کا پتا اس طرح ہے:

Mrs. Shahira Naim
Green Villa, Picnic Spot Road, Khurram Nagar, Lucknow- 226022,
Phone : 386738

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔

دعاؤں کے ساتھ ---احمد یوسف
(پٹنہ)

---

14 جنوری 2001

عزیزم، دعائیں لیجیے!

آپ کا کارڈ ملا۔ میمونہ سلمہا سے آپ ملے، اچھا کیا۔ ان کے پاس تو اس انٹرویو کا کیسٹس بھی تھا جو مظفر حنفی نے حسن نعیم سے لیا تھا۔ اُسے مگدھ یونیورسٹی کے ایک صاحبزادے جو حسن نعیم پر کام کر رہے تھے ان سے مانگ کر لے گئے تھے اور پھر لوٹانے کی کوئی ضرورت انھوں نے محسوس نہیں کی تھی۔ ایسا یہاں بہت ہوتا ہے۔ میری ایک 2nd cousin کی لڑکی بیتاب عظیم آبادی پر کام کرنے کے لیے مجھ سے ان کا مختصر سا دیوان (کلام بیتاب) جو اب نایاب ہے، مانگ کر لے گئی، لیکن خدا جانے کہاں پھینک آئی۔ 'مریخ' میں دیکھتا رہوں گا۔

'اردو دنیا' دیکھنے کی کوشش کروں گا۔ مخمور سعیدی انٹرویو دینے میں محتاط نہیں رہتے ہیں۔ اپنے ایک مضمون میں انھوں نے حسن نعیم کے متعلق ایسی بات بتلائی جو شہیرہ اور اشعر دونوں کے سامنے ہوئی تھی، اور ان دونوں نے جو بیان دیا وہ مخمور صاحب کی تحریر سے خاصا مختلف تھا۔ دلی والوں نے اپنے مضامین میں حسن نعیم کے عیب ہی عیب گنوائے ہیں۔ بقول خود شاعر کے:

مرے عیوب کی تصویر اس طرح کھینچی
مرے ہنر کو پس پشت اس نے ڈال دیا

اس کے برخلاف بمبئی والوں نے حتی المقدور ان سے انصاف کیا ہے، لیکن وہ اس بات پر مصر ہیں کہ شہر بانو سے انھوں نے نکاح کیا تھا۔ واللہ اعلم۔ دیسے جس حد تک ممکن ہوگا میں آپ کی مدد کرتا رہوں گا۔

دعا گو — احمد یوسف
(پٹنہ)

---

10 مارچ 2001

برادر عزیز!

مجھے یاد آیا کہ مخدوم شاہ شعیب شیخ پوروی حسن نعیم کے بزرگوں میں ہیں، ان کے شجرے میں شاید ان کا نام بھی آتا ہے۔ شاہ شعیب شیخ پوروی کی تصنیف 'مناقب الاصفیا' بہار کے صوفی لٹریچر میں ایک بڑا مقام رکھتا ہے، تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ حضرت شاہ شعیب مخدوم الملک حضرت شرف الدین یحییٰ منیری کے فرسٹ کزن ہیں، اس طرح دیکھیں تو ان کا نام کہیں نہ کہیں حسن نعیم کے نسبی سلسلے میں ضرور ملے گا۔

آپ اچھا کام کر رہے ہیں، اور محنت اور لگن سے کر رہے ہیں، خدا آپ کو کامیابی عطا کرے۔ ذیل میں میں پروفیسر فضیل قادری کا پتا آپ کو بھیج رہا ہوں، انھوں نے بہار کے شطاریہ سلسلے کے بزرگوں پر بڑا گراں قدر کام کیا ہے۔ ان کی تصنیفات میرے پاس ہیں لیکن فی الوقت مل نہیں رہی ہیں۔ امید کہ آپ اچھے ہوں گے۔

Prof (Dr.) Fozail Ahmad Qadiri
North- Eastern Hill University, Mayuir Bhanj Complex
Nongthymmal, Shillong - 793014 (Mighalaya)

اپنا پورا پتا مع پن pin code وغیرہ بھیج دیں۔

دعا گو — احمد یوسف
(پٹنہ)

---

14 جون 2002

عزیزم، دعائیں لیجیے!

حسن نعیم پر آپ کا مضمون 'نئی غزل کا ایک دانشور: حسن نعیم' پسند آیا۔ یہ مضمون سہارا سے پہلے بھی کہیں چھپا تھا؟

خبر ملی تھی کہ آپ کا ایم فل کا کام ختم ہو گیا۔ میں نے آپ سے پہلے بھی ایک بار کہا تھا کہ اگر 'تدوین نثری و شعری کلام حسن نعیم' پر کام کریں تو اس سے بڑا کام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ چالیس بیالیس سال کے عرصے میں ان کے صرف دو مجموعے اردو میں آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ان کی شاعری اور ان کی نثر کا ایک بڑا حصہ رسالوں میں بکھرا پڑا ہے، اور زمانہ یہ آ گیا ہے کہ اردو خود اردو والوں کے لیے بھی بوجھ بن گئی ہے۔ ایسے میں ضرورت اس کی ہے کہ کچھ جاں باز کھڑے ہوں اور کم از کم ایسے کاموں ہی کو ختم کریں جو بے حد اہم ہیں، ورنہ کل کلاں جب اردو دیوناگری اسکرپٹ میں پڑھائی جائے گی تو پھر ان باتوں کی طرف کون توجہ دے گا۔

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

دعا گو — احمد یوسف
(پٹنہ)

---

10 نومبر 2002

عزیزم، دعائیں لیجیے!

اس خط کو 'حسن نعیم اور نئی غزل' کی سند سمجھیں، کیونکہ اس کتاب پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ افسوس تو یہ ہے کہ آپ کا مجھ سے، شاہ برہان الدین، میمونہ اور شہیرہ سے (اور ان لوگوں سے حسن نعیم سے جو قربت رہی ہے، اس کی مثال ہی دی جا سکتی ہے) رابطہ قائم رہا، آپ آتے جاتے رہے، فون پر آپ کی باتیں ہوتی رہیں، اس کے باوجود آپ نے یہ لکھ دیا کہ

حسن نعیم کی شادی اپنی پھوپھی کی لڑکی سے ہوئی، جن کے ایک بھائی احمد حسین صاحب جو احمد یوسف کے نام سے افسانے لکھتے رہے ہیں، بھئی میرے والد کا نام سید محمد یوسف صاحب تھا۔ احمد حسین صاحب کے والد کا نام سید یوسف حسین تھا۔ احمد حسین بیرسٹر تھے اور بہت سال تک انگلینڈ میں رہے تھے۔ بے حد alchohalic ہو گئے تھے۔ شراب انھیں کم عمری ہی میں لے ڈوبی۔ پٹنہ میں ہی مرے۔[1]

حسن نعیم کی ترکیبوں میں آپ نے 'دشتِ غربت' کا ذکر نہیں کیا ہے۔ میرے خیال میں انھوں نے دو جگہ دشتِ غربت کا استعمال کیا ہے: 'مل گئے جب زرمادیشور دشتِ غربت میں نعیم' اس غزل کا ایک مصرعہ ہے 'اک غمزدہ کو میر کا دیوان مل گیا'۔ یہ ڈاکٹر زرمادیشور پرشاد سابق وی سی مگدھ یونیورسٹی تھے۔ دوسرے مقطعے میں 'دشت غربت میں یہ کیا کم ہے کہ ہم نام ملا'، یہ نیویارک میں چودھری محمد نعیم کے لیے کہا تھا۔ جس نسخے کی آپ نے فوٹو کاپی کرائی تھی اس میں حاشیے پر ان کی تحریر ہے (چودھری محمد نعیم)۔ وہ بھی ان دنوں نیویارک میں تھے۔ ابوالخیر کشفی کے لیے انھوں نے کہا تھا (اس وقت اشعار میرے سامنے نہیں ہے)

نغمے تھے مضمحل تو...

کشفی ملے تو شعر کا سامان مل گیا

حسن نعیم کو بہار کا ایک ایوارڈ ملا تھا، فخر الدین عارفی کیا جانیں۔ کتاب آپ ابوالخیر کشفی، مشفق خواجہ، جمیل جالبی اور محمود واجد کو ضرور بھیجیے۔ پتا نہ ہو تو بھیج دوں گا۔

احمد یوسف

(پٹنہ)

---

7 اپریل 2005

عزیزم، دعائیں لیں!

ایک رات آپ کا فون آیا تھا، شاید میں اس وقت کہیں گیا ہوا تھا، آپ نے بیگم کو بتایا تھا کہ پھر فون کریں گے، لیکن آپ کے فون کا انتظار ہی رہا۔

---

[1] نام میں مماثلت سے تسامح ہوا تھا۔ اس ایڈیشن میں اس کی تصحیح کر دی گئی ہے۔ (احمد کفیل)

آج سویرے میں نے 'آہنگ' میں طبع شدہ حسن نعیم کا خاکہ پڑھا— 'پاپیادہ تھا مگر راہ میں دہ دھوم مچی' تو اس میں کچھ ایسی باتیں تھیں جن سے میری یاد تازہ ہوگئی، جیسے اس میں ان کی دو نظموں کا ذکر ہے اور ان کے دو ایک بند بھی شامل ہیں۔ پھر انگریزی میں لکھا گیا ان کے ایک ناول کا بھی ذکر ہے۔ پھر اس دور کی کچھ غزلوں کے کچھ اشعار بھی میں نے شامل کیے ہیں۔ پتا نہیں وہ خاکہ آپ کی نظر سے گزرا ہے یا نہیں۔ باقر مہدی کا خاکا میں نے اب تک نہیں پڑھا ہے۔ ایک صاحب نے بھیجنے کو کہا ہے، آپ کا کلیات کا کام ہوا؟

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ آپ کا— احمد یوسف

(پٹنہ)

---

13 اگست 2003

عزیزم!

آپ کی کتاب پر توقیر عالم کا مضمون پسند آیا۔ امید ہے کہ آپ ایسے سارے مضامین یکجا کر رہے ہوں گے۔ آپ پٹنہ آئے مگر مجھ سے ملنے نہیں آئے۔ میری صحت خراب رہنے لگی ہے، اس لیے گھر سے بہت کم نکلتا ہوں۔ لائبریریوں سے آپ کلام حسن نعیم یکجا کرتے رہیں۔ مظہر امام، نادم بلخی، منظر شہاب، شکیل الرحمٰن، پرکاش فکری، صدیق مجیبی، وہاب اشرفی اور بھی کئی احباب آپ کی مدد کریں گے۔ سب ہی آپ کے لیے دعا گو ہیں اور چاہتے ہیں کہ کلام حسن نعیم کی تدوین کا کام بخیر وخوبی انجام پا جائے۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں! دعا گو— احمد یوسف

(پٹنہ)

❁

ندا فاضلی

تاریخ و سنہ ندارد

کفیل صاحب! تسلیم

آپ کا کارڈ ملا۔ جس گجراتی کتاب کا آپ نے ذکر کیا ہے، وہی ہندی میں بھی دہلی میں وانی پرکاشن نے شائع کی ہے۔ اس میں جو دیباچہ ہے وہ ماہنامہ 'شاعر' کے کسی شمارے میں

مضمون کی صورت میں شائع ہوا تھا۔ اس سلسلے میں آپ مدیر 'شاعر' سے رابطہ کریں۔ حسن نعیم صاحب پر اس مضمون کے علاوہ بھی میں نے مختصراً اپنی کتاب 'دیواروں کے باہر' میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ یہ کتاب شاہد ماہلی 'ایوان غالب' نے شائع کی ہے۔ شہر بانو صاحبہ سے میں زیادہ واقف نہیں ہوں۔ وہ ایک مغنیہ ہیں۔ ایک دو بار صرف نعیم صاحب کے ساتھ ہی ان سے مل پایا تھا۔ ان سے شادی کی تھی یا نہیں، اس بارے میں مجھے علم نہیں ہے۔

مشفق خواجہ (پاکستان) نے اپنے ایک سہ ماہی رسالہ میں (اس کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے) حسن نعیم پر ایک گوشہ بھی شائع کیا تھا۔ دہلی میں عتیق اللہ یا صادق اس تعلق سے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں آپ نعیم صاحب کی بیٹی اور بیگم سے بھی بات کریں۔

خیر طلب — ندا فاضلی

(ممبئی)

تاریخ و سنہ ندارد!

برادرم، تسلیم!

آپ کا کارڈ ملا۔ گجراتی میں حسن نعیم کی جو غزلیں شائع ہوئی ہیں وہ ان کے اردو مجموعہ سے لی گئی ہیں۔ اس کے کاپی رائٹ کے لیے آپ نعیم صاحب کی بیٹی شہیرہ سے بات کریں۔ میں نے بھی انہی سے اجازت حاصل کی تھی۔ امید ہے اچھے ہوں گے۔

خیر طلب — ندا فاضلی

(ممبئی)

تاریخ و سنہ ندارد!

برادرم احمد کفیل، آداب!

آپ کی کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' ملی۔ یاد کرنے کا شکریہ!

کتاب مجھے اچھی لگی۔ اس کی اہمیت اس لیے بھی ہے، کہ آپ نے ایک ایسے شاعر کو موضوع بنایا ہے جو مصلحت پسند تنقید کے دائرے سے باہر کا شاعر ہے۔ روایت سے یہ احتجاج آپ کے ادبی مزاج کا معیار بھی قائم کرتا ہے اور تنقید کے مستعمل رواج سے انکار بھی کرتا ہے۔

حسن نعیم نئی غزل کی ایک اہم آواز ہیں، آپ نے اس آواز کے انداز اور اس کے انفرادی راز کا (اپنے الفاظ میں) جس طرح قارئین کو ہم راز بنایا ہے وہ قابل تعریف ہے۔

آپ کا یہ کام نئی غزل میں حسن نعیم کی انفرادیت کو ہی وضاحت سے اجاگر نہیں کرتا بلکہ ان پر آئندہ کام کرنے والوں کے لیے راستہ بھی ہموار کرتا ہے۔ آپ کی نثر کی شفافیت، تنقیدی زبان کی اس روایت کی حصہ دار محسوس ہوتی ہے جو ماضی قریب میں فراق اور عسکری سے ہوتی ہوئی ہمارے عہد میں خلیل الرحمٰن اعظمی اور وارث علوی تک آتی ہے۔ آپ جو کہنا چاہتے ہیں، اسے بنا کسی الجھاؤ یا پینترے بازی کے پڑھنے والے تک پہنچا دیتے ہیں اور یہ بڑی بات ہے۔ ایک اچھی ادبی کاوش کے لیے مبارک باد۔ امید ہے آپ کا یہ تحریری سلسلہ یونہی جاری رہے گا۔

حسن نعیم پر میں نے گجراتی اسکرپٹ میں ایک کتاب ایڈٹ کی تھی۔ وہ ہندی میں ابھی شائع نہیں ہو سکی۔ اس میں میری مصروفیات کا دخل زیادہ ہے۔ گجراتی میں یہ کتاب، نعیم صاحب کی صحافی بیٹی شہیرہ سے حاصل کی جا سکتی ہے۔

خیر طلب — ندا فاضلی
(ممبئی)

منظر شہاب

سنہ ندارد!

برادر عزیز، محبتیں!

'حسن نعیم اور نئی غزل' کا تحفہ میرے لیے باعثِ تمکنت ہوا۔ میری بے شمار گزشتہ یادیں تازہ ہو گئیں۔ موصوف کے خاندان کے متعلق چند اطلاعات نے میری واقفیت میں اضافہ کیا۔

اُن سے میری پہلی ملاقات 1949 کے اواخر میں 'ساتھی' روزنامہ پٹنہ کے دفتر میں سہیل عظیم آبادی نے کرائی تھی۔ انتہائی مختصر گفتگو میں زیادہ تر وہی بولتے رہے۔ میں نے محسوس کیا کہ مارکسزم اور ترقی پسند ادب کے ایک پر جوش اور assertive نوجوان سے گفتگو ہو رہی تھی۔

1950 میں پٹنہ کالج کے اردو ایم اے میں میرا داخلہ ہو گیا۔ اختر پیامی اور کلام حیدری

بھی آ گئے ۔ بعد ازاں شکیل الرحمٰن اور انور عظیم نے بھی اقامت اختیار کرلی۔ احمد یوسف، انیس امام، نادم بلخی، شہزاد معصومی، شاہد انور اور بدیع مشہدی پہلے سے موجود تھے۔ کچھ ایسا ہوا کہ ترقی پسند نظریات کے ہمنوا نوجوان ادیبوں کی کہکشاں سی بن گئی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین، پٹنہ، زبردست توانا مرد کے ساتھ ابھری اور عظیم آباد کے ادبی حلقوں پر چھا گئی۔ سرفرازی کا تاج سر پر جگمگانے لگا۔ حسن نعیم اس انجمن کے فعال سکریٹری تھے۔ 1951 کی یادگار کونشن انھی کی سکریٹر شپ میں منعقد ہوا تھا۔ انجمن کے فیصلے کے مطابق 'نئی راہ' کو پٹنہ سے شائع کرنے کی اسکیم بنائی گئی۔ اس کا واحد شمارہ منظر عام پر آسکا۔ معاون مدیر کی حیثیت سے خاکسار بھی شامل تھا۔ اس جریدہ میں ادب کی جدلیاتی ماہیت پر حسن نعیم کا ایک پرمغز مقالہ شائع ہوا تھا۔ ان کی شناخت ایک ناقد کی حیثیت سے نمایاں تھی۔ انھوں نے ایک بہت عمدہ خاکا بھی لکھا تھا، جو شاہد انور کی لاابالی زندگی سے وابستہ تھا۔ اس کا عنوان میرے ذہن میں محفوظ نہیں ہے۔ شاید کالم نویس یا اور کچھ۔ مجھے یاد نہیں کہ حسن نعیم نے انجمن کی نشست میں بھی کوئی شعری تخلیق پیش کی تھی۔ ان کا ذہن کسی محور کی تلاش میں تھا۔

ایک روز جب وہ میرے کمرے میں آئے تو بہت مضطرب تھے۔ کہنے لگے ایک غزل سناؤں؟ عنایت۔ غزل کا مطلع یوں تھا:

ظلمتیں چاہیں نہ چاہیں آفتاب آئے گا دوست
اعتبار آئے نہ آئے انقلاب آئے گا دوست

پوچھا کوئی مشورہ؟ میں نے کہا آفتاب آئے گا، کو بدل دیں، تو اچھا رہے گا۔ کچھ عرصہ بعد ترمیم شدہ شعر یوں شائع ہوا:

عرش و کرسی یہ نہیں جو حکم سے چل جائے گا
یہ زمیں ہے رفتہ رفتہ انقلاب آئے گا دوست

اس شعر کو آپ نے بھی اپنی کتاب میں صفحہ 23 پر نقل کیا ہے۔ 1952 میں وہ ختم نہ ہونے والے سفر پر روانہ ہو گئے۔ کلکتہ، دلی، امریکا، سعودی عربیہ اور پھر ہندوستان۔ کیا خبر تھی کہ جس صنف ادب کی جستجو کی تپش ان کے دل کو گرما رہی تھی، وہ صنف ادب خود ان کی تلاش میں سرگرداں تھی۔ ان کا ذوقِ غزل گوئی نکھرتا گیا اور رفتہ رفتہ وہ نئے لب و لہجے اور نئی سوچ

کے منفرد غزل گو کی حیثیت سے اردو ادب کو نادر اسالیب اور معانی سے روشناس کرتے رہے۔

1954 میں مجھے کواپریٹو کالج جمشید پور کی جانب سے کل ہند یوتھ فیسٹول دلی، میں شرکت کا موقعہ ملا۔ میں نے اپنے پروگرام سے انھیں آگاہ کر دیا تھا۔ ان دنوں ان کی تنک مزاجی اور مغرور رویے کا ذکر عام تھا۔ دلّی کے تال کٹورا گارڈن میں ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے نمائندہ کلچرل مقابلے چل رہے تھے۔ دسمبر کا مہینہ تھا اور کڑاکے کی سردی تھی۔ ایک روز 3 بجے سہ پہر کو اطلاع ملی کہ کوئی صاحب Campus کے باہر میرا انتظار کر رہے ہیں۔ جب باہر آیا تو حیران رہ گیا۔ حسن نعیم مسکرا رہے تھے۔ وہ تقریباً ایک گھنٹے سے منتظر تھے۔ بار بار اطلاع بھجوا رہے تھے۔ مجھے اپنے ساتھ South Avenue لے آئے۔ مختلف موضوعات زیر گفتگو رہے۔ شعر و شاعری کا سلسلہ بھی چلا۔ انھوں نے M.P. Canteen میں میری ضیافت کی۔ میں واپس آ گیا۔ وہ بے حد مہذب اور دیرینہ قدروں کے پاس دار انسان تھے۔ میں نے غرور اور تنک مزاجی کا شائبہ بھی نہیں محسوس کیا۔

ان کے تابناک عروج اور تاریک زوال کی خبریں ملتی رہیں۔ آخری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں کریم سٹی کالج جمشید پور کا پرنسپل تھا اور بڑے شوق سے انھیں کالج کے مشاعرے میں مدعو کیا تھا۔ ان سے کوئی گفتگو نہیں ہو سکی۔ وہ مخمور بے تاب تھے۔ صبح ہوتے ہی خاموشی سے رانچی کے لیے روانہ ہو گئے۔ مجھے بے حد صدمہ پہنچا۔ حسن نعیم نے جو راہ اختیار کی تھی وہ توانا جدیدیت کی جانب لے جاتا ہے۔ جدیدیت خوش گوار اور تازہ ہوا کی مانند اردو ادب کے گلستاں میں داخل ہوئی۔ لیکن 'خالص جدیدیوں' نے اس ہوا کو مسموم کر دیا اور آج بیزار اذہان کسی اور سمت کی تلاش میں ہیں۔ قابل غور امر یہ ہے کہ وہی ادبا جدید ادب کے معتبر اور ممتاز تخلیق کار تسلیم کیے جاتے ہیں جن کا تعلق ترقی پسند ادب سے رہا ہے۔ کوائف مسائل اور فکر کے خوبصورت، جدید اور ذہین اظہار نے حسن نعیم کی شاعری کو انفرادیت کا درجہ عطا کیا ہے۔

ان کی بربادی اور بے وقت موت کے اسباب کی جستجو ادبی نفسیات کا اہم موضوع ہے۔ تحقیق سے وابستہ اساتذہ اور تحقیق میں منہمک اسکالرس کو اس جانب توجہ دینی چاہیے۔ اردو ادب کا یہ اکیلا حادثہ نہیں ہے۔

برادرم! آپ نے میرے تمام ہم عصر کی طرف سے ادبی قرض کی ادائیگی کی ہے۔ آپ کی

محنت، مطالعہ، دروں بینی، اور اسلوب بیان قابل ستائش ہے۔ میں نے اپنے مضمون 'اختر پیامی۔ تیرے غزال کیا ہوئے' (ترجمان، مدیر جابر حسین، پٹنہ) میں موصوف کا کئی جگہ ذکر کیا ہے۔ یہ مضمون راقم الحروف کے نثری مجموعے 'اور پھر بیاں اپنا' میں بھی شامل ہے۔ آپ کی دوسری تصنیف 'کلیات حسن نعیم' کا منتظر ہوں۔ جواب میں تاخیر کے لیے افسوس ہے۔ آنکھوں میں موتیا اتر رہا ہے۔ تحریر ادھر سے اُدھر ہو جاتی ہے۔ پڑھنے والوں کو زحمت ہوتی ہے۔ کیا کروں؟

خیر اندیش — منظر شہاب

(جمشید پور)

❁

شہر بانو حسن نعیم (حسن نعیم کی دوسری اہلیہ)

11 مارچ 2000

جناب احمد کفیل صاحب! تسلیم

آپ کا خلوص نامہ ملا، یہ جان کر از حد خوشی ہوئی کہ حسن نعیم کا شعری مجموعہ 'دبستان' آپ تک پہنچ گیا۔ اردو شعر و ادب میں حسن نعیم کے مقام کا آپ جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ میری دلی دعا ہے۔ اس کام میں خدا آپ کو کامیاب کرے۔ آمین!

آپ کے اس کام میں اگر میں آپ کے کسی کام آسکوں تو آپ ضرور لکھیں۔ آپ نے یہ خط جس پتے پر لکھا ہے وہی دراصل میرا پتا ہے۔ میں پوری کوشش کروں گی آپ کے سوالوں کے جواب دینے کی۔ اس امید کے ساتھ کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

خدا حافظ

فقط — شہر بانو حسن نعیم

(ممبئی)

---

8 جولائی 2000

مکرمی، جناب احمد کفیل صاحب، سلام و رحمت

اس امید کے ساتھ کہ آپ بخیریت ہوں گے۔ آپ کے سامنے حاضر ہوں اور ساتھ ہی

جواب کے تاخیر کے لیے معافی کی خواستگار۔ معافی اس لیے کہ آپ کا خط اس وقت آیا جب میں بمبئی سے باہر تھی اور اس بات کا بھی نہایت افسوس ہوا، جس نمبر پر آپ نے فون کیا وہ نمبر ہی لیٹر پیڈ پر غلط چھپا ہوا ہے۔فون نمبر ہے 8931401۔ میں نے اوپر (لیٹر پیڈ پر) بھی صحیح کیا ہے۔

بہر حال آپ اب تک میری طرف سے مایوس ہو چکے ہوں گے۔ خیر۔

آپ نے لکھا ہے آپ حسن نعیم کے ذہنی سفر کے بارے میں سمجھنا چاہتے ہیں۔ اس بارے میں چند باتیں لکھ رہی ہوں، کیوں کہ ان کی زندگی کا آخری دور میرے ساتھ گزرا۔ ان کی علمی اور ذہنی باتوں کا اثر ان کی شاعری میں ہی ظاہر ہوتا ہے۔ وہ خود کہتے تھے کہ ان کی شاعری ان کی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔ حسن نعیم کو زندگی کے سفر میں دنیا سے جو غم اور خوشیوں کی شکل میں جو کچھ ملا وہی ان کی شاعری ہے۔ مجھ پر بھی یہ بات صاف گئی تھی کہ ان کے خیالات، دنیا اور دنیاداری سے بہت الگ تھے۔ بقول ان کے:

ایک الگ سوچ کا بانی کہہ کے
ہم کو دنیا نے ستایا کیا کیا

ان کی شاعری حسن وعشق کا بیان نہ رہ کر زندگی کی سچائی کو بھی سامنے لے آتی ہے۔ ذاتی زندگی میں ان کو بہت کم عمری میں ہی کامیابی نصیب ہوئی تھی، لیکن ان کے اندر جستجو کرنے والے شاعر نے زندگی کے سارے عیش وآرام ٹھکرا کر، غزل کی جستجو میں کیا غم نہ اٹھائے لیکن غم سے کبھی بھی مایوس نظر نہ آئے۔ بلکہ غم کو اپنا حوصلہ بنایا، طاقت بنائی۔ اور وہ کہتے ہیں:

مر گیا ہوتا بھروسہ کرکے خوشیوں پر نعیم
غم کی طاقت تھی کہ جس کے بل پہ زندہ رہ گیا

غم کو طاقت بنانے کی فنی اعتبار سے یہ ان کی اپنی ایک الگ ہی سوچ تھی۔ مجھ سے گفتگو کے دوران، زندگی کی سچائی کو خوبصورتی سے پیش کرنے کے متعلق ہمیشہ ذکر ہوتا۔

مجھے شعر وسخن سے بے حد لگاؤ ہے لیکن مطالعہ زیادہ نہیں ہے۔ لیکن حسن نعیم کے ساتھ رہ کر ان کی شاعری اور شخصیت سے جو کچھ میں نے جانا آپ کو لکھ دیا ہے اور آپ کیا جاننا چاہتے ہیں حسن نعیم صاحب سے متعلق، ضرور لکھیں۔

پھر سے ایک بار آپ کو اپنے کام میں کامیابی کی دعا کرتے ہوئے آپ سے اجازت چاہتی ہوں۔

(اس خط کو Post کرنے کے بعد آج شام بمبئی سے باہر ایک ہفتہ کے لیے جارہی ہوں۔ 7 جولائی کے بعد بمبئی میں ہوں)

خدا حافظ

فقط— شہر بانو حسن نعیم

(ممبئی)

---

11 فروری 2003

بھائی احمد کفیل صاحب! سلام علیکم

آپ کی کتاب مجھے نہیں ملی۔ لیکن اس کے کچھ حصے لوگوں نے مجھے پڑھ کر سنائے۔ اس میں کئی غلط باتیں لکھ دی گئی ہیں۔

(1) میں نکاح نامہ کی کاپی بھیج رہی ہوں۔ اس سے صاف ثابت ہوگا کہ میری ان سے شادی ہوئی تھی۔

(2) حسن نعیم صاحب جب دلی میں تھے تو میری ان کی جان پہچان نہیں تھی۔ میں نے پہلی مرتبہ ان کو ڈاکٹر عبدالستار دلوی کے گھر دیکھا، اور اس وقت ان کو سہارا دیا جب دلوی صاحب بھی اپنے گھر سے نکالنے والے تھے، اور ایسا کوئی شخص نہیں تھا جو ان کو اپنے گھر میں رکھنے کے لیے تیار ہو۔

(3) میں پیشہ ور گانے والی نہیں ہوں، بلکہ میں نے بمبئی یونیورسٹی سے اردو میں، BA Hon. کیا ہے، اردو کی خدمت کے لیے یہ کام کر لیتی ہوں کہ خاص محفلوں میں ادبی غزلیں سنا دیتی ہوں، یہ کام میں اردو کو زندہ رکھنے کی خاطر کرتی ہوں نہ کہ پیسہ کمانے کے لیے۔

آپ اپنی ایک کتاب ضرور عنایت فرمائیے!

خدا حافظ

فقط— شہر بانو حسن نعیم

(ممبئی)

9 مارچ 1984

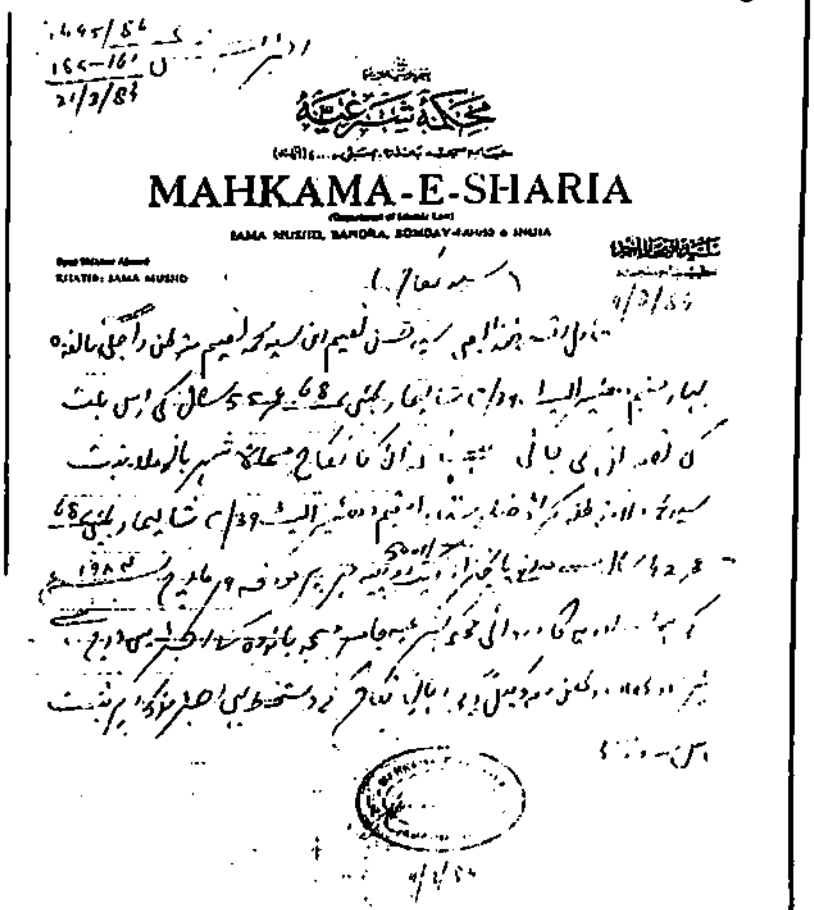

(سند نکاح)

حامل رقعہ ہذا یعنی سید حسن نعیم ابن سید محمد نعیم متوطن راجگیر نالندہ بہار، مقیم دہسر ایسٹ C/39 شالیمار بمبئی نمبر 68، عمر 55 سال کی اس بات کی تصدیق کی جاتی ہے کہ ان کا نکاح مسماۃ شہر بانو ملا بنت سید محمد ملا، متوطنہ کراڈ، ضلع ستارا، مقیم دہسر ایسٹ C/39 شالیمار بمبئی نمبر 68، عمر 42 سال سے مبلغ پانچ ہزار ایک روپیہ مہر پر مورخہ 9 مارچ 1984 کو ہوا۔ اور یہ کارروائی محکمہ شرعیہ جامع مسجد باندرہ کے رجسٹر میں درج ہے نیز دولھا و دولھن مع وکیل و گواہانِ نکاح کے دستخط بھی رجسٹر مذکور پر ثبت ہیں۔ فقط

سید شاہ برہان الدین احمد (حسن نعیم کے ساڑھو کے صاحب زادے)

14 اپریل 2001

عزیزم، سلام علیکم!

خط ملا لیکن جواب میں تاخیر کا افسوس ہے۔ وجہ یہ ہوئی کہ ہم پرانے شہر سے دور آ گئے ہیں اور آپ کی طلب کے لیے ہمیں جانے میں دقت ہوئی۔ اس سے قبل دو بار گئے لیکن ملاقات نہ ہو سکنے کی وجہ کر کام نہ ہو سکا۔

خیر آج الحمدللہ آپ کی مطلوبہ شئے مل گئی ہے، روانہ کر رہا ہوں۔

(1) حضرت میر سید امام الدین راجگیر ی

2) فاطمہ (زوجہ ملا عبدالسمیع زاہدی)

(3) سید عبدالواحد (سربھدا)

(4) یار محمد عرف میر جمن

(5) سید اشرف علی

(6) سید شاہ احمد حسین

(7) سید شاہ غلام قاسم شیخ پوروی

(8) سید شاہ محمد نعیم بیرسٹر تھے۔ سید محمد سمیع ان کی شادی محلہ بر داد بہار شریف میں ہوئی۔

(9) سید نعیم، محمد نعیم، علی نعیم، حسن نعیم ان کی شادی مولوی محمد یوسف صاحب، صدر گلی پٹنہ سیٹی کی صاحب زادی حشمت آرا بیگم سے ہوئی۔ اولادیں: میمونہ نعیم زوجہ ڈاکٹر سید منیر عالم، شہیرہ نعیم زوجہ شاہد جمیل لکھنؤ، ارشاد نعیم، اشعر نعیم ان کی شادی دلی میں ہمیرہ سے ہوئی۔

امید کہ یہ معلومات مفید ہوں گی۔

اس سلسلے میں ایک گزارش ہے کہ میر امام الدینؒ سے اوپر کا نسب نامہ ہمیں بھی لکھیے گا۔

اگر ممکن ہو تو تحقیق سے ہمیں بھی باخبر کیجیے گا۔ اور عنایت ہو تو اس خدمت کے لیے اس عاصی کا ref. ضرور دیجیے گا۔ خانقاہ منیر شریف۔ پٹنہ کے واسطے سے۔

امید کہ یہ معلومات کارآمد ہوں گی۔ جواب کے لیے امید رہے گی۔

والسلام — سید شاہ برہان الدین احمد

(پٹنہ)

---

4 مئی 2001

عزیزم، سلام علیکم

آج ہی خط ملا۔ شکر ہے میرا خط مل گیا۔

مجھے افسوس ہے کہ نسب نامے سے رشتے کا تعلق واضح نہیں ہوا۔ غلطی میری ہی تھی کہ میں نے یہ وضاحت سے نہیں لکھا۔ اصل وجہ یہ ہے کہ نسب نامے اسی طرح لکھے اور پڑھے جاتے ہیں۔ ان میں ابن یا بنت لکھا نہیں جاتا بلکہ مصروف (understood) ہوتا ہے۔ بہرحال پھر اب اس کو یوں پڑھیں:

(1) سید شاہ حسن نعیم

(2) ابن سید شاہ نعیم صاحب بیرسٹر۔ جو کہ آخر میں جج ہو گئے تھے مگر قسمت نے یاوری نہیں کی اور انتقال ہو گیا۔ ان کی شادی محلہ مرداد، بہار شریف میں ہوئی تھی۔

(3) ابن شاہ غلام قاسمؒ شیخ پوروی

(4) ابن شاہ احمد حسین۔

(5) ابن شاہ اشرف علی۔

(6) ابن شاہ یار محمد عرف میر جمن

(7) ابن سید عبدالواحد (سربھدا)

(8) ابن فاطمہ (زوجہ ملا عبدالسمیع زاہدی اگر ان کا نسب نامہ حضرت مخدوم شعیبؒ تک مل جائے تو ہمیں ضرور بھیجنے کی تکلیف کریں۔ مشکور ہوں گا۔)

(9) بنت حضرت میر سید امام الدین راجگیری شطاریؒ

امید کہ آپ کی تشفی ہو گئی ہوگی۔

اور اگر مزید سند درکار ہو تو اس سلسلے میں جناب ڈاکٹر شمیم منعمی سجادہ نشین درگاہ و خانقاہ منعمیہ

قمریہ، ملامیتن گھاٹ، پٹنہ سیٹی 800008 سے میرے حوالے سے رابطہ کر سکتے ہیں اور تصدیق ہوجائے گی۔ ان کا نمبر ہے 0612-640786 (email-silsilah@rediffmail.com)

خدا کرے کہ مقالہ وقت پر مکمل ہو جائے۔

آپ نے گھر آنے جانے میں پٹنہ کا ذکر کیا ہے کیا دولت خانہ ہمارے ہی اطراف میں ہے؟

خیر اندیش — برہان الدین احمد
(پٹنہ)

❁

میمونہ عالم (حسن نعیم کی بڑی صاحب زادی)

10 جون 2002

کفیل صاحب، تسلیم!

کل کے اخبار میں اچانک آپ کا مضمون 'نئی غزل کا ایک دانشور: حسن نعیم' دیکھا۔ اس قدر خوشی ہوئی۔ اُس میں آپ کا نام پتا بھی تھا تو آپ کو خط لکھنے بیٹھ گئی۔ میرے ابی کے بارے میں لکھ کر اردو اخبار میں چھپوایا اس کے لیے آپ کا ہم لوگ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس طرح لوگوں نے بھی حسن نعیم کو یاد کرلیا ہوگا۔ بہت دنوں بعد ان کا کچھ چھپا ہے۔ بہت اچھا لکھا ہے۔ اُمید ہے آپ کی thesis پوری ہوگئی ہوگی۔ ابّی کی غزلوں کا photo copy کروانا چاہتے ہیں اگر آپ اپنے ساتھ لیتے آتے تو بہت مہربانی ہوتی۔ شہیرہ کے لیے بھی اخبار لے کر رکھ لیا ہے۔

اُمید ہے آپ موقع نکال کر ضرور آئیں گے۔ ڈاکٹر صاحب دعائیں کہتے ہیں۔

خدا حافظ

خلوص کے ساتھ — میمونہ عالم
(دہلی)

---

18 اگست 2003

محترم کفیل صاحب، دعائیں لیں!

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ بہت دنوں سے خط لکھنا چاہتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کی والدہ بہت بیمار تھیں، پھر 30 جون کو ان کا رانچی میں انتقال ہوگیا۔ اللہ مرحومہ کو مغفرت کرے۔ یہ احمد یوسف صاحب کی بڑی بہن تھیں۔ ان کی وجہ کر ہم لوگ پریشان تھے۔ پٹنہ کے اخبار قومی تنظیم میں ابی کی کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل پر' تبصرہ چھپا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی پٹنہ سے آئے تو وہ اخبار لے کر آئے ہیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ یہ سب آپ کی لگن اور محنت کا نتیجہ ہے۔ ایک دو بات غلط لکھا گئی جس کی وجہ کر تھوڑا اچھا نہیں لگا۔ اس کے مطابق آپ کی شہیرہ سے بھی بات ہوگئی ہوگی۔ اس بات کا ہم لوگوں کو احساس ہے، آپ نے بہت محنت کی ہے۔ کلیات کا کام کہاں تک پورا ہوا دل لگا ہے۔ خدا کرے خواہش کے مطابق سب کام پورا ہوجائے۔ اجازت دیں۔

اللہ حافظ — میمونہ آپا
(دہلی)

---

5 مارچ 2004

کفیل صاحب، تسلیم!

اُمید ہے آپ بخیر ہوں گے!

آپ کو تکلیف دے رہی ہوں وہ یہ کہ اگر آپ کے پاس حسن نعیم صاحب کی نظم 'عظیم آباد' ہو تو ہم کو اس کی کاپی کروا کر بھیج دیں۔ ایک اردو کا پرچہ 'دلی' ہے جو آپ جانتے ہوں۔ ان لوگوں نے مانگا ہے۔ اُمید ہے آپ ہمیں جلد روانہ کردیں گے۔ آپ کی شکر گزار ہوں گی۔
باقی سب اللہ کا فضل ہے۔ آپ کا فون نمبر غالباً بدل گیا ہے۔ فون کیا تھا۔ یہ پوسٹ کارڈ ملنے پر اطلاع کریں گے۔ خدا حافظ!

ناچیز — میمونہ
(دہلی)

علی احمد فاطمی

10 مارچ 2003

عزیزم!

'حسن نعیم اور نئی غزل' کی ایک کاپی مل گئی، شکریہ! حسن نعیم میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ آپ نے ان پر کام کر کے بہت اچھا کام کیا نیز ایک نسخہ مجھے بھی عنایت کیا۔ خدا آپ کو خوش رکھے۔ امید ہے آپ کے کاموں کا سلسلہ جاری رہے گا۔

خیر اندیش— علی احمد فاطمی

(الہ آباد)

شمیم طارق

11 فروری 2003

برادرم احمد کفیل صاحب، سلام مسنون!

'حسن نعیم اور نئی غزل' اچھی کوشش ہے۔ آپ نے یقیناً بہت محنت کی ہے مگر ان کے آخری دنوں کے متعلق بعض باتیں ایسی لکھ دی ہیں جن سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا۔ آخری وقت میں ان کا کوئی ساتھی نہیں تھا۔ مجھ سے جو ہوسکتا تھا کرتا تھا۔ تدفین بھی ہمیں لوگوں نے کی۔ شہر بانو نے ان کے ساتھ بہت حسن سلوک کیا۔ وہ نہ ہوتیں تو حسن نعیم مزید پریشانیوں میں مبتلا ہوتے۔

میں ان کے نکاح میں تو شریک نہیں تھا مگر حسن نعیم نے مجھ سے کہا تھا کہ اگر تم باہر نہ ہوتے تو میرے نکاح میں شرکت کرتے۔ میں نکاح کی روایت کو صحیح سمجھتا ہوں۔

حسن نعیم کے انتقال کے بعد ان پر دو تین مضامین بھی میں نے لکھے اور ان کے پرانے ساتھی اس کو بھی برداشت نہیں کر سکے تھے۔ لعن طعن کرتے تھے۔

حسن نعیم کی شاعری میں جتنا حسن ہے زندگی اتنی ہی عبرت ناک گزری۔ ہر طرف مایوسی ہی مایوسی تھی۔ امید کی کوئی کرن تھی تو وہ عورت جس کو مغنیہ کہا جارہا ہے۔ اس کو غزل گائیکی کا شوق ہے وہ پیشہ ور مغنیہ نہیں ہے۔ اس غلط فہمی میں بہتوں نے اس کو برا سمجھا مگر حقیقت یہ ہے کہ اس نے حسن نعیم کو مزید مصیبتوں میں مبتلا ہونے سے بچالیا۔ اس کتاب کے لیے میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔

شمیم طارق
(ممبئی)

---

1 مارچ 2003

برادرم احمد کفیل صاحب، سلام مسنون!

مجھے یقین ہے کہ آپ 'کلیات حسن نعیم' کو سلیقے سے ترتیب دیں گے۔ صرف دو باتوں کا خیال رکھیے کہ حسن نعیم مجھ سے بہت کسمپرسی میں ملے تھے۔ مجھ سے جو ہوسکتا تھا، کرتا تھا۔ تجہیز و تکفین بھی ہم ہی لوگوں نے کی۔ قبرستان میں حسن کمال، ندا فاضلی، میں اور چند دوسرے افراد تھے۔ مجروح، سردار، باقر مہدی، اخترالایمان، کیفی کوئی نہیں تھا۔

شہر بانو کے بارے میں اور تو کچھ نہیں بتا سکتا لیکن اتنا ضرور کہتا ہوں کہ اگر وہ نہ ہوتیں تو حسن نعیم کو فٹ پاتھ پر مرنا پڑتا۔ دبستان بھی اسی عورت کی قربانی سے شائع ہوا۔ مہاراشٹر اردو اکادمی نے نہ تو ایک کتاب خریدی اور نہ مسودہ پر ایک روپیہ دیا۔

میں نے حسن نعیم پر تین مضامین لکھے اور وہی ان کے تعارف کی بنیاد ہیں۔ میرے مضمون پر مجروح چڑ گئے تھے۔ اتفاق سے وہ مضامین میرے پاس محفوظ نہیں ہیں۔ صرف ایک مضمون دبستان میں شامل ہے۔

ایک اچھا کام کرنے پر ایک بار پھر مبارک باد۔

شمیم طارق
(ممبئی)

---

29 مارچ 2003

برادرم احمد کفیل صاحب، سلام و رحمت!

شہر بانو صاحبہ سے کوئی رابطہ نہیں رہ گیا تھا۔ آپ کا خط آنے کے بعد ان کا فون نمبر حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس لیے تاخیر سے جواب دے رہا ہوں۔ ان سے ٹیلی فون پر بات کی تو کاپی رائٹ کے سلسلے میں کہا۔ وہ آپ کو خط بھیج دیں گی۔

کتابت حسن نعیم مرحوم نے ہی کروایا اس لیے مسودہ نہیں ہے۔ شکر کیجیے کہ اس عورت نے الزامات سہ کر اس کو شائع کردیا ورنہ دبستان کی بہت سی غزلیں دوسرے لوگ اپنے نام کر لیتے۔ باقی خیریت ہے۔

شمیم طارق
(ممبئی)

---

4 اپریل 2009

برادر عزیز احمد کفیل صاحب، سلام و رحمت!

'کتاب نما' کے تازہ شمارے میں آپ کا مضمون پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ مبارک باد قبول فرمایئے۔ آپ کی حسن نعیم کے متعلق دونوں کتابیں قابل قدر ہیں۔ اس سے بھی اچھی بات یہ ہے کہ آپ اپنے پچھلے کاموں کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ حسن نعیم بھی یہی کرتے تھے۔ انھوں نے کئی بار اس بات کو دوہرایا کہ میں اپنے مصرعوں میں 40 سال بعد بھی ترمیم کرتا رہتا ہوں۔ اپنی ذات یا اپنے کلام کا احتساب بری بات نہیں ہے، اچھی بات ہے۔

آپ کے کام پر اعتراض کرنے والے صاحب تیشۂ نظر ہی نہیں، اختلاف کو ظاہر کرنے کے سلیقے سے بھی محروم ہیں۔ امید ہے آپ کے اس مضمون سے ان کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہو جائیں گی۔

میں نے حسن نعیم کی زندگی میں ان پر ایک مضمون شائع کیا تھا جو ہندوستان پاکستان میں کئی جگہ شائع ہوا تھا، مگر اس کی کوئی نقل میرے پاس نہیں ہے۔ دوسرا مضمون انتقال کے بعد لکھا تھا۔ اس کا ایک حصہ 'بلٹز' میں، ایک حصہ شاعر میں اور مکمل مضمون 'کتاب نما' اور حسن نعیم

کے شعری مجموعے 'دبستان' میں شائع ہوا تھا۔ 'دبستان' کی اشاعت کے بعد بمبئی کے مشہور شعرا حسن نعیم کا مذاق اڑایا کرتے تھے، مجروح اور جعفری نے میرے مضمون کو پڑھ کر لایعنی باتیں کی تھیں۔ مقام شکر ہے کہ اب ان کا نام لیا جا رہا ہے۔ ڈاکٹر امتیاز احمد صاحب کی 'نقوش حسن' میں نے نہیں دیکھی ہے۔ اگر مل جائے تو اچھی بات ہے۔

ایک بار پھر مبارک باد— آپ محنت سے کام کر رہے ہیں۔ یہ محنت رائیگاں نہیں جائے گی۔

شمیم طارق
(ممبئی)

جمال اویسی

16 دسمبر 2002

برادرم احمد کفیل صاحب، تسلیم

آپ کی ارسال کردہ کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' ڈاکٹر مشتاق احمد کے ہاتھوں ملی، اس عنایت کے لیے بہت بہت شکریہ!

آپ نے ایک ایسے فراموش کردہ جدید شاعر پر تحقیقی مقالہ لکھا ہے جس کو نئی نسل کے لوگ تخلیقی حوالے سے جانتے تک نہیں۔ نئے لوگوں کی زبان پر رٹے رٹائے ناموں میں ناصر کاظمی، احمد مشتاق، منیر نیازی، ظفر اقبال، شہریار، بلراج کومل، بشیر بدر، محمد علوی وغیرہ کے نام ہی رہتے ہیں۔ یہ شعرا موجودہ دور کے مشاہیر نام نہ ہوتے اگر نقادوں نے اپنے مقالوں میں انھیں ابھارا نہ ہوتا۔ ناصر کاظمی اور منیر نیازی تو پھر بھی شاعروں میں جینوئن تھے۔ منیر نیازی زندہ ہیں۔ ان کے یہاں غضب کی تخلیقی صلاحیت ہے۔ لیکن مظہر امام ہوں یا حسن نعیم ایسے جدید شاعروں میں ہیں جن کو جدید نقادوں نے علاقائی عصبیت کے تحت بھلائے رکھا اور دیدہ و دانستہ خراب تنقید ان شاعروں پر لکھی۔ حسن نعیم نے غزل کو جتنا کچھ اکیلے دیا ہے نام نہاد جدید شعرا مل کر بھی نہیں دے سکتے۔

آپ نے حسن نعیم پر بہت بہتر کام کیا ہے۔ میں نے سرسری طور پر پوری کتاب دیکھ

ڈالی ہے۔ آپ نے خلوص اور محنت سے یہ تحقیقی کام انجام دیا ہے۔ حسن نعیم کی غزلوں کا انتخاب شائع کر کے آپ نے وقت کی ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی اس کتاب کی ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی ہوگی۔ مشکور ہوں کہ آپ نے میرے ایک غیر مطبوعہ مضمون سے ایک اقتباس اپنی کتاب میں دیا۔ بہت ممکن ہے کہ آپ کے انتخاب غزلیات کی روشنی میں بھی ایک مضمون حسن نعیم کی غزل پر ایک بار پھر لکھوں۔ بہت سی باتیں ادھوری رہ گئی ہیں یا پھر چھوٹ گئی ہیں انھیں مضمون میں لکھنا ہے۔

انور پاشا اور مظہر مہدی کو میرا اسلام کہیے گا۔ یہ لوگ میرے ہمعصر ہیں۔

مخلص ــــ جمال اویسی

(دربھنگا)

❁

رضوان اللہ آروی

26 اگست 2003

عزیز گرامی قدر، تسلیم!

آپ کی گراں قدر اور باوقار کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' آج ہی حرف بہ حرف ختم کی۔ حالانکہ آپ نے کئی ماہ قبل، یہ کتاب مجھے عنایت کی تھی، لیکن، میں اطمینان کے اُن اوقات کا منتظر تھا جب اس کتاب کو یکسوئی کے ساتھ پڑھا جاسکے اور وہ اوقات، اب میسر آئے۔ میں واقعی آپ کا بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے اطلاعات اور مسرت سے بھرے ہوئے چند لمحات عنایت کیے۔ حسن نعیم کی شاعری، بذات خود، ایک مسرت آگیں کیفیت کا نام ہے اور جہاں تک اطلاعات کا تعلق ہے تو ان کے متعلق میری بیشتر اطلاعات، صرف احمد یوسف صاحب کی روایات تک محدود تھیں، آپ کو شاید معلوم نہ ہو، احمد یوسف صاحب کے ساتھ، تقریباً سات برسوں تک میں نے خدا بخش لائبریری میں کام کیا ہے۔ وہ اکثر حسن نعیم کے فکر وفن پر گفتگو کرتے تھے، لیکن ان کی ذاتی زندگی کے بارے میں زیادہ کھلتے نہیں تھے۔ تاہم وہ ان کا ذکر 'خیر' ہی کے ساتھ کرتے تھے۔ میں 'نئی غزل' کے اس امام کے بارے میں بہت کچھ جاننے کا خواہش مند تھا اور میری یہ خواہش، آپ کی کتاب سے پوری ہوئی۔

یہ بات بالکل صحیح ہے کہ حسن نعیم کی شخصیت اور ان کی شاعری پر یہ پہلی مفصل اور مبسوط کتاب ہے اور صحیح تر بات یہ ہے کہ اس میں غیر جانب دارانہ محاکمہ کی جو مثال آپ نے قائم کی ہے وہ بعد کے لکھنے والے کے لیے مشعل راہ کا کام کرے گی۔ حسن نعیم کی سوانح حیات کو بہت نظم و ضبط اور ترتیب کے ساتھ آپ نے پیش کیا ہے، لیکن کاش! آپ حسن نعیم کی خودنوشت سوانح کی بازیافت میں کامیاب ہوجاتے، جس کو 'دبستان' کے ساتھ شائع ہونا تھا۔ آپ کی اس اطلاع نے، حسن نعیم کے چاہنے والوں کے آتش شوق کو مزید فزوں کر دیا ہے، اگر شہر بانو نے دانستہ اس کو حذف کیا ہے تو اس سے خود ان کی شخصیت مشکوک ہو جاتی ہے۔ شہر بانو اگر حیات ہوں یا ان کے خاندان میں کوئی ہو تو آپ، اِس کے حصول کی ایک بار پھر کوشش کیجیے کہ حسن نعیم کی اس خودنوشت پر صرف شہر بانو کا حق نہیں ہے بلکہ پوری اردو دنیا کا حق ہے۔

دیگر ابواب میں، آپ نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے حوالوں سے 'نئی غزل' میں حسن نعیم کی سیادت کو جس طرح ثابت کیا ہے اور اُس عہد کی روشنی میں، ان کے فکری محرکات کا جس معروضی انداز میں مطالعہ کیا ہے، اُسے پڑھ کر ایک خوشگوار مسرت ہوئی کہ نئی نسل کا ذہن کتنا کشادہ اور کس قدر غیر جانبدار ہے۔ خاص طور پر ص 92 پر، آپ نے حسن نعیم کے جن شعری اوصاف و کمالات کو بیان کیا ہے وہ دریا کو، کوزہ میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ صدیوں کے شاعرانہ عمل کا بے حد منظم مطالعہ اور اس کا کھلا ہوا معروضی جائزہ، آپ کے یہاں تنقیدی امکانات کو روشن تر کرتا ہے۔ البتہ حسن نعیم کے علاوہ، نئی غزل کے ہند و پاک کے شعرا میں جن کی آوازوں کو آپ نے معتبر مانا ہے، ان میں مشفق خواجہ کا نام بھی شامل ہے۔ یہ میرے لیے نئی اطلاع ہے۔[1]

بہر حال میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ مثبت تنقیدی ذہن کے ساتھ تجزیاتی نثر پر بھی آپ قدرت رکھتے ہیں۔ کہیں کوئی الجھاؤ، ژولیدگی یا پیچیدگی نہیں جو آج کے کچھ پختہ کار، کہنہ مشق اور نامی گرامی ناقدین کے یہاں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔

---

[1] اس ایڈیشن میں یہ غلطی درست کر لی گئی ہے۔

یہ جان کر مزید خوشی ہوئی کہ آپ حسن نعیم کی کلیات ترتیب دے رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ایک گزارش یہ ہے کہ آپ ملنے کے پتے کے تحت اس میں بک کارنر کا بھی نام شامل کر دیں گے اور اس کی کم از کم دو کاپی بک کارنر کو ضرور ارسال فرمائیں۔ انشاء اللہ یہاں نکل جائے گی۔ بلکہ آپ کی یہ کتاب بھی، ایک پروفیسر مجھ سے طلب کر رہے تھے، لیکن میرے پاس اس کی اضافی کاپی نہیں تھی، اس لیے میں انھیں فراہم نہیں کر سکا۔

آپ کا— رضوان اللہ آروی

(موتیہاری)

نجم عثمانی

2 جون 2003

محترم! تسلیمات

آپ کی کتاب 'حسن نعیم اور نئی غزل' پر 'تمثیل نو' میں تبصرہ پڑھا۔ آپ کا یہ کام قابل ستائش ہے۔ حسن نعیم کو اردو کے نقادوں نے کافی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ مجھے ان کی شاعری بے حد پسند ہے۔ نئی غزل میں حسن نعیم کا نام سرفہرست ہونا چاہیے۔ بہرحال موصوف کے انتقال سے دو تین سال قبل میں نے اپنا مجموعہ 'شاد نفس' تحفتاً ارسال کیا تھا۔ تاثرات پڑھ کر میں حیرت میں پڑ گیا۔ مجھ جیسے غیر معروف شاعر کے کلام پر اتنا مناسب تاثر یہاں تک کہ مجھ سے ملنے کی خواہش کا اظہار، ان کی نیک دلی اور جونیئروں سے محبت کی غماز ہے۔

بہرحال میں آپ کی کتاب کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں، رعایتی قیمت پر بذریعہ رجسٹرڈ ڈاک ارسال فرمانے کی زحمت گوارا کریں اور مطلع کریں تاکہ میں قیمت بذریعہ منی آرڈر ارسال کر دوں۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

فقط جواب کا منتظر— نجم عثمانی

(دھنباد)

۞

اقبال حسن آزاد

5 جنوری 2001

برادرم! تسلیمات

عید مبارک، نیا سال مبارک!

کل آپ کا خط موصول ہوا۔ شکریہ!

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ ایم فل کر رہے ہیں۔ یہ جان کر افسوس ہوا کہ آپ ستمبر میں پندرہ دنوں تک پٹنہ میں رہے۔ میں اکثر پٹنہ جاتا رہتا ہوں کہ پٹنہ میرا وطن ثانی ہے اور میرا پورا خاندان وہیں آباد ہے۔ اگر مجھے آپ کی آمد کا علم ہوتا تو میں آپ سے ضرور شرف ملاقات حاصل کرتا۔

حسن نعیم صاحب کے سلسلے میں آپ نے مشاہیر ادب سے استفادہ کیا ہے۔ میں کس قطار شمار میں ہوں۔ اتنا یاد آرہا ہے کہ چند سال قبل شاعر میں حسن نعیم پر کوئی گوشہ شائع ہوا تھا۔ امید کہ آپ کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ اگر آپ کا synopsis مل جاتا تو شاید کچھ اور مدد کرسکتا۔

خیراندیش

اقبال حسن آزاد

(مونگیر)

---

17 مارچ 2001

برادرم! تسلیمات

کل آپ کا خط موصول ہوا۔ حالات سے آگاہی ہوئی۔ آپ نے میرے کام کے لیے اپنے طور پر کوشش کی یہی بہت ہے۔ میں اس کے لیے شکرگزار ہوں۔

یہ جان کر خوشی ہوئی کہ حسن نعیم کے سلسلے میں آپ کے پاس کافی مواد اکٹھا ہوگیا ہے اور آپ تندہی کے ساتھ اپنے کام میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ کے خطوط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ

آپ ان معدودے چند ریسرچ اسکالرز میں سے ہیں جو صحیح معنوں میں ریسرچ اسکالر کہلانے کے مستحق ہیں۔ ایک مصرع آپ کی نذر ہے:

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

امید کہ آپ بخیر ہوں گے۔

خیر اندیش

اقبال حسن آزاد

(مونگیر)

نادر رضوی

25 نومبر 2000

مکرمی! سلام و خلوص

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو۔ میں نے جناب باقر مہدی صاحب کے پاس حسن نعیم مرحوم کے شعری مجموعے سے متعلق خط لکھا تھا۔ موصوف نے آپ کا پتا دیا ہے کہ رابطہ قائم کروں۔ آپ بتائیے کہ حسن نعیم مرحوم کے شعری مجموعے کہاں سے دستیاب ہوں گے۔ مجھے ان کے مجموعے چاہئیں۔ جواب سے ضرور نوازیں۔

خلوص کیش

نادر رضوی

(محبوب چھپرہ، سیوان)

---

18 جنوری 2001

برادر محترم! سلام و نیاز

خدا کرے مزاج گرامی بخیر ہو؟ گرامی نامہ باصرہ نواز ہوا۔ اس کے لیے میں آپ کا بے حد مشکور ہوں۔ آپ نے دل چسپی کا سبب دریافت فرمایا ہے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ بات آ رہی ہوگی کہ کہیں میں ان پر ریسرچ کر رہا ہوں گا تو ایسی بات نہیں ہے۔ ہاں اردو ادب سے

والہانہ لگاؤ ہے۔ شعر و شاعری سے شغف ہے۔ جدید شاعروں کو خاص طور پر پڑھتا ہوں۔ حسن نعیم مرحوم بھی میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔ اس لیے ان کے مجموعوں کی تلاش ہے۔ اگر آپ اپنا تعاون کرادیں تو کرم ہوگا۔

بمبئی میں نے خط بھیج دیا ہے۔ بقیہ سب خیریت ہے۔

خیراندیش

نادر رضوی

(محبوب چھپرہ، سیوان)

O

کتابیات

- آگہی و بے باکی: باقر مہدی، گوشۂ ادب، بمبئی 1965
- آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ: ڈاکٹر بشر بدر، انجمن ترقی اردو ہند، نئی دہلی 1981
- آزادی کے بعد دہلی میں اردو غزل: عنوان چشتی، اردو اکادمی، دہلی 1989
- آبِ رواں: ظفر اقبال، مکتبہ دین و ادب، لکھنؤ 1978
- آتش گل: جگر مرادآبادی، فیروز پرنٹنگ ورکس، لاہور 1962
- آتی جاتی لہریں: مظہر امام، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد 1980
- آہنگ: مجاز، آزاد کتاب گھر، دہلی 1960
- آیات وجدانی: یاس یگانہ چنگیزی، دلی پرنٹنگ ورکس، دہلی 1944
- اشعار: حسن نعیم، شالیمار پبلی کیشنز، حیدرآباد 1972
- اثبات ونفی: شمس الرحمٰن فاروقی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1986
- ادب کلچر اور مسائل: جمیل جالبی، کراچی، 1986
- اسم اعظم: شہریار، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1925
- اردو غزل: کامل قریشی، اردو اکادمی، دہلی 1987
- اکائی: بشر بدر، یونیورسٹی بک اسٹال، علی گڑھ 1970

- اردو سخنور شیریں (گجراتی، ہندی ایڈیشن) ندا فاضلی، کیلاش پنڈت، بمبئی 1994
- اردو غزل: عابد رضا بیدار، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، 1995
- اردو غزل میں علامت نگاری: انیس اشفاق، اتر پردیش اردو اکادمی 1995
- اردو غزل اور تقسیم ہند: محمد قمر الحق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1998
- اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک: خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1984
- اردو غزل: ڈاکٹر یوسف حسین خاں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی
- اردو ادب کی تنقیدی تاریخ: سید احتشام حسین، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1997
- اردو شاعری میں اشاریت: سلیمان اطہر جاوید، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1982
- اردو شاعری کا سماجی پس منظر: سید اعجاز حسین، کاروان پبلشرز، الہ آباد، 1968
- اردو شاعری میں جدیدیت کی روایت: عنوان چشتی، اردو سماج جامعہ نگر، نئی دہلی 1977
- اردو شاعری کا مزاج: وزیر آغا، جدید ناشرین، لکھنؤ 1984
- اردو کی عشقیہ شاعری: فراق گورکھپوری، سنگم پبلشنگ ہاؤس، الہ آباد 1945
- اس بے وفا کا شہر: منیر نیازی، کتابستان، لاہور 1980
- ارسطو سے ایلیٹ تک: جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1980
- اعتبار نغمہ: ناصر کاظمی، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد 1982
- باتیں ادب کی: مظفر حنفی، موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی 1994
- برگ نے: ناصر کاظمی، مکتبہ کاروان ادب، لاہور، 1992
- برگ آوارہ: خورشید احمد جامی، شالیمار پبلی کیشنز، حیدر آباد 1970
- بیاض: سلیم احمد، دھنک پبلشرز، کراچی 1970
- پالکی کہکشاں کی: مظہر امام، ایم آر آفسیٹ پرنٹرز، نئی دہلی 2000
- پاکستان میں اردو غزل: ڈاکٹر معین الدین عقیل، مکتبہ ابلاغ، کراچی 1981
- پیاس کا صحرا: ساقی فاروقی، کتاب نما، راولپنڈی 1980
- پانی کی زبان: مظفر حنفی، شب خون کتاب گھر، الہ آباد 1974

- پرانے موسموں کی آواز: کمار پاشی، نازش بک سنٹر، دہلی 1976
- ترقی پسند تحریک اور اردو غزل: سید سراج اجملی، مصنف 1996
- تذکرۂ کاملان بہار (حصہ اوّل) لائبریری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ 1990
- تنقیدی تصورات: پروفیسر عبدالحق، عاکف بک ڈپو، مٹیا محل، دہلی 1994
- تعبیر و تفہیم: ڈاکٹر خلیق انجم، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1996
- تیکھی غزلیں: مظفر حنفی، فن کدہ سیوہر، 1968
- ترقی پسند ادب: پچاس سالہ سفر: پروفیسر قمر رئیس، نیا سفر پبلی کیشنز، دہلی 1987
- تنقید اور عصری آگہی: پروفیسر سید محمد عقیل، انجمن تہذیب نو، الہ آباد 1976
- تنقیدی تناظر: پروفیسر قمر رئیس، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1974
- تحقیق و تنقید: پروفیسر اختر اورینوی، کتابستان، الہ آباد 1961
- جدید اردو غزل: ایک مطالعہ، نظیر صدیقی، گلاب پبلشرز، لاہور 1984
- جدیدیت اور ادب: آل احمد سرور، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ 1969
- جدیدیت تجزیہ و تفہیم: مظفر حنفی، نسیم بک ڈپو، لکھنؤ 1969
- جدید غزل کا فنی سیاسی و سماجی مطالعہ: ڈاکٹر ممتاز الحق، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1998
- جدید غزل: رشید احمد صدیقی، سرسید بک ڈپو علی گڑھ 1974
- جدیدیت کی فلسفیانہ اساس: پروفیسر شمیم حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1977
- دبستان: حسن نعیم، آرٹ ہوم بمبئی (شالیمار) 1992
- ذکر و فکر: گیان چند جین، اردو اکادمی، اتر پردیش 1980
- ذوق سفر: غلام ربانی تاباں، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، دہلی 1972
- ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات: گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1993
- سخن مختصر: جذبی، انجمن ترقی اردو، علی گڑھ 1962
- سرود زندگی: اصغر گونڈوی، تاج کمپنی، لاہور، 1970
- سانحۂ کربلا بطور شعری استعارہ: گوپی چند نارنگ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2000

- شعر، غیر شعر اور نثر: شمس الرحمٰن فاروقی، شب خون کتاب گھر، الہ آباد 1973
- شعر نو: محمد حسن، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ 1961
- شاد عارفی: شخصیت اور فن، مظفر حنفی، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1977
- عمر گزشتہ کا حساب: مخمور سعیدی، ماڈرن پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2000
- غزل سرا: مجنوں گورکھپوری، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1964
- غزل کا نیا منظر نامہ: شمیم حنفی، مکتبہ الفاظ، علی گڑھ 1981
- غزل نامہ (ہندی ایڈیشن): حسن نعیم، ارون پرکاش مشرا، نیشنل ادبی پریشد، دہلی 1980
- غزل اور غزل کی تعلیم: اختر انصاری، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی 1979
- غزل کے جدید رجحانات: ڈاکٹر خالد علوی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 1996
- غزل کی سرگزشت: اختر انصاری، اردو شعر و ادب، علی گڑھ 1975
- فکر و فن: خلیل الرحمٰن اعظمی، آزاد کتاب گھر، دہلی 1956
- کاغذی پیرہن: خلیل الرحمٰن اعظمی، آزاد کتاب گھر، دہلی 1956
- کلیات حسرت موہانی: حسرت موہانی، مکتبہ اشاعت اردو، دہلی 1960
- کلیات فانی: فانی بدایونی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 1993
- مت سہل ہمیں جانو: انور ظہیر خان، بمبئی، 1996
- مناہج الشطار (مخطوطہ) میر امام الدین راجگیری، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ نمبر 4422
- مضامین نو: خلیل الرحمٰن اعظمی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ 1987
- معاصر اردو غزل: پروفیسر قمر رئیس، اردو اکادمی، دہلی 1994
- مسرت سے بصیرت تک: آل احمد سرور، مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی 1994
- ناصر کاظمی کی شاعری: پروفیسر حامدی کاشمیری، اردو رائٹرس گلڈ، الہ آباد 1982
- نیا عہد نامہ: خلیل الرحمٰن اعظمی، آزاد کتاب گھر، دہلی 1965
- نئی علامت نگاری: سید محمد عقیل، انجمن تہذیب نو، الہ آباد، 1975

رسائل واخبارات

- آج کل (ماہ نامہ)، دہلی، ستمبر 1976
- آج کل (ماہ نامہ)، دہلی، مارچ 1977
- آج کل (ماہ نامہ)، دہلی، مارچ 1978
- آج کل (ماہ نامہ)، دہلی، اگست 1979
- آج کل (ماہ نامہ)، دہلی، جولائی 1980
- آج کل (ماہ نامہ)، دہلی، مئی 1991
- آہنگ (ماہ نامہ) گیا، مارچ 1970
- آہنگ (ماہ نامہ) گیا، جون 1970
- آہنگ (ماہ نامہ) گیا، مارچ 1984
- ادبی دنیا (ماہ نامہ)، لاہور (پاکستان)، اپریل 1954
- ایوانِ اردو (ماہ نامہ) دہلی، اپریل 1991
- ایوان اردو (ماہ نامہ) دہلی، مئی 1991
- برگِ آوارہ (ہفت روزہ) حیدرآباد، 16 جولائی 1977
- بیسویں صدی (ماہ نامہ) دہلی، مئی 1987
- بیسویں صدی (ماہ نامہ) دہلی، اپریل 1991
- تخلیقی ادب (ماہ نامہ)، کراچی (پاکستان)، اکتوبر 1985
- تلاش (ماہ نامہ)، شمارہ 7، دہلی، جولائی 1963
- تلاش (ماہ نامہ)، شمارہ 2 دہلی، جنوری 1963
- تلاش (ماہ نامہ)، جلد 2، شمارہ 1 دہلی، فروری 1963
- تلاش (ماہ نامہ)، جلد 2، شمارہ 3 دہلی، مارچ 1963
- تلاش (ماہ نامہ)، جلد 2، شمارہ 12 دہلی، دسمبر 1963
- تلاش (ماہ نامہ)، جلد 1، شمارہ 1 دہلی، دسمبر 1962

- سنگم (روزنامہ) پٹنہ، 14 مارچ 1991
- شاعر (ماہ نامہ) جلد 62، بمبئی، 1991
- شاعر (ماہ نامہ)، بمبئی، اکتوبر 2000
- شب خون، جلد 7، شمارہ 75، الہ آباد، اگست 1972
- شب خون جلد 7، شمارہ 77، الہ آباد، اکتوبر 1972
- شب خون، الہ آباد، جون 1975
- شب خون، الہ آباد، اگست/ستمبر 1983
- صدائے عام (روزنامہ) بمبئی، 13 مارچ 1999
- عصری ادب (سہ ماہی)، ماڈل ٹاؤن، دہلی، جولائی 1970
- فکر ونظر (سہ ماہی)، اسلام آباد (پاکستان) جنوری - مارچ، 1987
- فکر ونظر (سہ ماہی)، اسلام آباد، (پاکستان) اپریل - جون 1994
- فنون (غزل نمبر)، لاہور (پاکستان)، 1969
- قومی تنظیم (روزنامہ)، پٹنہ، 6 مارچ 1991
- نوائے وقت (روزنامہ)، لاہور (پاکستان)، 26 اگست 1982

○

حسن نعیم اور نئی غزل

(تجزیہ اور تنقید)

احمد کفیل

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند
فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

عیار الشعراء

مصنف: خوب چند ذکا

صفحات: 805

قیمت: -/200

ڈیوڈ کاپر فیلڈ (جلد دوم)

مترجم: فضلِ حسنین

صفحات: 626

قیمت: -/170 روپے

شعریات

ترجمہ و تعارف: شمس الرحمٰن فاروقی

صفحات: 136

قیمت: -/50 روپے

کلیاتِ سرور جہاں آبادی

مرتب: کلدیپ گوہر

صفحات: 368

قیمت: -/108 روپے

شاعری کی تنقید

مصنف: ابوالکلام قاسمی

صفحات: 327

قیمت: -/90 روپے

شریمد بھگوت گیتا

مترجم: حسن الدّین احمد

صفحات: 120

قیمت: -/48 روپے

₹ 104/-

ISBN: 978-81-7587-912-6

9 788175 879126

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025